McGill University Library
3 103 289 607 C

سلیم کے نام

شائع کردہ

اِدارہ طلوعِ اسلام، کراچی

Yusuf '55

MH1 .P276sn
INSTITUTE
OF
ISLAMIC
STUDIES
7934 ★ v.1
McGILL
UNIVERSITY

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز میری خلوت و انجمن کا گداز

یعنی

Salim. ke nām

سلیم کے نام

V.1

(خطوط کا مجموعہ)

Parvez

"پرویز"

2630172
islm
V.1

کتبہٗ "کاکا"

M.H1
P276S

انتساب

اُس کے نام

مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۲۶/۸۹)
جو اللہ (کے قانون) کی طرف قلبِ سلیم لیکر آئے

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

تعارف ۹

پہلا خط

ہماری نمازیں اور روزے کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں ۱۰
یتیم اور غریب بھوکے مر رہے ہیں اور مسجدوں میں قالین
بچھائے جا رہے ہیں۔
حنفی اور وہابی کے جھگڑے ۱۳
اسلام ایک نظام زندگی ہے ۱۴
جس کا مقصود نوع انسانی کی ربوبیت ہے۔ ۱۵
مسلمانوں پر یہ عذاب کیوں آیا؟ ۱۶
یہ عذاب کس طرح دور ہو سکتا ہے۔ ۱۷

دوسرا خط ۱۸
ہمارے مذہبی اجتماعات ..
جمعۃ الوداع کے اجتماع میں کتنے قلوب ہم ..
آہنگ تھے؟ ..
اسلام ہم آہنگیٔ فکر و عمل سکھانے کے لئے ۱۹
آیا تھا اور اس کا مقصد تھا، کمزوروں ..
اور ناتوانوں کی حفاظت۔ ..
پہلے رمضان کے سترہ روزوں نے بدر کے میدان ۲۱
میں فتح دلا دی۔
اس رنت کے احکامات۔ ابدی احکامات ہیں۔ ۲۳

قرآنی نقطہ نظر ۱۰۰
خدا پر ایمان کا صحیح مفہوم ۱۰۲
نواں خط ۱۰۴
کیا انسانی زندگی محض آب و گل کا کھیل ہے؟ ..
تلاش حقیقت کا جذبہ انسان کو ہمہ تن استفسار بنائے رکھتا ہے ۱۰۸
واقعہ خضر و حضرت موسیٰؑ۔ ۱۰۹
میکانکی نظریہ حیات۔ ۱۱۱
اس کے خلاف نظریہ۔ ۱۱۳
انسانی جسم کچھ وقت کے بعد بالکل نیا ہو جاتا ہے۔ ..
لیکن اس میں "میں" وہی پرانی رہتی ہے۔ ۱۱۴
قرآن کا بیان۔
مغربی نقطہ نظر در اصل عیسائیت کا رد عمل ہے۔ ۱۲۲
اور عیسائیت افلاطونی فلسفہ کا چربہ۔ ..
افلاطونی فکر سے دنیا کو کس قدر نقصان پہنچا۔ ۱۲۳
انسانی ذات کے انکار سے انسان حیوانی سطح پر آجاتا ہے۔ ۱۲۵
انسانی ذات کے استحکام سے حیات جاودانی مل جاتی ہے۔ ۱۲۶
دسواں خط ..
کمیونزم اور اسلام عله ..
کمیونزم کے متعلق عام تصور۔ ۱۲۹
کمیونزم ایک فلسفۂ زندگی کا نام ہے ۱۳۰
اس کی بنیاد ہیگل کے فلسفۂ اضداد پر ہے ۱۳۱
لیکن مارکس نے اس میں بنیادی تبدیلی کر دی ۱۳۳
مادیت سے کیا مراد ہے؟ ..
ہیگل کی تصریحات ۱۳۴
مارکس کا فلسفہ ۱۳۵
اس فلسفہ کی رو سے انسان مجبور محض رہ جاتا ہے جس طرح ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی رو سے رہ جاتا ہے۔ ۱۳۸
اور جدید علم النفس کی رو سے بھی۔ ۱۳۹
کوئی اشتراکی اس کا جواب نہیں دے سکتا کہ غریب کی مدد کیوں کرنی چاہیئے۔ ..
مارکسزم میں اخلاق کا کوئی تصور نہیں۔ ۱۴۲
اسلام کا فلسفۂ حیات کیا ہے؟ ۱۴۴
اسلام، نظام سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ۱۴۹
اسلام، کمیونزم کے معاشی مسئلہ کو اپنے آغوش میں لے کر اس سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ ۱۵۳

گیارہواں خط
کمیونزم اور اسلام ۲
اسلام میں ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اسلامی ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد ایک معاہدہ پر ہے جو ۱۵۶
فرد اور معاشرہ میں ہوتا ہے۔
اس معاہدہ کی تفاصیل
اللہ اور جنت سے کیا مراد ہے ۱۵۸
قرآن میں انفاق فی سبیل اللہ کے لئے ترغیب وتحریص ۱۶۲
کی آیات سے کیا مقصود ہے۔ ..
کسب معاش کی استعداد کا تفاوت ۱۶۵
خیر اور شر کیا ہے؟ ۱۶۶
یہ نظام صلوٰۃ کے قیام سے قائم ہوتا ہے ۱۷۱
ہمارا موجودہ "مذہب" دین کی بگڑی ہوئی شکل کا نام ہے۔ ۱۷۳
انسان کے متعلق مغرب کی بنیادی غلطی۔ ۱۷۶
بارہواں خط ۱۷۸
قرآنی نظام ربوبیت
مارکس کے نظریہ میں اخلاق کا تصور نہیں۔ ۱۷۹
غریبوں کی حالت سے مارکس کا دل کڑھتا تھا ۱۸۲
لیکن اس کے لئے اس کے پاس کوئی اخلاقی سہارا نہیں تھا۔ ..
اٹھارویں صدی میں یورپ میں غریبوں کی حالت ..
اشتراکیت کے خلاف اعتراض۔ ..
وہ کونسا جذبہ محرکہ ہے جس کے ماتحت ۱۸۴
انسان کام کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟
قرآن کا نظریہ ۱۸۷
باقی وہ رہتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے ..
نفع رساں ہے
الدنیا اور الآخرۃ کی اصطلاحات ۱۸۶
انسانی ذات کی تربیت "دینے" سے ہوتی ۱۸۷
ہے۔
لہو ولعب کا مفہوم۔ ۱۸۹
سورۂ حدید کی آیات کی تفسیر۔ ۱۹۰
"نزول شمشیر" کن کے لئے ہوا۔ ۱۹۳
ہر شخص کہتا ہے کہ جو کچھ میں نے اپنی ہنرمندی ..
سے کمایا ہے اسے دوسروں کو کیوں ..
دیدوں! ۱۹۵
اس کا جواب۔ ۱۹۶
تیرھواں خط ۲۰۱
صلوٰۃ و زکوٰۃ کا مفہوم

جو باتیں بظاہر مسلمات نظر آئیں انہیں بھی پرکھنا ضروری ہوتا
ہے۔
قرآنی تصورِ علم ۲۰۳
جس میں سمع و بصر و فؤاد کی شہادت موجود ہو۔ ..
قرآن کے مطابق ایمان بالغیب سے کیا مراد ہے۔ ..
قرآن کی رو سے تقلید بدترین شیوۂ زندگی ہے۔ ۲۰۴
یہود و نصاریٰ و مجوس کی سازش اسلام کے خلاف ۲۰۵
ایک اجڑے ہوئے ریل کے اسٹیشن کا نقشہ۔ ۲۰۶
اسلام ایک نظام تھا جو دت سے بکھر گیا۔ ۲۰۷
اب مذہب کی رسومات و عبادات اسی بکھرے ۲۰۸
ہوئے نظام کے نشانات ہیں۔ ..
اس نظام کے بنیادی ستون صلوٰۃ و زکوٰۃ تھے۔ ۲۰۹
صلوٰۃ و زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم ۲۱۰
نماز کے اجتماعات کی صحیح پوزیشن ۲۱۲
موجودہ حالات میں کیا کیا جائے ؟ ۲۱۴
عمل تنزیل سے مراد۔ ..
دین اور مذہب کا فرق۔ ۲۱۵
چودھواں خط ۲۱۹
(۱) کیریکٹر کیسے پیدا ہوتا ہے۔

(۲) ختم نبوت کا مفہوم کیا ہے۔
مقام دعوت کے لئے پختگیٔ افکار ضروری ہے ۲۲۰
کیریکٹر کسے کہتے ہیں ..
عدم کیریکٹر نام ہے خود غرضی ۲۲۱
خود غرضی کیوں پیدا ہوتی ہے ؛ ..
احتیاج کے خوف سے ۲۲۳
اس کا علاج ؛ اس خوف کا دل سے نکال دینا۔ ۲۲۴
یہ کس طرح ممکن ہے ؟ ..
نظام ربوبیت کے قیام سے ۲۲۶
اس کا دھندلا سا نقشہ "گھر" کی زندگی میں ملتا ہے۔ ۲۲۹
کرنے کا کام یہ ہے کہ اس فکر کو عام کرتے جاؤ۔ ۲۳۲
نبوت کا سلسلہ بند کیوں ہو گیا ؟ ۲۳۴
اب انقلابات اشخاص کی جگہ تصورات کی ..
تبدیلی سے رونما ہوں گے۔ ..
ختم نبوت کے بعد اشخاص کی جگہ نظام نے ۲۳۵
لے لی ہے۔ ..
لیکن مسلمانوں نے اس حقیقت کو سمجھا ..
ہی نہیں۔ ۲۳۶
اسی لئے یہ "آنے والوں" کا انتظار کر رہے ہیں ..

ایک اہم نکتہ۔ ہمیں سب سے پہلے ان الفاظ کا	,,	مسلمانوں نے کس قدر معجزات رسولؐ اللہ کی	
مفہوم متعین کرنا چاہیئے جنہیں ہم ہر روز بولتے	..	طرف منسوب کر دیئے۔	
ہیں، یہ مفہوم قرآن سے متعین ہوگا۔	۲۳۸	اور پھر کرامات کا سلسلہ جاری ہوگیا۔	
پندرھواںؑ خط	۲۴۰	(میرزا غلام احمد کی دوسری غلطی)	
مقام محمدی	..	ایک اور اہم حقیقت۔ اب اُمتوں کا دور آگیا	
دنیا میں تقریبیں دو ہی ہیں۔ عید میلاد اور عید	..	اشخاص کا نہیں رہا۔	
نزولِ قرآن۔	..	دعائے ابراہیمی۔ افراد کی جگہ کس طرح اُمم نے	۲۵۱
یہ بھی درحقیقت ایک ہی تقریب کے دو رُخ ہیں۔	..	لے لی۔	..
وحی کسے کہتے ہیں	۲۴۱	قرآن کے بعد، امتوں کی تشکیل کا اصول بھی	..
دنیا میں ایسے اصولوں کی ضرورت ہے جو غیر متبدل ہوں۔	..	بدل گیا۔	..
ان اصولوں کو عقل وضع نہیں کرسکتی۔	۲۴۳	غیر مسلم قوموں میں قرآنی انقلاب کے اپنانے کی	۲۵۲
نہ ہی یہ "انسان کی فطرت" میں داخل ہیں۔	..	صلاحیت زیادہ نظر آتی ہے۔	..
یہ اصول انبیاء کو وہبی طور پر ملتے ہیں۔	۲۴۴	**استدراک**	,,
(میرزا غلام احمد کی بنیادی غلطی)		ایک صاحبِ فکر دوست کے بعض	۲۵۴
اس حقیقتِ مجردہ کو عربوں کو کیسے سمجھایا گیا!	۲۴۶	سوالات کا جواب۔ اُمم سابقہ کی پاداش میں	..
ستاروں کی مثال سے۔		عذاب طبعی شکل میں آتا تھا لیکن قرآن کے	..
سورۂ والنجم کی تفسیر	۲۴۷	بعد ایسا نہیں ہوگا۔	..
اب حقیقت معجزات کی بجائے دلیل و برہان کی رو سے منوائی		اب امتوں پر عذاب، زوال و زبوں حالی	..
جائے گی۔		کی شکل میں آئے گا۔	..

سولہواں خط ۲۶۲
مقامِ رسالت
نبوت اور تصوف میں فرق۔
نبی کا کام انسانی معاشرہ میں انقلاب برپا کرنا ہوتا ہے ۲۶۳
اسے فریضۂ رسالت کہتے ہیں ۲۶۴
سورۂ مدثر کی تفسیر
معاشرہ کی اقدار بدل دی جاتی ہیں ۲۶۶
افرادِ جماعت کو کن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے۔ ۲۶۸
اس دعوت کی مخالفت بھی سخت ہوگی۔ ۲۶۹
لیکن تم نے ان لوگوں سے الجھنا نہیں۔ دامن بچا کر ۲۷۰
نکل جانے کی کوشش کرنا
(قرآنی اسلوب بیان۔ بکھیلے کی آرزو) ۲۷۲
مفاد پرستی کے نظام کا انجام۔ تباہی و بربادی۔ ۲۷۴
ایسا کیوں ہوا؟
اس کا جواب۔
انقلابِ چین کے متعلق، جیک بیلڈن کا تبصرہ ۲۷۵
یعنی وہی جو قرآن نے کہا تھا۔
ہماری تشکیل جدید کی بھی یہی صورت ہے۔ ۲۷۹
اس کا امکان ہمارے ہاں نظر نہیں آتا۔ ۲۸۰
سترھواں خط ۲۸۲
(۱) انسانی فطرت کیا ہے۔
(۲) اتفاقات کسے کہتے ہیں۔
ہمارے ہاں عام طور پر مانا جاتا ہے کہ انسان کو ۲۸۳
خدا نے اپنی فطرت پر پیدا کیا اور اسلام
دینِ فطرت ہے۔
انسانی فطرت کیا ہے؛ اسے کوئی متعین نہیں
کرسکا۔ ۲۸۴
قرآن نے بھی انسان کی بعض خصوصیات کا ذکر
کیا ہے؛ ۲۸۸
لیکن وہ کیا ہیں؛ فساد و خوں ریزی!!
قرآن کی آیت "فطرت اللہ التی فطر الناس ۲۸۹
علیہا"۔
قرآن فہمی کا بنیادی اصول
قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم متعین کرنا چاہیئے ۲۹۰
جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھا۔
لغۃً فطرت کے لفظی معنی۔ قانونِ تخلیق ۲۹۲
انسان کی فطرت "کچھ بھی نہیں"۔ ۲۹۳

صرف مضر صلاحیتیں ہیں۔ ..
نیکی اور بدی کا علم انسان کے اندر نہیں ۲۹۴
خود غرضی، تحفظ خویش کے جذبے کو بلا قیود پورا کرنے کا نام ..
ہے۔ ..
"اتفاقات" سے کیا مراد ہے۔ ..
تقدیر سے کیا مفہوم ہے ۳۰۱
صحیح معاشرہ میں "اتفاقات" کا وجود ختم ہو جاتا ۳۰۲
ہے۔ ..
صحیح قرآنی معاشرہ کہاں پیدا ہوگا؟ ۳۰۵
پاکستان میں قرآنی فکر کی شعاعیں ملتی ہیں۔ ۳۰۶
اقبال، حافظ محب الحق؛ علامہ اسلم جیراجپوری
کی فکر۔
میری کوشش ناتمام
مغربی ممالک کی فضا زیادہ مساعد معلوم ہوتی ہے ۳۰۷
اٹھارواں خط ۳۰۸
انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کیسے ہو سکتی ہے؟
انسان نے خود ہی مصائب پیدا کر رکھے ہیں۔ ۳۰۹
ہر شے کا ایک انتہائی مقام مقرر ہے۔ اس کا اس تک پہنچ ۳۱۱
جانا، مقصودِ زندگی ہے۔ ..
قانونِ کائنات کی پہلی شق یہ ہے کہ ہر شے کی ۳۱۱
مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جائے۔
دوسری شق یہ کہ یہ نشوونما ہو نہیں سکتی جب تک
مختلف عوامل ایک دوسرے میں جذب
نہ ہو جائیں۔
انسانی زندگی میں، اسی کا نام معاشرہ ہے ۳۱۳
الدین، الاسلام، اُمت، ملّت، کا مفہوم -
مشین اور اس کے پرزوں کی مثال۔ -
اس نظام کا نام۔ نظامِ ربوبیت ہے جس میں ۳۱۴
ہر فرد، دوسروں کی ربوبیت کی فکر
کرتا ہے۔
اس طرح سب کی نشوونما ہو جاتی ہے۔
یعنی مساعی مشکور ہو جاتی ہیں (شکر کے معنی)
قانونِ کائنات کی تیسری شق۔ عناصر میں خاص ۳۱۵
توازن و تناسب ہے۔
انسان کے دل کے اندر بھی متضاد قوتیں کام
کرتی ہیں۔
اور مختلف افراد کے درمیان بھی۔
ان قوتوں میں تناسب رہے تو اس کا نتیجہ حسن ۳۱۶

یا بَر ہے۔
تناسب بگڑ جائے تو یہی قوتیں، سیئات یا شر بن جاتی ہیں۔
لہٰذا کوئی شے، بجائے خویش، نہ خیر ہے نہ شر۔ ۳۱۷
جب انسان کی مختلف قوتیں اس طرح متوازن ہو جائیں تو ان کا نتیجہ خیر ہوتا ہے۔
خیر اور اختیار ایک ہی بات ہے۔
لیکن یہ توازن، اجتماعی معاشرہ کے بغیر ناممکن ہے ۳۱۸
قانونِ کائنات کی چوتھی شق یہ ہے کہ ہر قوت کا استعمال موقعہ اور محل کے اعتبار سے کیا جائے۔ ۳۱۹
کائنات کی ہر شے قانت ہے۔ اس کے معنی۔ ..
اس کے برعکس۔ انسان نے اپنے لئے جو راہ اختیار کی اس میں بعض قوتوں کو "دبانا" شروع کر دیا۔ رہبانیت اور ملوکیت اسی "دبانے" کے مسالک ہیں۔ ..
قرآن ان قوتوں میں توازن پیدا کرتا ہے۔ ۳۲۱
یہ عدل و احسان سے ہوتا ہے ۳۲۲
یہ کیسے معلوم ہو کہ انسان کے اندر کون کون سی صلاحیتیں ہیں۔ ..
اس کے لئے معیار، صفاتِ خداوندی ہیں۔ ..
ان میں توازن حدود اللہ سے قائم ہوگا۔ ۳۲۳
اسماء حسنیٰ درحقیقت خود ہماری ہی صلاحیتوں کا بیان ہے۔ ..
انیسواں خط ۳۲۵
انسان کو اخلاقی ضوابط کا پابند کس طرح بنایا جا سکتا ہے؟
ساری دنیا اخلاقی ضوابط کی تعریف کرتی ہے۔ ..
لیکن ان کی پابندی کوئی نہیں کرتا۔
تنہا اخلاقی مواعظ کبھی انسان کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ ۳۲۶
عیسائیت اس باب میں تجربہ کر چکی ہے۔ ۳۲۷
انہوں نے انسانی فطرت کو بد بتا دیا ..
یہی عقیدہ ہندوؤں کا ہے۔ ..
یہی کچھ بدھ مت اور مجوسیت نے کہا۔ ۳۲۸
قرآن کا مسلک۔ حقائق کا مقابلہ ہے۔ ۳۲۹
عقل کا تقاضا تحفظ خویش ہے۔ ۳۳۰
"طبعی" کسے کہتے ہیں۔ ..
عقل اس تقاضے کو جمع کرنے اور اکھٹا رکھنے سے پورا کرتی ہے۔ ۳۳۱

یہ وجہ ہے کہ کوئی شخص اس اخلاقی ضابطہ کی پرواہ نہیں ۳۳۲
کرتا جو اسے "جمع کرنے اور سمیٹ لینے" سے روکتا ہے ..
ہم ہر روز کہتے ہیں کہ ہیں کیوں جھوٹ بولتا۔ میرا اس میں ۳۳۳
کیا فائدہ تھا؟ ..
اس کا علاج کیا ہے؟ ۳۳۴
ایسا انتظام کر دیا جائے کہ ہر فرد کے رزق کی یقینی ذمہ داری ۳۳۶
کوئی اور لے لے۔ ..
قرآن ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ..
ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر کے معنی ۳۳۷
اس معاشرہ میں تمام ضروریات زندگی کا شمار ..
"فری گڈس" میں ہوگا۔ ..
ہمارے ہاں کی پرانی گاؤں کی زندگی کا نقشہ۔ ۳۳۹
قرآنی نظام کی ابتدا کیسے ہو۔ ۳۴۱
وحی کی رُو سے۔ ۳۴۲
وحی کی رو سے وحدت نوع انسانی اور زندگی کے تسلسل ۳۴۴
کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ ..
اسی سے انسان کے اختیارات (خیر)، کی وسعتیں بڑھتی ہیں ۳۴۵
قرآن کیوں بے مثل و بے نظیر ہے؟ ۳۴۶
ایک طرف قرآن عقل کی اسس قدر اہمیت بتاتا ہے۔ ۳۴۷
دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ عقل ہی ۳۴۷
تمام خرابیوں کی موجب ہے۔ ..
اس تضاد کا حل کیا ہے؟ ..
بیسواں خط ۳۵۰
خدا کا تصور ..
ہر فرد کا خدا الگ الگ ہوتا ہے۔ ..
ہر فرد خدا سے اپنے اپنے حق میں دعا بیٔر ۳۵۲
مانگتا ہے۔ ..
لیکن قرآن کا پیش کردہ خدا الگ حیثیت ۳۵۳
رکھتا ہے۔ ..
اس خدا کا ماننا کیوں ضروری ہے۔ ۳۵۴
اس لئے کہ یہ انسان کی تکمیل ذات ۳۵۶
کے لئے نمونہ ہے۔ ..
اور چونکہ تمام نوع انسانی کے لئے یہی نصب العین ۳۵۷
ہے اس لئے اس توحید سے وحدت ..
خلق سامنے آجاتی ہے۔ ..
اس کے لئے قرآن کی تعلیم کو دل میں نقش ۳۵۹
کرنا ضروری ہے۔ ..
(قرآن کے معنی) ..

اس نصب العین کے حصول کا نام "نیک عملی" ہے۔ نہ کہ برہمو سماجی قسم کے اسلام کی نیک عملی اور خدا پرستی ۳۶۰
لیکن یہ نصب العین صرف ایک اجتماعی معاشرے میں ممکن ہے۔ ۳۶۱
خدا اور بندے کا ایک اور تعلق ″
ہر واقعہ پر خدا کی ایک خاص صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ ۳۶۲
اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔
لہٰذا خدا کا تصور ایک اٹل قانون کا تصور ہے۔ ۳۶۳
دعا کا مفہوم کیا ہے۔ ۳۶۴
یہ قانون عالمگیر بھی ہے۔ ۳۶۵
اسی قسم کے ایمان سے تمام تنازعات ختم ہو جاتے ہیں۔ ۳۶۷
یہ کیوں ہے کہ ظالم کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ۳۶۸
اور دیانتدار لوگ ہر جگہ پٹتے ہیں۔
عمل اور اس کے نتیجہ کا درمیانی وقفہ ۳۶۹
اگر انسان خدا کے قانون کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے تو یہ وقفہ بہت کم رہ جاتا ہے۔ ۳۷۰
(نزولِ ملائکہ سے مفہوم)
انسان امن کی تلاش میں ہے۔
امن سے مفہوم ہے آئین کے مطابق زندگی بسر کرنا ۳۷۳
اسی قسم کا معاشرہ رسول اللہؐ نے قائم کیا تھا۔ ۳۷۵
قرآن ہر ایک سے اسی خدا پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔ ۳۷۷
اکیسواں خط ۳۷۹
... فقط ایک بار دیکھا ہے۔
ہمارے ہاں عہدِ نبی اکرمؐ کی صحیح تاریخ نہیں ہے ۳۷۹
آزادی کسے کہتے ہیں۔
قرآن نے انسان کو سچی آزادی عطا کی ہے۔ ۳۸۲
رسول اللہؐ نے کس طرح اپنے عمل سے اس آزادی کو برقرار رکھا۔ ۳۸۴
مختلف واقعات
حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے واقعات۔ ۳۹۵
حضرت عمرؓ کے زمانے کے بعض کوائف ۳۹۶
اس کے بعد کیا ہوا؟ ۴۰۳
یہ ایک دل خراش داستان ہے۔ ۴۰۴

* * *

ایک اور خط ۴۰۵
۴۰۸

جوانوں کو میری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ھے
میرا نور بصیرت عام کر دے

جملہ حقوق اشاعت، اخذ و ترجمہ محفوظ

بار اوّل ـــــ اگست ۱۹۵۳ء

بار دوم ـــــ اکتوبر ۱۹۵۴ء

شائع کردہ
ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

چو چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم! جانِ من و جانِ شما

تاریخ کے اوراق، فلسفہ کے رموز و غوامض، انسانی سیرت و کردار کے نقوش اور قرآن کے حقائق و معارف اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ قوموں کی تقدیر ان کی اُبھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس قسم کے سانچوں میں ان کے قلب و دماغ کو ڈھالا جائے گا اسی قسم کا اس قوم کا مستقبل ہوگا یہی قوموں کی تخلیق کا معیار ہے اور یہی اُن کی مدتِ حیات کا پیمانہ۔ اسی سے یہ متعین ہو سکتا ہے کہ اقوامِ عالم کی صف میں کسی خاص قوم کا مقام کیا ہوگا اور اسی سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک کاروانِ انسانیت کے ساتھ چل سکے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہنگامی حوادث کسی قوم کو اس کی قوت و دولت سے محروم کر دیں اور اس طرح وہ میدانِ منافست میں دیگر اقوامِ عالم سے پیچھے رہ جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض اضطراری اسباب و علل کی بنا پر اس کی شوکت و حشمت اس سے چھن جائے اور اقوامِ غالب اس کے سینۂ ناتواں پر کابوس کی طرح سوار ہو جائیں۔ لیکن اگر وہ قوم اپنے بچوں کو سنبھال لے اور ان کی تعلیم و تربیت ٹھکانے سے کر لے تو دنیا دیکھے گی کہ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں، ان کے خونِ گرم کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار، کس طرح ایک کف بردہاں سیلاب کی طرح اٹھتا اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ قوموں کی قسمتوں کے فیصلے بساطِ سیاست یا میدانِ جنگ میں نہیں ہوتے۔ یہ فیصلے ان کے مکتبوں اور تربیت گاہوں میں ہوتے ہیں۔ کوئی قوم اپنے حریفِ مقابل سے نہیں پِٹتی۔ وہ اپنے نوجوانوں کی غلط تعلیم سے پِٹتی ہے۔

7934

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

یہ ہے وہ حقیقت جس کے پیشِ نظر میں نے اپنی قرآنی بصیرت کا مخاطب ہمیشہ قوم کے نوجوان طبقہ کو سمجھا ہے۔ میں نے ہمیشہ انہیں اپنے قریب رکھا ہے۔ ان کے احساسات و جذبات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے قلبی اضطرابات و ذہنی شبہات کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا ہے، اور ان کی الجھنوں کو مشفقانہ انداز سے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ میرا یہ تجربہ کامیاب رہا ہے۔ میرے پاس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے نوجوان آتے ہیں۔ مذہب کی طرف سے دل میں شکوک و شبہات کے سینکڑوں کانٹے اور دماغ میں سرکشی و طغیان کے ہزاروں شعلے لئے ہوئے۔ میں ایک ایسی خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتا ہوں جو میرے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے (اس لئے کہ میں جانتا ہوں کہ ان کا یہ انداز درحقیقت ردعمل ہے مذہب کے متعلق اس غلط تعلیم کا جو انہیں گھر کے ماحول اور مدرسہ کی چاردیواری میں ملی ہے) میں ان کے تند و تلخ اعتراضات کو صبر و سکون سے سنتا ہوں۔ اس کے بعد اس "زبان" میں جو ان کی سمجھ میں آجائے، انہیں قرآن سناتا ہوں، اور میری حیرت و مسرت کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ ان کے شکوک و شبہات، یقین و اطمینان سے اور ان کی سرکشی کے جذبات، قرآن کی عظمت کے اعتراف سے بدل جاتے ہیں۔ وہ آتے ہیں خدا، رسول، وحی، رسالت، قرآن، دین کے نام پر تیوریاں چڑھاتے ہوئے اور جاتے ہیں ان کے گرویدہ ہوتے ہوئے۔ (جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے) دین کی طرف سے ہمارے نوجوانوں کے جذباتِ تنفر و سرکشی کے ذمہ دار ہم خود آپ ہیں۔ ہم انہیں فلسفہ اور سائنس میں تو وائٹ ہیڈ اور آئن سٹائن پڑھاتے ہیں اور مذہب وہ پیش کرتے ہیں جس پر عقل ہنسے اور علم ماتم کرے۔ اگر وہ اس قسم کے مذہب کی طرف سے سرکشی اختیار نہ کریں تو اور کیا کریں؟ میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر ان کے سامنے، انسانوں کے خودساختہ مذہب کی بجائے (جو ہمارے معاشرے میں متوارث چلا آرہا ہے جس کی تعلیم ہمارے مذہبی مدارس میں دی جاتی ہے اور جسے منبر و محراب سے دہرایا جاتا ہے) خدا کی طرف سے دیا ہوا دین پیش کیا جائے تو ہو نہیں سکتا کہ ان کی نگاہیں اس کی عظمت کے اعتراف میں جھک نہ جائیں۔

سلیم! اسی جدید تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کا نمائندہ ہے اور اس کے نام خطوط، ان شکوک و شبہات کے جواب ہیں جو ان کی طرف سے گذشتہ پندرہ بیس سال میں میرے سامنے آتے رہے۔ اس سے آپ ان خطوط کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔ یوں تو انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے زمان و مکان کی تبدیلی سے تغیر پذیر نہیں ہو سکتے (اسی لئے قرآن کی تعلیم جو ان ہی تقاضوں کا حل پیش کرتی ہے، ہمیشہ کے لئے انسانی راہ نمائی کے لئے کافی ہے) لیکن کسی ایک زمانے میں بعض تقاضے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ اس لئے قرآن سے راہ نمائی کی تلاش (اور اسے پیش) کرنے والے کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ابھرے ہوئے تقاضوں سے واقف ہو اور انسانی علم جس سطح تک جا پہنچا ہے وہ بھی اس کی نگاہوں کے سامنے ہو۔ اگر کوئی شخص ان مبادیات سے کماحقہٗ باخبر نہیں ہے تو وہ اپنے دور کے لئے قرآن سے راہ نمائی حاصل نہیں کر سکتا۔ (میں نے اپنی استعداد کے مطابق اسی نہج سے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی نہج سے میں اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اس لئے ان

خطوط میں آپ کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے آثار اور اس کی علمی سطح کی بلندی، دونوں کی خفیف سی جھلک نظر آجائے گی۔ (ان امور کا تفصیلی تعارف میری دوسری مبسوط تصانیف سے ہو سکے گا۔ خطوط میں تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں ہو سکتی)

میرے ایک دوست نے (جن کے ذوقِ سلیم کا میں معترف ہوں) کہا ہے، کہ سلیم کے نام میں جان نہیں۔ اس میں کچھ بُولا پن "سا پایا جاتا ہے"، حالانکہ میرا مخاطب نوجوان "کڑی کمان کے تیر" جیسا ہونا چاہیئے تھا۔ یہ اعتراض درخورِ اعتنا ہے اور اسی لئے میں نے "سلیم کے تعارف" میں اس کا تذکرہ ضروری سمجھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں سلیم کا وہ مفہوم نہیں جس مفہوم کے لئے یہ لفظ عام طور پر ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ "قلب سلیم" لیکر آئے تھے (اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۳۷/۸۴) اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی تفصیلاً بتا دیا ہے کہ سیرتِ ابراہیمیؑ کے خط و خال کیا تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ انہوں نے کائناتی قوانینِ خداوندی کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ (وَكَذٰلِكَ نُرِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۶/۷۵) جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ زندگی کے جو نقشے خارجی حوادث سے تغیر پذیر ہو سکتے ہوں وہ کبھی مستقل اقدار کے حامل نہیں بن سکتے (قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ۶/۷۶) ان کی دوسری خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ جب تک کسی راستے کے متعلق پورا پورا اطمینان نہیں کر لیتے تھے، اس پر گامزن نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ جب ان سے کہا گیا کہ وہ پیشِ نظر قوم تک زندگی کا پیغام پہنچائیں تو انہوں نے کہدیا کہ میں یہ کچھ اسی صورت میں کر سکوں گا جب میرا اطمینان ہو جائے کہ مردہ قومیں کس نہج و اسلوب سے زندہ ہوا کرتی ہیں۔ (رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ۲/۲۶۰) جب انہیں اطمینان ہو گیا کہ زندگی کا یہی راستہ صحیح ہے تو پھر وہ دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے راستہ میں حائل نہ ہو سکی اور کوئی مشکل اور مصیبت ان کے عزم و ثبات میں لغزش پیدا نہ کر سکی۔ انہوں نے سب سے پہلے خود اپنے باپ سے علانیہ کہدیا کہ تم کس غلط راستے پر چل رہے ہو۔ چھوڑو اس راہ کو اور زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرو حالانکہ یہ ظاہر تھا کہ باپ کی اس مخالفت سے وہ اس جاہ و منصب سے محروم رہ جاتے تھے جو انہیں اسکی جانشینی میں ملنے والا تھا۔ اور اگر باپ ان کی بات مان لیتا تو ان کے خاندان سے وہ عزت و تکریم سب چھن جاتی تھی جو اُس زمانے میں شاہی معبد کے پیشوا کو حاصل تھی۔ لیکن انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہایت جرأت و بیباکی سے باپ کو غلط راستے پر چلنے سے ٹوک دیا۔ اس سے آگے بڑھے تو پوری کی پوری قوم کے خلاف آواز بلند کر دی اور انہیں للکار کر کہدیا کہ یاد رکھو! تمہاری روش تمہیں تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لئے جا رہی ہے۔ قوم سے آگے بڑھے تو خود بادشاہ سے ٹکر لے لی اس بادشاہ سے جو اُس وقت خدا سمجھا جاتا تھا۔ جسے اپنی قوت و جبروت کے متعلق ایسا گھمنڈ تھا کہ اس نے کہدیا کہ تم کس خدا کی باتیں کر رہے ہو کہ وہ مارتا ہے اور جلاتا ہے! اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ (۲/۲۵۸) میں مارتا ہوں اور میں ہی جلاتا ہوں۔ زندگی اور موت میرے قبضے میں ہے۔ اس بادشاہ سے کھلے بندوں ٹکر لی اور اس کے تمرد کی آگ میں بلا تامل و توقف کود پڑنے کیلئے تیار ہو گئے۔ اسکے بعد جب یہ دیکھا کہ اپنے وطن کی فضا ان کے پیغام کیلئے سازگار نہیں ہے تو گھر بار، عزیز و اقارب، وطن اور ماحول

کی تمام جاذبیتوں کو ٹھکراتے ہوئے یہ کہہ کر نکل کھڑے ہوئے کہ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (۳۷/۹۹) میں اس فضا کی تلاش میں جا رہا ہوں جہاں اپنے خدا کے نظامِ ربوبیت کو عملاً متشکل کر سکوں۔ پھر جب یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مقصد کے حصول کے لئے بیٹے جیسی متاعِ عزیز کی قربانی کا مطالبہ ہے تو اس کے حلق پر چھری رکھ دی اور جب "خدا کے گھر" کو بسانے کی خاطر اپنی اولاد کو ایک بے برگ و گیاہ وادی میں آباد کرنے کا سوال پیدا ہوا تو اس پر بھی لبیك اللّٰھم لبیك کہتے ہوئے سامنے آ گئے۔

یہ ہیں اس قلبِ سلیم کے خصائص و مظاہر جو حضرت ابراہیمؑ کے سینے میں ضَو فشاں تھا۔ ان خصوصیات کا نتیجہ کیا تھا؟ قرآن نے اسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے، جہاں یہ فرمایا کہ انہیں "قوت و بصیرت دونوں حاصل تھیں۔" (۳۸/۴۵) یہی ہے ان خطوط کا مخاطب سلیم۔ یعنی قوت اور بصیرت دونوں کا پیکر۔ اس لئے کہ

قوتِ بے رائے جہل است و جنوں
رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں

لہٰذا سلیم دورِ حاضر کے آذرانہ ماحول میں براہیمی نظر کا حامل نوجوان ہے اور یہ ظاہر ہے کہ

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

* * *

جہاں تک خطوط کا تعلق ہے، ان کے تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ اپنا تعارف آپ کرا دیں گے۔ صرف اتنا بتا دینے کی ضرورت ہے کہ ان کی ترتیب میں ذہنی تدریج اور فکری ارتقاء کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ابتدائی چھ خطوط میں زندگی کے روزمرہ کے معاملات کے متعلق عام فہم انداز میں گفتگو کی گئی ہے اور ان کا پس منظر پنجاب کا دیہاتی ماحول ہے۔ ان میں تجریدی گفتگو یا فلسفیانہ مباحث کو دخیل نہیں ہونے دیا گیا۔ ان کا رنگ عام اصلاحی ہے اور سطح بھی اونچی نہیں۔

ساتویں خط میں اسلامی نظام کے اس بنیادی اصول سے بحث کی گئی ہے کہ ہمارے آئین کا ماخذ کیا ہے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس سوال نے ایک عملی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ ہمارا دستور کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ عام مطالبہ یہ ہے کہ یہ دستور اسلامی ہونا چاہیئے۔ لیکن اس متفقہ علیہ فیصلہ کے باوجود کوئی نہیں بتا سکا کہ اسلامی دستور کہتے کسے ہیں؟ یہ اس لئے کہ ہمارے ہاں (یعنی مسلمانوں میں، خواہ وہ دنیا کے کسی ملک کے رہنے والے ہوں) آج تک خود اسلام ہی کی کوئی جامع تعریف (Definition) نہیں ہو سکی۔ ہر فرقے کا اسلام الگ ہے اور ہر گروہ کا الگ۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نام ہے، خدا اور رسول کی اطاعت، یا کتاب و سنت کی اتباع کا۔ لیکن ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ وہی کتاب و سنت کے متبع ہیں، دوسرے لوگ اس کے متبع نہیں ہیں۔ اس پریشانیٔ فکر و نظر اور تشتتِ تصور و خیال میں اس کا تعین ہی ناممکن ہو چکا ہے کہ کتاب و سنت کی اتباع کسے کہتے ہیں اور اسلام کیا ہے؟ میں نے اس مشکل ترین مسئلہ کے متعلق تفصیلی طور پر اپنی کتاب "اسلامی نظام" میں گفتگو کی ہے لیکن اس کا اجمالی سا تعارف ساتویں خط میں آ گیا ہے۔

آٹھویں خط میں اس نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے کہ حکومت و مملکت اور قوت و دولت بجائے خویش مقصود بالذات ہیں یا

یہ کسی بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ قرآن، ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض، (حکومت و مملکت) قرار دیتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی اکثر قومیں جو نہ ایمان رکھتی ہیں اور نہ ہی اُن کے اعمال، ہمارے معیار کے مطابق صالح ہیں، حکومت و مملکت کی مالک ہیں۔ اس سے ذہن میں ایک الجھاؤ پیدا ہوتا ہے جس کا سلجھانا نہایت ضروری ہے۔

نواں خط اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں انسانی ذات 'ایگو'، نفس یا خودی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب گفتگو انسانی ذات کے متعلق ہوگی تو بحث خالص نفسیاتی اور فلسفیانہ ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے یہ خط دقیق بھی ہے اور تجریدی (Abstract) بھی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر انسانی ذات کے متعلق بات سمجھ میں نہ آئے تو اسلام کے متعلق بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اسلام کا سارا نظام انسانی ذات کی نشوو ارتقا ہی کے لئے ہے۔ اس لئے یہ خط خاص توجہ چاہتا ہے۔

اس کے بعد دو خطوط (دسویں اور گیارھویں) میں کمیونزم (اشتراکیت) کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان خطوط کی اہمیت کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کمیونزم ہمارے دور کا سب سے اہم مسئلہ ہے جو ہر نوجوان کے لئے جاذبِ توجہ بن رہا ہے اس کے متعلق خیالات و آراء کے تضاد کا یہ عالم ہے کہ اگر ایک طرف سے یہ آواز آتی ہے کہ کمیونزم، اسلام کی سخت دشمن اور اس کی یکسر نقیض ہے تو دوسری طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز ہے۔ یا کم از کم یہ کہ اسلام خود ایک اشتراکی مذہب ہے، اس دوراہے پر کھڑا ہونے والا نوجوان ان متضاد آراء میں گھِر کر بوکھلا جاتا ہے اور کچھ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ حقیقت ہے کیا۔ وہ ایک طرف اشتراکیت میں جاذبیتیں دیکھتا ہے، لیکن اپنے تحت الشعور میں اسلام کی محبت بھی رکھتا ہے، اس لئے اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہمارے نوجوانوں کے لئے یہ ذہنی کشمکش بڑے خطرناک نتائج کا موجب بن رہی ہے، اس لئے انہیں اس سے نکالنا نہایت ضروری ہے۔ یہ دو خطوط اسی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہیں۔

بارھویں خط میں اس نظامِ ربوبیت کا اجمالی سا تعارف آگیا ہے، جو میرے نزدیک قرآن کی تعلیم کا نقطۂ ماسکہ ہے ویسے تو یہ خط، اشتراکیت اور اسلام ہی کے موضوع ہی کی اگلی کڑی ہے لیکن اس میں بہت سے گوشے ایسے آگئے ہیں جو اسلام اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جہاں تک میری قرآنی بصیرت میری راہ نمائی کرتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ قرآن جس منزل تک انسانی معاشرہ کو لیجانا چاہتا ہے وہ نظامِ ربوبیت ہی کی منزل ہے۔ اس موضوع پر میری مستقل تصنیف "قرآنی نظامِ ربوبیت" (جس کی اس وقت کتابت ہو رہی ہے) اس نظام کے "منشور" (Manifesto) کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ خط اسی کا تعارف ہے۔

اس نظام کے بنیادی ستون "صلوٰۃ اور زکوٰۃ" ہیں۔ اسلئے تیرھویں خط میں بتایا گیا ہے کہ ان اصطلاحات کا قرآنی مفہوم کیا ہے اور آجکل ان سے کیا مفہوم لیا جاتا ہے۔ قرآن، ضابطۂ زندگی کی کتاب ہے جس کی اپنی اصطلاحات ہیں جب تک

ان اصطلاحات کا مفہوم خود قرآن سے متعین نہ کیا جائے، اس کا مقصود سمجھ میں نہیں آسکتا۔

انسان کی عام حالت یہ ہے کہ صحیح بات تو اس کی سمجھ میں آجاتی ہے لیکن وہ اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔ کون نہیں جانتا کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا بُرا، لیکن کتنے لوگ ایسے ہیں جو ہمیشہ سچ بولتے ہیں، جھوٹ نہیں بولتے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ سوال دنیائے اخلاق و ضوابط میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کا صحیح جواب، دنیائے انسانیت کی کئی الجھنوں کو سلجھا سکتا ہے۔ چودھویں خط میں اسی اہم مسئلہ پر گفتگو کی گئی ہے۔

اس خط میں ضمناً ختم نبوت کا ذکر بھی آگیا ہے۔ "ختم نبوت" سے ہمارے ہاں صرف اتنا ہی مفہوم لیا جاتا ہے کہ "میرزا غلام احمد سچا تھا یا جھوٹا" حالانکہ یہ انسانی دنیا کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے اور اس کا تعلق زندگی کے اہم گوشوں سے ہے۔ لیکن یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پہلے خود مقامِ نبوت اور مقامِ رسالت کی ماہیت سمجھ میں نہ آجائے اور یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ ان کا ہماری زندگی سے تعلق کیا ہے۔ پندرھویں اور سولہویں خط میں انہی عنوانات پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان خطوط سے آپ دیکھیں گے کہ یہ عنوانات مناظروں اور مباحثوں کے جدل انگیز موضوعات کے بجائے، انسان کی عملی زندگی کے جیتے جاگتے مسائل ہیں اور انسانی معاشرے سے ان کا تعلق بہت گہرا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا مقامِ محمدیؐ سے آشنا نہیں ہوتی نہ وہ مقامِ انسانیت کو پہچان سکتی ہے اور نہ ہی اسے خدا کے متعلق کچھ علم ہو سکتا ہے۔

ایک بات آپ صبح سے شام تک سینکڑوں بار دہراتے ہیں۔ یعنی یہ کہ "انسانی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے"۔ "یہ بات تو ان کی فطرت میں ہے"۔ "اسلام دینِ فطرت ہے"۔ لیکن آپ نے کبھی سوچا بھی کہ "انسان کی فطرت" ہوتی کیا ہے؟ غالباً آپ نے نہیں سوچا۔ سترھویں خط میں آپ کو اس سوال کا جواب ملے گا اور (غالباً) آپ کی توقعات کے یکسر خلاف!

اٹھارویں خط میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہ عنوان درحقیقت نظامِ ربوبیت ہی کی ایک کڑی ہے لیکن چونکہ بڑی اہم کڑی ہے اس لئے اس کا مطالعہ خاص غور و فکر کا متقاضی ہے۔

ایک سوال اور بھی ایسا ہے جو اکثر ذہنوں کو کشمکش میں مبتلا رکھتا ہے۔ ایک طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ انسانی عقل زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ لیکن دوسری طرف ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کی اپیل ہی انسانی عقل و بصیرت سے ہے! اس تضاد کے معنی کیا ہیں اور اس میں توافق کی کیا شکل ہے؟ انیسواں خط اسی چیستان کا جواب ہے۔

اور بیسواں خط اس اہم ترین اور مشکل ترین سوال سے بحث کرتا ہے جس نے انسانی ذہن کو ہمیشہ سے طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔ یعنی "خدا کا تصور"! اس خط کو بھی بڑے غور و انہماک سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

آخری خط میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں اس سیرت و نظام کے مظاہرے کس صورت میں ہوتے تھے جسے قرآن متشکل کرنا چاہتا ہے۔ اس خط میں نہ تو اندازِ گفتگو فلسفیانہ ہے

اور نہ ہی اس سے مقصود تاریخی استقصا ہے۔ جنتِ ارضی کی بس ایک خفیف سی جھلک ہے جو دامنِ نگاہ کو کفِ ہزار گل فروش بنا دیتی ہے۔

* * *

ان خطوط میں بہت سی باتیں ایسی ہوں گی جو شاید آپ کے سامنے پہلے پہل آئیں۔ چونکہ نامانوس چیز کو دیکھ کر متحیر ہو جانا (یا بدک جانا) تقاضائے جبلت ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ایک بار کے مطالعہ سے آپ ان باتوں سے متفق نہ ہوں۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ ایسے مقامات کو زیادہ مرتبہ پڑھئے اور ان پر گہری نظر ڈالئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح آپ کا قلب اور دماغ دونوں مطمئن ہو جائیں گے۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ میرا مسلک یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں آخری سند قرآن کریم ہے۔ اس لئے جن مقامات میں آپ کو کچھ تامل ہو وہاں یہ دیکھئے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کی سند قرآن سے ملتی ہے یا نہیں۔ یہ نہ کہئے کہ چونکہ یہ چیز اس روش کے خلاف ہے جس پر ہم صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اس لئے یہ غلط ہے۔ جب قرآن کی روشنی اور عقل کی آنکھ ہمارے پاس موجود ہے تو ہم خود اپنا اطمینان کیوں نہ کر لیں کہ ہم جس راستے پر چل رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط۔ اس باب میں اگر کوئی بات وضاحت طلب ہو تو میں مزید مشورے کے لئے حاضر ہوں۔

* * *

ان خطوط میں آپ کو بعض باتوں کی تکرار نظر آئے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی کتاب میں تکرارِ مضامین، تصنیف کا نقص ہوتا ہے لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہ کیجئے کہ یہ کتاب خطوط کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ اس قسم کے خطوط میں ہوتا یہ ہے کہ جو بات سامنے آئی اسے وہیں بیان کر دیا۔ اب ظاہر ہے کہ جب اس قسم کے خطوط یکجا (مجموعہ کی شکل میں) سامنے آئیں گے تو ان میں بہت سی باتیں دہرائی ہوئی ملیں گی۔ یہ تکرار جہاں بعض نازک طبائع پر ناگوار گزرے گی وہاں اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ جو باتیں نئی نئی معلوم ہوں گی، وہ بار بار سامنے آ کر واضح ہوتی چلی جائیں گی۔ (اسی مقصد کے پیش نظر، قرآن نے بھی اپنے ہاں تکرار کو روا رکھا ہے۔ وہ "تصریفِ آیات" سے اپنے مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔

* * *

جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے، میری تمام کاوشوں کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے اسے کسی نہ کسی طرح قوم کے نوجوانوں تک پہنچا جاؤں۔ اگر میری اس کوشش سے قوم میں چند ایک نوجوان بھی ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے قرآن کے نورِ بصیرت کو عام کرنے اور اس کے نظامِ ربوبیت کو عملاً متشکل کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری دیدہ ریزی اور جگر کاوی کا صلہ مل گیا۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ جو قرآنی فکر میں پیش کر رہا ہوں، موجودہ دور کا مسلمان اسے قبول کرنے کے لئے بمشکل آمادہ ہوگا۔ لیکن میں فطرت کے خاموش اشاروں سے

سمجھ رہا ہوں کہ زمانہ خود قرآنی تصوراتِ زندگی کو اپنانے کے لئے بڑا مضطرب و بے قرار ہے۔ وہ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے اور وہ وقت شاید قریب آ رہا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ

زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔

دیکھنا یہ ہے کہ قرآن کے نظامِ ربوبیت کو متشکل کرنے کی سعادت کس قوم کے حصے میں آتی ہے۔ جس قوم کو یہ سعادت نصیب ہو گئی، وہی نوعِ انسانی کی امامت کی مستحق قرار پائے گی۔

چونکہ ان خطوط نے ملک کے نوجوان طبقے میں نہایت عمدہ اثر پیدا کیا ہے اس لئے میں یہ کوشش کروں گا کہ یہ سلسلہ جاری رہے۔ ان کے ساتھ ہی اب "طاہرہ کے نام" خطوط کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا ہے، کیونکہ سلیم کے ساتھ اس کا بھی برابر کا حق ہے (بلکہ ایک حیثیت سے اس سے بھی زیادہ)۔ یہ خطوط، حسبِ معمول طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہیں گے۔

وَمَا توفیقی الا باللہ العظیم

کراچی۔ ۲۶؍ مئی ۱۹۵۳ء

پرویز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلیم کے نام پہلا خط

(ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں)

سلیم! میرے مضامین پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآن کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جو خدائے حکیم و خبیر نے اس عدیم النظیر کتاب مبین میں بے نقاب کر کے رکھ دیئے ہیں اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور نجات و فلاح کے لئے غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کریم کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوع انسانی کی جملہ مشکلات کا واحد حل اور تمام مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں۔ اور میرا یہ اعتقاد محض خوش عقیدگی پر ہی مبنی نہیں بلکہ میں علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں؛ ایسا یقین جو وجۂ طمانیتِ قلب اور باعثِ تسکینِ روح ہوا کرتا ہے۔

تم پوچھتے ہو، اور ایسا پوچھنے میں تم بالکل حق بجانب ہو کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے۔ روزے بھی رکھتی ہے۔ زکوٰۃ بھی دیتی ہے۔ حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہد صحابہؓ میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں ہو، اور نہ ہی یہ طریق ان حقائق کو سمجھنے کے لئے چنداں مفید ہوا کرتا ہے، اس لئے

تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ "اعمالِ حسنہ" کیوں بے نتیجہ ہو رہے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب، جبکہ آفتاب کی شعاعوں میں تمازت باقی نہیں رہی، رحمت کی بیوی اپنے خورد سال بچوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھری میں آ بیٹھتی ہے۔ رحمت کی بیوی کو تم جانتے ہو؟ تم بچپن میں اُن کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی و شادابی ہوتی۔ لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسی افسردگی اور پژمردگی میں بدل دیا تھا کہ وہ ایک اُجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا، جس پر سوائے نورِ عصمت کے (جو ہر ایسی پاک دامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہیئے) رونق اور زندگی، تازگی اور بشاشت کا کوئی اثر باقی نہ تھا۔ ہاں! وہ اپنے بچوں کو لے کر چولھے کے قریب آ بیٹھی خشک ٹہنیاں، سوکھے ہوئے پتے، خس و خاشاک وہ دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔ اسے سُلگا دیا تاکہ بچے تاپتے رہیں۔ لیکن سردی سے زیادہ تو بچوں کو بھوک ستا رہی تھی۔ اُن کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیا اور یوں، ان ننھے بچوں کو نہیں! خود اپنے دل کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور اُن کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ جھٹ پٹا ہو گیا تو گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں، پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئیں، گھٹنوں تک پُرانا تہمد۔ پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ بس، اس شدت کے جاڑے میں یہی کُل کائنات۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں۔ گھر کی طرف قدم اٹھاتا، لیکن قدم بہ مشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو بیوی نے خاموشی سے بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔ اُس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدوری نہیں ملی۔ دن بھر اِدھر اُدھر پھرنا، لوگوں کی منتیں خوشامد کیا کرتا رہا لیکن کوئی کام نہ مل سکا۔

عین اسی وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت و عظمت پر ایک دوسرے کو مبارک باد اور خواجہ صاحب کو علوِ مرتبت اور اقبال کی دعائیں دے رہے تھے۔

* * *

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہو نا! وہ تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کس قدر ذہین اور کیسا شریف بچہ تھا، لیکن بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اُس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے؟ میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچہ کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔ لیکن دل کڑا کر کے بیٹے کو تسلی دی کہ مدرسے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں ابھی پکاتی ہوں۔ جاؤ میرا بیٹا! اللہ حافظ!

سلیم! اگر ہمت ہو تو اُس ماں کے دل کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قدر قیامت خیز جذبات غم و حُزن کا طوفان برپا ہوگا۔ وہ غربت و فلاکت کا مجسمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا تو ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ باہر چلی گئی ہوگی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے؟ عنایت اللہ نے اندر آ کر سب سے پہلے روٹی والے رومال کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموش باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ متنوع پھل، قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چنی رکھی تھیں، کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دو وقت کا بھوکا یتیم، انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ مل جائے تو

ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

* * *

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اُس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدّت ہوئی جالی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لُٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا ہے وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلہ میں ایک حکیم جی تھے وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ بھولی وہاں سے نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اٹھنّی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلّے کے ایک ایک گھر میں جا کر منّتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے قرض مل جائیں لیکن کسی نے نہ دیئے۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ اُس دن کا واقعہ ہے جس دن جناب کمشنر صاحب بہادر نے "مہر اشرف میموریل ہسپتال" کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔

* * *

اور تم نے رضیہ بچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ اسے جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے کپڑے تک نہیں کہ ستر ڈھانپ کر گھر کی چار دیواری سے باہر نکل سکے۔ جب اس نے کپڑے تک مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِ راہ کیا ہو گا۔ اس نے گاؤں کے میراثی اور نائی کو کہلا بھیجا کہ کوئی اس کے ساتھ جائے لیکن جب انہیں علم تھا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اُجرت کیسے ساتھ ہو لیتے۔ گاؤں میں دور و نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسے فرصت تھی کہ اس کی مصیبت میں اُس کے ساتھ ہو لے؟ سارا گاؤں فتو خاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں تھا۔ غریب اکیلی، چلچلاتی دھوپ میں پیدل روانہ ہو گئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے۔ [یہ وہی رضیہ

تھی جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں جو ("شمس العلماء" تھے) دو حج کئے تھے اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان مذہبی معاملات میں اپنے کٹرپن میں مشہور ہیں۔ لیکن وہ "مذہبی معاملات" کیا ہیں؟ ذرا سُن لو۔ وہابی اور حنفی کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آتے تھے۔ اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا۔ خود حنفیوں کے ہاں بھی دو پارٹیاں بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ میں نے فریقین کے نمایندوں کو بلا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک "عظیم الشان" مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ یہ مولوی صاحب، بقول ایک گروہ کے بہت "بھاری" مولوی صاحب تھے۔ تین تین کوس تک ان کی آواز جاتی تھی۔ انہوں نے مسئلہ بیان کیا کہ مسجد کی شان رسول اللہؐ کی شان سے بڑی ہے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ خود مسجد میں چل کر آتے تھے اور مسجد کبھی ان کے پاس چل کر نہیں جاتی تھی۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ رسولؐ اللہ کی شان کو مسجد کی شان سے بڑا سمجھتے تھے۔ پھر کیا تھا دو پارٹیاں بن گئیں۔ باہمی جھگڑے ہوئے، لڑائیاں ہوئیں، مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ قریب سال بھر ہو گیا۔ یہ آگ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے اور ہر فریق اس جدوجہد اور مساعی حسنہ کو "جہادِ عظیم" قرار دے رہا ہے۔ اسی باہمی تشتت و انتشار کا نتیجہ ہے کہ کھیت ویران ہو رہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ زمین کا بیشتر حصہ جاٹوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ بقایا رہن رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد تم دیکھو گے کہ جاٹ تمام گاؤں کے مالک بن جائیں گے اور یہ "دین دار" مسلمان ان کے مزارعہ ہو جائیں گے۔ اس پر مولوی صاحب انہیں مبارک باد دیں گے کہ انہوں نے یہاں کی زمین بیچ کر بہشت کی زمین خرید لی۔ اس لئے یہ سودا خسارے کا نہیں۔

تم کہو گے کہ یہ تو جہلا کی باتیں ہیں۔ لیکن تمہیں وہ خطبۂ جمعہ بھی تو یاد ہو گا جو شہر کی جامع مسجد میں شعبان المعظم کے مبارک مہینہ کی تقریب پر تم نے خود سنا تھا۔ جناب خطیب نے جو خدا کے فضل سے دیوبند کے فارغ التحصیل مولوی صاحب ہیں اور جن کے پاس اپنے بیان کی تائید میں سینکڑوں حوالے بھی موجود تھے، یہی فرمایا

تھا کہ "شب بارات ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ پکار پکار کر کہتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے جو جی میں آئے مانگیں۔ میں ہر ایک کی طلب کو پورا کروں گا۔ لہٰذا جس شخص نے اس رات میں پچاس نفل پڑھ کر مغفرت کی دعا، مانگ لی اس کی نجات کا اللہ تعالیٰ خود ذمّہ دار ہے" اس کے بعد تمہیں یاد ہوگا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور انہوں نے فرمایا تھا کہ رحمتِ خداوندی کے اس بحرِ ذخار میں ہر ایک کا حصہ برابر ہوگا۔ لیکن ایک سوختہ بخت اس سے محروم رہ جائے گا۔ لوگوں کی آنکھیں ادہر کو اٹھیں کہ معلوم کریں کہ وہ کون بدنصیب ہوگا جو ابرِ رحمت کی ایسی گہرباری سے فیض یاب نہ ہو سکے گا؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایک، اور صرف ایک شخص اس رحمت سے محروم رہ جائے گا۔ یعنی وہ جس کا پاجامہ اس کے ٹخنوں سے نیچا ہوگا۔ یہ تو سلیم! "جہلا" کی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی مولوی صاحب یہ کچھ اپنی طرف سے بیان کر رہے تھے۔ انہیں یہ سب کچھ "عین اسلام" کہہ کر پڑھایا گیا تھا۔ اور وہ اسی کو "عین اسلام" سمجھ کر آگے پہنچا رہے تھے! ہاں! تو میں تمہیں رضیہ بی بی کی بپتا کی داستان سنا رہا تھا۔ اور ایک رضیہ پر ہی کیا موقوف ہے۔ ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے واقعات ہر روز تمہارے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ سو عزیزم! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہونا کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے، ان کی زکوٰۃ اور ان کے حج یعنی ان کے "اعمالِ حسنہ" وہ نتائج کیوں پیدا نہیں کرتے جو ہونے چاہئیں تھے، کچھ تعجب انگیز نہیں۔ سلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم غور سے اس کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظامِ زندگی ہے۔ دنیا کے مذاہب جن میں انسانی تصرفات ہو چکے ہیں مذہب کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ عبادت سے ان کا مفہوم "تزکیۂ نفس" ہوتا ہے اور بس۔ لیکن اسلام ایک ایسا معاشرہ (سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوعِ انسانی کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ لے۔ اس مقصدِ عظیم کیلئے اسلام ہر عبدِ مومن کو اس کارگہِ حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری

نتیجہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ لیکن یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ ہو مشینری بے کار ہو جائے گی۔ آج ہماری مشینری بے کار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عملی رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و اعمال میں سرایت کر چکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلت و مسکنت، افلاس و نکبت کا چھا جانا۔ اور پھر اس قوم کا اس حالت پر مطمئن ہو جانا۔ خدا کا غضب ہے، اللہ کا عذاب ہے۔ اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان و عمل کا نتیجہ شوکت و عظمت، تمکن و استخلاف نہیں (یا ابتداءً وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ لیے نہیں جا رہے) وہ ایمان، ایمان اور وہ عمل، عملِ صالح نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ اللہ کے وعدے تو بہر حال سچے ہیں۔ اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کے معراجِ کبریٰ۔ یعنی دورِ رسالت کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کون سا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہی تو تھا جس نے چند سال کے عرصہ میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا، بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور کھجوروں کے ستو کھا کر گذارہ کرنے والی قوم قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ ان ہی سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مردِ مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزاء تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان (یعنی مقصودِ آخر) قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اللہ کا وہ پروگرام (نظام) جو دنیا

میں خدا کی ربوبیتِ عامہ (نوعِ انسانی کی پرورش و تربیت) کا مظہر ہے۔ لہٰذا جو اعمال اس نظام کے قیام کا ذریعہ نہیں بنتے وہ بے روح رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

* * *

سلیم! ایک مرتبہ اس چیز کو پھر سن لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمالِ اسلامی کا ماحصل محض اسی دنیا کی فلاح و کامیابی، غلبہ و تسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمالِ اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت و سطوت۔ شوکت و عظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں بھی سُرخروئی اور آبرومندی کی زندگی۔ اگر ہمارے اعمال اس دنیا کی شوکت و عظمت پیدا نہیں کرتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارے اعمال اسلام کی میزان میں پورے نہیں اُترتے۔

* * *

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہو گئی۔ حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی بات بھی سمجھ نہ سکے۔ اس سے تم متفق ہو گے کہ اسلام کا مقصد انسانوں کو تمام انسانی سلاسل و اغلال سے آزاد کر کے انہیں صرف اللہ کی حکومت کے ماتحت رکھنا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا مسلمانوں کی تاریخ کے اوراق اُلٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد امت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں قائم ہوا۔ اور ہر وہ طوق جسے اتار پھینکنے کیلئے اسلام آیا تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا؛ اُممِ گزشتہ کو جن جرائم کی پاداش میں عذابِ الٰہی میں گرفتار کیا گیا تھا کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے؟ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو اُن پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی سختی سے عذاب آنا چاہیئے تھا کہ ان کے پاس قانونِ خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہنمائی کے لئے موجود تھا۔ لیکن انہوں نے اسے

پس پشت ڈال دیا۔ (نبذوا کتاب اللہ وراء ظہورہم) کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہیئے تھی؟ ان کو وراثت کتاب کے لیئے منتخب کیا۔ انہیں نوع انسانی کے لیئے بہترین اُمّت قرار دیا۔ لیکن سب ایمان وعمل کے بدلے میں، نہ صرف نام رکھانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا عذاب کیوں مسلط ہوا۔ سلیم! اخوت، مساوات، حریت۔ وحدتِ انسانی۔ خدا اور بندے کا براہ راست تعلق، جماعتی زندگی، مرکزِ اطاعت۔ فرد کا ملّت میں جذب ہو جانا اور ملّت کا افراد کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ تھیں نظام حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاءِ الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دور ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو اور اس کے بعد قرآن کریم کی خوردبین سے پرکھتے جاؤ اُمّت مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

لیکن بایں ہمہ عزیزم! ہمارے لیئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جس قرآن نے ایک مرتبہ وہ نظام قائم کیا تھا وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج پیدا کرتے ہیں جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنّی ہے (ولو ان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکٰت من السمآء والارض)۔ اس ایمان و تقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآن کریم سے ملے گی۔ بشرطیکہ تم اسے انسانی کتربیونت سے بلند و برتر خدائے حیّ و قیوم کا مکمل ضابطۂ حیات سمجھو اور مسلمان کی زندگی کا نصب العین قرار دو۔ یعنی زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام۔

والسلام

نومبر ۱۹۳۹ء

سلیم کے نام دوسرا خط

ہمارے مذہبی اجتماعات

سلیم! تم ٹھیک کہتے ہو کہ جمعۃ الوداع کے دن جامع مسجد میں قریب پچاس ہزار مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور تم نے یہ بھی درست کہا کہ اس عظیم الشان گروہ کے ایک آواز پر جھکنے اور اٹھنے کی ہم آہنگی کا نظارہ بڑا دل کش تھا۔ اس کی دل کشی تو اس سے بھی ظاہر ہے کہ بڑے بڑے سیاح آپ کے اس "تماشے" کی تصویریں لینے دور دور سے آتے ہیں اور اُن کے لئے مسجد کے سب سے بلند مقام پر، اُن حضرات کی طرف سے سہولتوں کے سامان بہم پہنچائے جاتے ہیں، جن سے اگر تصویر کشی کے متعلق فتویٰ طلب کیا جائے تو کبھی تکفیر سے ورے بات نہ کریں۔ یہ تو تھا جملۂ معترضہ۔ لیکن سلیم! میں پوچھتا ہوں، کہ مسلمانوں کے اس قدر بڑے ہجوم میں کتنے انسان تھے کہ جسمانی حرکات کی ہم آہنگی کے ساتھ اُن کے قلوب بھی ہم آہنگ ہوں۔ اسلام، وحدتِ خیال کے بعد، کہ جسے اصطلاح میں ایمان کہا جاتا ہے، وحدت فی العمل کا سبق سکھانے آیا تھا۔ اور اس اتحادِ عمل بلکہ ائتلافِ خیال و عمل کے بہترین مظاہرے اسی قسم کے اجتماعات تھے۔ لیکن ذرا غور کر کے بتاؤ تو سہی کہ اس ظاہری اتحادِ عمل میں حقیقی اتحادِ خیال و اعمال کا جذبہ کس حد تک کارفرما تھا؟ تم نے دیکھا ہوگا کہ مولوی صاحبان صف بہ صف۔ اِدھر اُدھر لوگوں کو نمازِ باجماعت کے مسئلے بتلاتے پھرتے تھے۔ وہ سمجھاتے تھے کہ صفیں کس طرح

سیدھی رکھنی چاہئیں۔ دونوں پاؤں کے درمیان فاصلہ کس قدر ہونا چاہیئے۔ کندھے کے ساتھ کندھا نہ ملنے سے کتنا عذاب ہوگا۔ پہلی صف میں بیٹھنے سے کس قدر ثواب ہوگا۔ لیکن سلیم! ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ بتایا کہ مسلمانو! تم یہاں جمع کس غرض کے لیئے ہوئے ہو؟ تمہیں نماز کیا پیغام دیتی ہے؟ جماعت کے ساتھ ملنا کیوں ضروری ہے؟ یہ اُٹھنا بیٹھنا کیسا ہے! صفیں کیوں سیدھی ہونی چاہئیں! امام صرف ایک ہی کیوں ہوتا ہے! اور اس کی ایک آواز پر بلا چون و چرا سب کو ایک ہی حرکت کیوں کرنی پڑتی ہے؟ وہ غلطی کرتا ہے تو اُس کی غلط متابعت کیوں ضروری ہوتی ہے! ایک وقت میں ایک ہی جماعت کیوں ہوتی ہے، متعدد جماعتیں کیوں نہیں ہو سکتیں؟ تماشا دیکھنے والے سیاح جب اس نظارہ کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تو مسلمانوں کے ضبط و انضباط۔ وحدتِ خیال و عمل - یک نگہی اور ہم آہنگی — اطاعت و تمسک بالجماعت کی بے حد تعریف کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے وہ بھی آشنا ہو چکے ہیں کہ یہ سب مظاہرہ اب صرف جسموں تک ہی محدود ہو چکا ہے۔ قلوب پر اس کا کچھ اثر نہیں۔ یہ ایک رسم بن کے رہ گیا ہے۔ اس کی روح بالکل بھلائی جا چکی ہے۔ آج دنیا کی ہر قوم اپنی تمام قوت اس مقصد کے لیئے صرف کر رہی ہے کہ اُن کے افراد میں اتحادِ خیال و وحدتِ عمل پیدا ہو۔ اُن کے قلب و نگاہ میں یک جہتی اور اُن کی حرکات و سکنات میں یگانگت ہو جائے۔ وہ ایک "امام متفق علیہ" کی آواز پر سب کے سب جھک جائیں۔ اور سب کے سب اُٹھ کھڑے ہوں۔ اب اندازہ لگاؤ کہ جس قوم میں یہ سب چیزیں بلا محنت و کاوش خود بخود موجود ہوں لیکن اس سے کچھ نتیجہ برآمد نہ ہو۔ تو اُسے تم بے روح مظاہرہ نہ کہو گے تو اور کیا کہو گے؟ اور پھر یہ بھی دیکھو کہ دنیا ضبط و انضباط تلاش کر رہی ہے محض اس لیئے کہ اس طرح اپنے اندر قوت پیدا کر کے اپنی ستم کوشیوں کی تشنگی کمزوروں کے خونِ ناحق سے بجھائے۔ لیکن ملتِ اسلامیہ میں یہ سب کچھ اس لیئے پیدا کیا جاتا ہے کہ اُن کے قلوب پاکیزہ ہوں۔ اُن کی روح میں بالیدگی آئے۔ وہ ہر وقت اللہ کے قانون کو سامنے رکھیں، اُن کا جھکنا ہو تو اُس کے لیئے، اُٹھنا ہو تو اُس کے لیئے۔ اُن کی قوت ناتوانوں کی

حفاظت کے لئے ہو۔ اُن کی طاقت، ضعیفوں کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ وہ اپنے ایمان و اعمال صالحہ سے ایسی قوت پیدا کریں کہ استخلاف فی الارض کی نعمتِ کبریٰ سے نوازے جائیں۔ اور اس استخلاف سے مقصود ملوکیت نہ ہو بلکہ اس دنیا میں خدا کی ربوبیت (نوعِ انسانی کی پرورش) عام کرنا ہو۔ سلیم! اندازہ لگاؤ کہ رمضان کا آخری جمعہ ان مقاصد عالیہ کے حصول کے لئے کس قدر تعلیم المرتبت نفسیاتی کیفیتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ مہینہ بھر سے خدا کے بندوں میں جسمانی اور قلبی انقلاب پیدا کیا جا رہا تھا۔ انہیں ٹھیٹھ سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنایا جا رہا تھا۔ ان کے دلوں کو تمام خباثتوں سے پاک و ران کی نگاہوں کو تمام آلودگیوں سے صاف کیا جا رہا تھا۔ اُن سے ایک وقتِ مقررہ کے لئے حلال و طیب چیزیں بھی چھڑائی گئی تھیں کہ اُن کا ذہن کبھی حرام و خبیث چیزوں کی طرف توجہ بھی نہ کرے! اس کے بعد انہیں ایک جگہ جمع کیا گیا کہ وہ جائزہ لیں اپنے تمام اعمال کا اور محاسبہ کریں اس انقلاب کا جو اُن کے اندر پیدا ہوا ہے۔ اپنی انفرادی خودی جس کا یوں استحکام کرایا گیا ہے، اُسے آکر ایک اجتماعی کُل میں جذب کر دیں۔ اور یوں اطاعتِ امیر۔ مرکزیت، ایثار۔ تمسک بالجماعت۔ اتحادِ عمل۔ ائتلافِ خیالات کے جیتے جاگتے مظاہرے سے تجدیدِ عہدِ وفا کریں۔ اور اُٹھتے اور جھکتے بار بار اپنے اللہ کے سامنے اس دعوے کی عملی شہادت پیش کریں کہ:-

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ - لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (۶/۱۶۳)

میری نماز اور میری قربانیاں۔ میرا جینا۔ میرا مرنا سب اللہ رب العالمین (یعنی اللہ کی ربّ العالمینی کو عام کرنے) کے لئے ہے۔

سلیم! تم سمجھتے ہو کہ ایسے انقلاب در آغوش افراد کی یہ جماعت دنیا میں کیا کچھ نہ کر سکتی ہو گی! لیکن اس کے بعد ذرا ایک مرتبہ اس "ہجومِ مومنین" کی نماز پر پھر نگاہ ڈالو۔ ساری نماز پر نہیں۔ نماز کے صرف ایک ٹکڑے پر ذرا اندازہ لگاؤ کہ پچاس ساٹھ ہزار انسانوں کا گروہ۔ اللہ کے سامنے، رو بہ قبلہ، مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اقرار کر رہا ہو کہ:

اِیَّاکَ نَعْبُدُ

اے اللہ! ہم صرف تیری محکومیت کو جائز سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی غلامی کا طوق ہم پر حرام ہے۔ لیکن زبان سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہو اور دماغ سینکڑوں خداؤں کا بتکدہ بن رہا ہو۔ تو اس دعوے کو تم خدا فریبی اور خود فریبی نہ کہو گے تو اور کیا سمجھو گے؟ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ ان لوگوں نے نماز نہیں پڑھی بلکہ اپنے آپ سے غداری اور خدا سے دھوکہ کیا ہے تو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک کے "حاملانِ دینِ متین" لٹھ لیکر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس میں ان بچاروں کا بھی کچھ قصور نہیں۔ اس لئے کہ انہیں بتایا ہی یہ گیا ہے کہ اگر ہاتھ فلاں مقام پر باندھ لئے جائیں۔ پاؤں میں اتنا فاصلہ رکھ لیا جائے۔ اُنگلیوں کا رُخ فلاں سمت کو ہو۔ سجدے میں فلاں فلاں حصے پہلے زمین بوس ہوں۔ الفاظ اپنے صحیح مخرج سے نکلیں، تو نماز ہو جاتی ہے۔ اور جب پوچھو کہ اس بات کی کیا سند کہ اس سے نماز واقعی ہو جاتی ہے۔ اور اس سے وہ مقصد پورا ہو گیا ہے جس کے لئے صلوٰۃ کو فرض قرار دیا گیا تھا۔ تو جواب مل جاتا ہے کہ اس کا علم تو قیامت ہی کو ہو سکے گا کیونکہ دنیا دار العمل ہے۔ نتیجہ یہاں برآمد نہیں ہو سکتا۔ اور جب اُن سے کہو کہ بھائی اللہ تو ایمان و عمل کی جزا استخلاف فی الارض اور وراثتِ زمین فرماتا ہے، تو کہہ دیتے ہیں کہ اس ارض سے مُراد جنّت کی زمین ہے۔ لیکن سلیم! ان باتوں کو تم کسی سے نہ پوچھو۔ قرآن تمہارے سامنے ہے۔ انسانیت کے معراجِ کبریٰ کے دورِ ہمایوں کی تاریخ اس کے اندر ہے۔ ان چیزوں کو دیکھو اور پھر

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

تمہیں معلوم ہے کہ سنہ ۲ھ میں روزے فرض ہوئے۔ اور اسی رمضان کی سترہ تاریخ کو ان روزہ دار نمازیوں کی قوتوں کا امتحان بھی لے لیا گیا۔ یورپین مورخ کہتے ہیں کہ ٹورز کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ کا نقشہ بدل دیا۔ لیکن اُن کی تنگ نگاہیں ذرا اور آگے بڑھتیں تو دیکھتیں کہ سنہ ۲ھ کے رمضان میں بدر کے میدان

میں جو لڑائی ہوئی اُس نے دنیا کی ہسٹری کو بدل دیا۔ باطل و ظلمت کی تمام تخریبی قوتیں اپنے ساز و سامان سے آراستہ اِس ارادے سے میدان میں نکل آئیں کہ (معاذ اللہ) اللہ کے نور کو دنیا سے مٹا دیا جائے۔ مسلمانوں کی کُل کائنات۔ قریب تین نفوس، جو ابھی ابھی اپنے گھر بار چھوڑ کر دوسروں کے ہاں پناہ گزیں ہوئے تھے؛ بے سرو سامان، بظاہر بے کس و بے بس۔ اُن کے لئے اب زندگی اور موت کا سوال تھا نہیں! حق یا باطل کے غلبہ کا سوال تھا۔ ان روزہ داروں نے کیا کیا؟ اپنے بچوں تک کو لے کر، کھجوروں کی ٹہنیوں اور اونٹوں کی پسلیوں سے مسلح۔ میدان جہاد میں آ گئے۔ سلیم! ذرا اس موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاؤ اور اس کا احساس اس سے کرو کہ خود نبی اکرمؐ نے اس لق و دق صحرا میں نہایت خشوع و خضوع سے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ اے اللہ! تیرے بندوں کی یہ مٹھی بھر جماعت۔ محض تیرے نام کی بلندی اور تیرے قانون کی حفاظت کے لئے سربکف اس میدان میں جمع ہو گئی ہے۔ اگر آج یہ سب شہید ہو گئے تو دنیا میں تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ مانگنے والے نے ابھی اپنی دعا ختم بھی نہ کی تھی کہ دینے والے نے اُسے اپنی رحمتوں سے یوں نوازا کہ:

اَنِّیْ مُمِدُّکُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ مُرْدِفِیْنَ (۸/۹)

میں تمہاری مدد کے لئے ہزار فرشتے لگاتار بھیجوں گا۔

فرشتے تمہاری مدد کے لئے آئیں گے اور وہ آ کر کیا کریں گے؟ اُن سے کہا جائے گا کہ

فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ (۸/۱۲)

مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھو۔ میں کفار کے دلوں میں تمہاری دہشت طاری کر دوں گا۔

فی الحقیقت، وہ ملائکہ جنہوں نے خلیفۃ فی الارض کو جھک کر سلام کیا تھا۔ انہیں یوں ہی مدد کرنی چاہیئے تھی۔ جب انسان قانونِ خداوندی کو عملاً نافذ کرنے کے لئے باہر نکل آئے تو آفاقی قوتیں سب اس کا ساتھ دیتی ہیں لیکن سلیم! اللہ نے یہی نہیں کہہ دیا کہ تم مزے سے بیٹھے رہو۔ سب کچھ ہمارے فرشتے ہی کر دیں گے۔ بلکہ اس وقت ایک مکمل ضابطہ سامنے رکھ دیا کہ تمہیں کیا کرنا ہے، ذرا غور سے سنو کہ وہ ضابطہ کیا تھا۔ وہ ہدایات کس قسم کی تھیں

فرمایا:۔

> اے ایمان والو! جب تم میدانِ جنگ میں کفار کے سامنے جاؤ تو اُن کو پیٹھ مت دکھاؤ۔ یاد رکھو۔ جو آج کے دن پیٹھ دکھائے گا۔ اِلّا اس بات کے وہ پینترا بدلتا ہو، یا اپنی فوج میں آنے کے لئے ایسا کرتا ہو۔ اس پر اللہ کا غضب ہوگا۔ اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ (۸/۱۶)

سلیم! سنتے ہو کہ مخاطب کون ہے؟ مسلمان ہیں اور غور کرتے ہو کہ اپنی قوم کا ساتھ چھوڑ دینا۔ دشمن کے مقابلہ میں پیٹھ دکھا دینا۔ کس قدر جُرم عظیم ہے؟

پھر فرمایا:۔

> اے ایمان والو! اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور اس سے مت پھرو۔ درانحالیکہ تم سن رہے ہو۔ اور ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے کہہ دیا کہ ہم نے سُن لیا۔ حالانکہ وہ صحیح معنوں میں اُسنتے تھے۔ اے مسلمانو! اللہ اور اُس کے رسول کی آواز پر لبیک کہو۔ جس وقت نہیں وہ اس چیز کی طرف بلائے جو زندگی بخشنے والی ہے۔ (۸/۲۴ ذ ۲۱ — ۲۰)

سمجھتے ہو کہ خدا کی راہ میں "مرجانے" کا نام زندگی کیوں رکھا جاتا ہے؟ اس عظیم الشان حقیقت پر غور کرو۔ موت اور حیات کے سربستہ راز تم پر منکشف ہو جائیں گے۔ اور پھر اس اطاعت پر بھی غور کیا جس میں سننا شرط ہے۔ یہ بالمشافہ اطاعت زندہ مرکز کی اطاعت نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر فرمایا:۔

> اے مسلمانو! جب تم کسی جماعت کے مقابلہ میں جاؤ تو ثابت قدم رہو۔ اور قانون خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھو۔ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اور اللہ کی اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اور آپس میں مت جھگڑو۔ ورنہ تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ ثابت قدم رہو۔ اللہ ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ (۸/۴۷-۴۵)

سلیم! سنتے ہو کہ یہ ہدایات کیا ہیں! یہ زندگی کا پیغام ہیں۔ یہ اسلام کی روح ہیں۔ یہ ایک عبد مومن کے اظہارِ عبودیت کا حقیقی مفہوم ہیں۔ یہ صرف سنہ ۲ھ کے بدر کے موقع کے وقتی احکام نہیں، بلکہ قیامت تک۔ جب تک حق و باطل میں آویزش کا امکان ہے۔ جب تک خیر و شر کا مقابلہ ہے۔ جب تک شرارِ بولہبی چراغِ مصطفویؐ سے ستیزہ کار ہے۔ اس وقت تک کے لئے تمام مسلمانانِ عالم کے واسطے ایک دستور اساسی ہیں۔ ایک لائحہ عمل ہیں۔ یہی ہدایات ہیں جن کے لئے رمضان کے روزے اور آن روزوں کا جمعۃ الوداع ہے۔

سلیم! اب تم خود فیصلہ کرو کہ صحیح نتائج پیدا کرنے والے ان تین سو مسلمانوں کے روزے اور نمازیں تھیں یا اس ساڑھے ستر ہزار کا رسمی اجتماع کہ جس میں مقصد اور روح کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ سو بھائی نادان کیوں بنتے ہو؟ کیا تم اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ سحری اور افطاری[1] کے گولے قلعہ کی دیواریں نہیں ڈھا سکتے۔ ہر چند اُن کا دھماکا اور دھواں اصلی گولوں کا سا ہوتا ہے۔

* * *

عید کے متعلق میں نے تمہیں پچھلے سال بتایا تھا کہ یہ نزولِ قرآن کریم کی یاد میں اسلامی جشن ہے۔ تم دُنیا بھر کی قوموں کے جشن و مسرت کے تیوہاروں کو دیکھو۔ اُن میں یا تو کسی انسان کی یادگار کا جذبہ پنہاں ہوگا۔ یا مظاہرِ فطرت کی نیرنگیوں کی تقریب۔ یا نئے موسم کا استقبال۔ لیکن تم سمجھتے ہو کہ انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں۔ دنیاوی واقعات بھلائے جا سکتے ہیں۔ تاریخ کے صفحات گم ہو سکتے ہیں۔ بڑی بڑی چٹانوں پر گاڑی ہوئی لاٹھیں اور ان لاٹھوں پر کندہ کی ہوئی داستانیں، زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن خدا کا وہ ازلی و ابدی پیغام جو قرآن کی دفتین میں محفوظ کر دیا گیا ہے، کبھی مٹ نہیں سکتا کہ اُس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اُس نے لے لی ہے جو زندہ ہے۔ کبھی مر نہیں سکتا۔ جو قائم ہے کبھی فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ باقی ہے۔ اس کا پیام بھی باقی ہے وہ زندہ ہے اس کا کلام بھی زندہ ہے یہ جشنِ عید اُسی خدائے حی و قیوم کے زندہ قرآن کے نزول کی

---

[1] دلی میں جامع مسجد، قلعہ کے سامنے ہے۔ وہاں سے سحر و افطار کے گولے چھوٹا کرتے تھے (شاید اب بھی چھوٹتے ہوں)

یادگار میں ہے۔ اور جب تک دنیا رہے گی، یہ یادگار بھی باقی رہے گی۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ۔ واللہ اکبر اللہ اکبر۔ وللہ الحمد۔

پھر جس طرح یہ کتاب دنیا کی کتابوں میں عجیب تر ہے۔ اس کی یاد بھی دنیا کی تمام یادگاروں سے نرالی ہے۔ دنیا کے جشن۔ کہیں تماشے، رنگ راگ۔ عیش و نشاط سے منائے جاتے ہیں۔ لیکن شعائر الٰہی کی یادگاروں کے جشن منانے کے لئے ایک بالکل الگ پروگرام تجویز کیا گیا ہے۔ اس کے لئے لوگ مہینہ بھر سے تیار کئے جا رہے تھے۔ انہیں سکھایا جا رہا تھا کہ دنیا کی تمام جھوٹی طاقتوں سے منہ موڑ کر اس ایک خدا کے قانون کے محکوم بن جاؤ۔ مانگو تو اسی سے مانگو۔ جھکو تو اسی کے سامنے جھکو۔ بھوکے اور پیاسے رہ کر اپنے فرائض سرانجام دو۔ یہ ایک ٹریننگ تھی جو سپاہی کو میدان میں لانے سے پیشتر دی جاتی ہے۔ پورے ایک مہینے کی ریاضت و محنت سے قلوب میں ایک بلند شعور پیدا ہو گیا تو انہیں ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا کہ نیک دل اور پاکیزہ دماغ لے کر سر جوڑ کر بیٹھیں، اور سوچیں کہ ہمیں اس امتیازی زندگی کے حصول و استبقاء کے لئے کیا کچھ کرنا ہے، جو مومنین کی خصوصیت ہے اور جس کا وعدہ قرآن کریم میں موجود ہے۔

سلیم! اسلام رہبانیت کا مذہب نہیں۔ دنیا تیاگ دینا، زیب و زینت سے نفرت کرنا۔ ہنسی خوشی سے بیزار ہو کر عبوسا قمطریرا بن جانا۔ اسلام نہیں سکھاتا۔ عمدہ عمدہ کپڑے پہننے سے، اچھے اچھے کھانے پکانے سے۔ دوستوں کو تحائف دینے سے۔ بچوں کے لئے خوشی اور مسرت کے سامان بہم پہنچانے سے اس نے نہیں روکا۔ لیکن اسلام جس طرح دنیا کی ہر مصیبت کے وقت قانون خداوندی کی ہدایت کو سامنے لے آتا ہے اسی طرح وہ ہر آسایش اور مسرت کی تقریب پر بھی محتاج و مفلس بندوں کو نہیں بھلاتا۔ لیکن یاد رکھو سلیم! محتاجوں اور مفلسوں کا وجود محض اس عبوری دور تک ہوتا ہے جب ہنوز قرآن کا نظام ربوبیت قائم نہیں ہوتا۔ اس نظام کے قیام کے بعد کوئی مفلس اور محتاج باقی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا مفلسوں اور محتاجوں کے متعلق اس قسم کے احکام

صرف عبوری دور سے متعلق ہیں۔

سلیم! تمہیں کیا معلوم کہ قوم کی حالت کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے مت لگاؤ کہ تمہارے سامنے نئے نئے کپڑے پہننے والے مسلمانوں کا اجتماع ہے! قوم کی حالت کا اندازہ لگانا ہے تو وہاں جاؤ جہاں سے یہ نئے نئے کپڑے پہننے والے مسلمان باہر آئے ہیں۔ اور دیکھو کہ کتنے گھر ہیں جن میں مٹکے اور کٹھلیاں اوندھی پڑی ہیں کہ کئی دنوں سے ان میں آٹا نہیں پڑا۔ دیکھو کہ کتنے چولھے ہیں جن میں مکڑی نے جالا تن رکھا ہے کہ کئی وقت سے ان میں آگ نہیں جلی۔ دیکھو کہ کتنی شریف عورتیں ضرورت کے لئے گھروں سے باہر نہیں آسکتیں کہ اُن کے سر پر چادر نہیں ہے۔ دیکھو کہ کتنے بچّے اور بوڑھے رات بھر الاؤ کے گرد بیٹھے رہتے ہیں کہ اِس سردی میں اُن کے پاس اوڑھنے کو لحاف نہیں۔ دیکھو کہ کتنے جوان مریض موت کے منہ میں کھنچے چلے جا رہے ہیں کہ اُن کی دوائی کے لئے گھر میں پیسہ نہیں۔ سردی۔ بھوک۔ محتاجی اور بربادی کے ان ہولناک مناظر کو دیکھو اور پھر اندازہ لگاؤ کہ قوم کی کیا حالت ہے؟ اور اگر تمہارے سینے میں دل اور دل میں احساس کی کوئی رمق باقی ہے، تو سوچو کہ آج یہ تمہارا جشن، مسرت کا جشن ہے یا بربادی کا ماتم! سلیم! میں جانتا ہوں کہ خوشی کے موقع پر مصیبتوں اور تکلیفوں کی یاد بدشگونی خیال کی جاتی ہے۔ لیکن آج جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں خوشی کو خوشی سمجھنا خود اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ قوم کی حالت یہ ہے۔ لیکن سلیم! جانتے ہو کہ قوم کے راہ نما۔ شریعت مقدسہ کے علمبردار کون سے اہم مسائل کے حل دریافت کرنے میں مصروف جہاد ہیں؟ اگر تم یہ جاننا چاہو تو دہلی سے شائع ہونیوالے اخبار "محمدی" اور امرتسر سے شائع ہونے والے اخبار "اہلحدیث" کے اکتوبر۔ نومبر کے پرچے اٹھا کر دیکھو، ان میں اس مسئلہ جلیلہ پر گرما گرم بحث چل رہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کے ختنے کی دعوت قبول کرنا جائز ہے، یا نہیں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اور یہ دونوں اخبار اس جماعت کے ترجمان ہیں جس کے اسلاف میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید علیہما الرحمۃ کے درخشندہ اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ترکوں نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہے اور ان کی فوجیں شہر کی چاردیواری تک آپہنچی ہیں تو شہر کے اندر پادریوں کی سب سے بڑی مجلس

چالیس دن سے اس مسئلہ پر بحث کر رہی تھی کہ حضرت عیسیٰ پر جو مائدہ نازل ہوا تھا اس میں روٹی خمیری تھی یا فطیری۔ مسلمان ان واقعات کو پڑھتے ہیں اور تحقیر کی ہنسی ہنس دیتے ہیں۔ لیکن نہیں سوچتے کہ خود اُن کے اپنے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

سلیم! اب تمہاری آخری بات کا جواب رہ گیا کہ جب ہمارے ان اجتماعات میں آج نہ روح اور مقصد نہیں رہا تو پھر ان کے باقی رکھنے سے فائدہ کیا؟ تمہارے دل میں اس سوال کا پیدا ہونا ضروری تھا، اچھا ہوا کہ تم نے اسے بھی پوچھ لیا۔ عزیزم! سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ چیزیں (اپنی روح اور مقصد کو کھو دینے کے بعد) ہمارے قومی شعائر سی بن چکی ہیں۔ اگر قومی شعائر نقصان رساں نہ ہوں (اور نہ ہی وہ قرآن کی تعلیم سے ٹکرائیں) تو ان کا باقی رکھنا اچھا ہوتا ہے۔ ان سے بھی ایک حد تک اجتماعیت کی شکل قائم رہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ہماری قسمت نے کبھی پلٹا کھایا اور ہم میں اس انقلاب کا احساس پیدا ہوا جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے، تو ان ہی بے جان پیکروں میں پھر سے روح آجائے گی اور یہ مناسک و شعائر جس نظام کی یادگار ہیں، اسکے از سر نو قیام میں آسانی پیدا ہو جائیگی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تمہیں جمعۃ الوداع کے خطبہ میں باتیں کرنے سے منع کیا تھا، اگرچہ خطیب کا ایک لفظ بھی تمہارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا اور اگر پہنچتا بھی تو اس سے تمہیں کچھ فائدہ نہ تھا کہ وہ عربی میں تھا اور تم عربی جانتے نہ تھے۔ اور اگر جانتے بھی ہوتے تو بھی اس میں تمہیں کوئی بات مسائل حاضرہ کے متعلق نہ مل سکتی، کہ ان کے نزدیک خطبہ ایک حکم شرعی ہے جس کی ادائیگی سے محض "ثواب" ہوتا ہے۔ مفہوم اور معانی سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ باقی رہا یہ کہ اتنے بڑے مجمع میں لاؤڈ اسپیکر کیوں نہیں لگایا گیا تھا۔ سو اس کا جواب مجھ سے نہیں، ان مولوی صاحبان سے پوچھو جو اپنی ذاتی آواز کو دور تک پہنچانے کے لئے ٹیلیفون کا استعمال تو بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن بہ حیثیت خطیب و امام اپنی آواز کو دور تک پہنچانے کے لئے آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ سپیکر) کا استعمال حرام قرار دیتے ہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ہمارے ان "مفتیانِ کرام" کے پاس ذرائع کیا ہیں۔ مکبر الصوت

(Loud-speaker) کی حِلّت وحُرمت کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ معلوم کیا جاتا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے اور جو آواز سامعین تک پہنچتی ہے، وہ واقعی متکلم کی آواز ہوتی ہے یا کوئی اور۔ اب سنئے کہ یہ تحقیق کن ذرائع سے ہوئی ہے۔ ہمارے دینی مرکز یعنی دارالعلوم دیوبند کے ایک مفتی صاحب نے ان فتاویٰ کا ایک مجموعہ شائع فرمایا ہے جن میں "عبادات مقصودہ" کے لئے اس آلہ کی حرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس رسالہ (البدائع المفیدہ فی حکم الصنائع الجدیدہ) کے صفحہ ۲۰ پر درج ہے کہ الگزنڈرہائی اسکول۔ بھوپال کے سائنس ماسٹر جناب برج نندن لال صاحب سے دریافت کیا گیا وہ فرماتے ہیں کہ برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم ازکم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز ہے اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے"۔ یہ ہیں وہ ذرائع تحقیق مفتیانِ کرام کے جن کی بنار پر حلّت وحرمت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ اور یہ حضرات ان اسلاف کے جانشین ہونے کے مدعی ہیں۔ جن کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (زمین وآسمان میں جو کچھ ہے سب تمہارے لئے مسخر کر دیا گیا ہے)، اب سلیم! تم خود سمجھ جاؤ گے کہ قرآن ہمیں کہاں لے جانا چاہتا تھا اور ہم کہاں ہیں؟

والسلام
دسمبر ۱۹۳۹ء

سلیم کے نام تیسرا خط

ان جوڑ شادیاں

ہاں سلیم! موءٗدہ کے معنے تم نے درست سمجھے ہیں۔ جاہلیت عرب میں یہ رواج تھا کہ لوگ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ قرآن کریم ہر قسم کی سبعیت و بربریت اور ہر نہج کا جور و استبداد مٹانے کیلئے آیا تھا۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا تھا وہ اس قسم کے وحشیانہ رواج کو باقی رہنے دیتا۔ چنانچہ اس نے اسے مٹا دیا اور چند ہی سال میں یہ بہیمانہ رسم، کہ جس کے تصور سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہے۔ صحیفۂ کائنات سے حرفِ غلط کی طرح نابود ہوگئی۔ قرآن کریم نے اپنے مخصوص دل کش اسلوب اور معجزانہ انداز سے اس کا ذکر فرمایا ہے کہ جب وہ معصوم بچی اپنے قاتل باپ کا دامن پکڑے بحضورِ داور استغاثہ پیش کرے گی تو مجرم سے کہا جائے گا (بایّ ذنب قتلت) بالآخر کس جرم کی پاداش میں اس بے کس و بے بس ننھی سی جان پر یہ ظلم ڈھایا گیا تھا۔ اس کا کیا جواب بن پڑے گا؟ ظاہر ہے!

مسلمان خوش ہیں کہ اللہ کی رحمتِ عامہ نے اس لرزہ انگیز و وحشت خیز رسم کا سدِ باب کیا اور بات ہے بھی فخر و مسرّت کی۔ لیکن سلیم! ذرا نگاہِ تعمق سے دیکھو گے تو تمہیں نظر آئے گا کہ وحشت و درندگی کی یہ انسانیت سوز رسم آج بھی دنیا میں موجود ہے۔ تم شاید حیران ہوگے کہ آج اس دورِ تہذیب و تمدن، اس عہدِ علم و دانش میں وہ کونسی سرزمینِ بے آئین ایسی ہوگی جہاں اپنے ہاتھوں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کی رسم جاری ہے۔ لیکن تمہاری

حیرت بیکرانہ ہو جائے گی۔ جب تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ یہ جگرپاش رسم آج خود ہمارے ملک میں، ہماری قوم میں، اور ہمارے گھروں میں رائج ہے۔ لیکن ہم ہیں کہ اپنی آنکھوں سے اس قسم کے خونِ ناحق کو دیکھتے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے۔ ہم قرآن کے ان مقامات سے یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ عرب کے ایام جاہلیت کی ایک بھیانک رسم کا تذکرہ ہے۔ ہم اس سے متعلق نہیں۔ سلیم تم جانتے ہو کہ قرآن کریم نے ہر قتل ناحق کو سنگین ترین جرم قرار دیا ہے۔ لیکن اس قسم کے قتل (یعنی لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے) کو سب سے زیادہ وحشتناک اس لئے قرار دیا ہے کہ اس میں ایک کمزور و ناتوان بچی کی کس مپرسی، بے زبانی اور قوتِ مدافعت سے محرومی کا ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اب ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے خون ہر روز تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ قاتل اپنی خون آلود آستینوں کو سینہ تان کر لئے پھرتا ہے اور تمہارے آئین و ضوابط کا کوئی ہاتھ اس کی کلائی تک نہیں پہونچتا۔

سلیم! میں اس طلسمِ پیچ و تاب کا خوب اندازہ کر رہا ہوں جس میں ان سطور کے مطالعہ سے تمہارا دل اُلجھ رہا ہے اور تمہاری وہ نگہِ تجسس بھی میرے سامنے ہے جو اس قسم کے خونِ ناحق کے دھبوں کی تلاش میں ہر طرف پریشان پھر کر ناکام و نامراد اپنے نشیمن میں واپس آ رہی ہے۔ لیکن میں حیران ہوں کہ تمہاری نگاہ اتنے لمبے دور دراز گوشوں تک تو پہنچ رہی ہے لیکن اس چھوٹی سی بچی زبیدہ کی طرف نہیں اُٹھتی جو اپنی ماں کی آغوشِ محبت سے محروم ہو کر اپنی نانی کے دامنِ عاطفت میں پرورش پا رہی ہے۔ تم نے غالباً اس بیچاری کی مرحومہ ماں کو نہیں دیکھا۔ نہ ہی شاید یہ سنا ہو گا کہ اس کی موت کیسے واقع ہوئی۔ حتیٰ کہ تمہیں شاید یہ بھی معلوم نہ ہو گا کہ یہ بچی اس رشید کی بیٹی ہے جو اگلے دنوں قماربازی کے اڈے سے گرفتار ہو کر حوالۂ قید و بند کیا گیا ہے۔ رشید کی یہ آوارگی کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بچپن ہی سے ایسا تھا۔ ابھی خوردسال تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ جس قوم کی اجتماعی زندگی برباد ہو چکی ہو، اس کے یتیم بچوں سے اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ یا تو بھوکوں مر جاتے ہیں اور اگر گھر میں پرورش کا سامان میسر ہو تو چونکہ کسی کا دستِ تادیب و تہدید سر پر نہیں ہوتا، اس لئے بالعموم آوارہ اور اوباش ہو جاتے ہیں یتیمی کی

حالت میں زندگی بسر کر کے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کرنا فی الواقعہ ایک ازلی سعادت ہے) رشید بچپن میں ماں کا لاڈلا رہا۔ بڑا ہوا تو بُری صحبت میں پڑ گیا۔ اس کی آوارہ مزاجی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ کبھی کبھار بڑے بوڑھے سمجھاتے بجھاتے بھی تھے۔ لیکن باپ کا سا درد کسے کہ بچے سے گالیاں کھا رہا ہے لیکن اس کی خیر اندیشی کی فکر نہیں چھوڑتا۔ ماں ہزار کڑھتی، لیکن اس کی سنتا کون؟

رشید آوارہ تھا۔ ناکارہ تھا، کوئی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن نہ معلوم صابرہ کی ماں کے سر میں کیا سودا سمایا تھا کہ وہ صابرہ کی زندگی رشید کے سپرد کر دینے پر تلی بیٹھی تھی۔ اس کے گھر والے مخالف۔ عزیز رشتہ دار مخالف۔ ہمسائے اور اہل محلہ مخالف غرضیکہ جو بھی سنتا مخالفت کرتا۔ لیکن اس نے کچھ ایسا کانوں میں تیل ڈال رکھا تھا کہ کسی کی سنتی ہی نہ تھی۔ اور تو اور خود رشید اس رشتہ کا مخالف تھا۔ لیکن اگر راضی تھی تو صابرہ ئی ماں یا رشید کی۔ صابرہ کی ماں سے جب بھی کوئی پوچھتا تو صاف کہہ دیتی کہ میں نے تو صابرہ اس وقت سے اپنی بہن کو دے رکھی ہے جب یہ ابھی دودھ پیتی تھی۔ اس لئے اب یا تو اس کی ڈولی بہن کے گھر بھیجوں گی۔ یا اس دہلیز سے اس کا جنازہ نکلے گا۔

صابرہ ایک متین، سنجیدہ، خاموش، سمجھدار لڑکی تھی۔ اور انتہائی بدبختی کہ پہلو میں ایک حساس دل رکھتی تھی۔ یوں تو ہماری موجودہ معاشرتی پابندیوں کے خیال سے بھی کسی لڑکی کا اپنے رشتہ کے متعلق ایک لفظ تک اپنی زبان پر لانا اتنا بڑا گناہ ہے جس کا کفارہ ہی نہیں۔ اس پر صابرہ کی خاموشی پسند طبیعت بایں ہمہ ہمجولیوں سہیلیوں کی باتوں میں کبھی کبھی کنایتہً ظاہر ہو جاتا تھا کہ زندگی کا بھیانک مستقبل اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور اس کی ماں کی ضد اس کے نزدیک کھلا ہوا پیام موت۔ اس کی امیدوں کا آخری سہارا یہ خیال تھا کہ رشید چونکہ خود بھی اس رشتے کے مخالف ہے اس لئے شاید وہ اس جہنم سے بچ جائے۔ لیکن ادھر رشید کی ماں کی ضد کہ بیٹا! اگر اس معاملے میں میری مرضی کے خلاف چلے تو یاد رکھو زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ میں اپنی بہن کو قول دے چکی ہوں۔ اب اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ نتیجہ یہ کہ دن مقرر ہو گئے۔ بارات آ گئی۔ تمام رسومات ادا ہو گئیں۔ آخر میں رخصتی

سے ذرا پہلے ایک اور رسم کا بھی خیال آگیا۔ نکاح خواں کو معلوم۔ گواہوں کو معلوم۔ خود دولہا دُلہن کو معلوم کہ کس طرح ان دونوں کی مرضی کے خلاف یہ جوڑ جوڑا گیا ہے۔ لیکن دولہا کو ماں کی ناراضگی کا خیال۔ دُلہن کو معاشرتی بدنامی کا ڈر۔ گواہوں کو اپنی "چودھریت" کا پاس۔ مولوی صاحب کو سوا روپیہ کا لالچ۔ ان تمام "مقتضیات شرعیہ" کے یک جا جمع ہونے کے بعد "منشائے خداوندی" کی تکمیل اور "سنتِ پیغمبری" کی تقلید میں اور کس چیز کی کمی رہ سکتی تھی۔ "ایجاب و قبول" ہوا۔ خطبۂ مسنونہ پڑھا گیا۔ لمبی لمبی دعائیں مانگی گئیں۔ شادیانے بجے۔ مبارکبادیاں ملیں۔ دلہن گھر میں آئی۔ گھر کی رونق بڑھی۔ سلیم! ذرا غور کرو کہ وہ رشتۂ مناکحت جسے قرآن کریم نے عہدِ استوار (میثاق غلیظ) کہا ہے، جسے ایک محکم معاہدہ قرار دیا ہے، جس کے لئے بلوغت کی شرط عاید کی گئی ہے کہ فریقین برضا و رغبت پوری عقل و شعور کے ساتھ معاملہ کے ہر پہلو پر کامل غور و خوض کے بعد اپنے مستقبل کے متعلق کسی فیصلہ پر پہنچیں۔ اس عہد و معاہدہ کو اس طرح سے استوار کرنا اگر شریعتِ حقہ سے کھلا ہوا مذاق اور دینِ مبین سے بے باک تلعب نہیں تو اور کیا ہے! لیکن تمہارے ہاں تو نکاح سے اب مفہوم صرف اتنا رہ گیا ہے کہ رسماً و تبرکاً وہ چند الفاظ دُہرا دیئے جائیں جو نکاح خواں نے ایسی تقریب کے لئے زبانی یاد کر لئے ہیں۔ حالانکہ ان الفاظ کی روح بھی اگر سامنے ہو تو ازدواجی زندگی کی ہزاروں پوشیدہ جنتیں بے نقاب ہو جائیں۔ (اور ایک نکاح ہی پر کیا موقوف ہے۔ تمہارے ہاں تو تمام کا تمام دین ہی ایک رسم ہو کر رہ گیا ہے جس میں زندگی کی کوئی رمق تک باقی نہیں رہی۔)

میں لکھ رہا ہوں اور ساتھ ہی اس خفیف سی ہنسی کو بھی محسوس کر رہا ہوں جو تمہاری آنکھوں میں شوخی بن کر مچل رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ ابھی اگلے دنوں میں نکاح کے معاملہ میں دورِ حاضرہ کی آزادیوں کے خلاف لیکچر دے رہا تھا۔ اور آج اپنی قدیم معاشرت کی پابندیوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کر دیا۔ لیکن سلیم! پیشتر اس کے کہ تمہاری ہنسی قہقہہ بن جائے اُس بات کو یاد کرو جو میں نے اُس دن کہی تھی کہ اسلام کا صراطِ مستقیم اعتدال کی راہ ہے۔

نہ اس میں عہدِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عصرِ کہن کے فسانہ و افسوں

اگر دورِ حاضر کی مزعومہ آزادیاں، انسان کو پھر سے بہیمیت کی طرف لئے جا رہی ہیں تو تمہاری رسومِ قدیمہ کی پابندیاں بھی اسے اس حقیقی آزادی کی زندگی سے محروم کئے ہوئے ہیں جو اسلام کا منشا تھا۔ یاد رکھو! سکون و طمانیت کی جنت کا راز صرف قوانینِ الٰہیہ کی اس پابندی میں مضمر ہے جو ہزاروں مسرت افروز آزادیوں کی ضامن اور لاکھوں انسانیت سوز بندشوں کی ہادم ہے۔

ہاں! تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ صابرہ کس اسلوب سے اپنے سسرال میں آئی۔ دن گزرتے گئے۔ یوں تو کوئی خاص واقعہ رونما نہ ہوا لیکن ایک غائر نگاہ سے دیکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ صابرہ کے چہرہ سے شگفتگی و بشاشت آہستہ آہستہ ایک شاخِ خزاں دیدہ کے زرد پتے میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہرچند وہ اپنی سلیقہ شعاری فطری ایثار اور جذبۂ خدمت گزاری سے رشید کو اس کی بدعنوانیوں سے روکنے کی کوشش کرتی۔ لیکن اس کا مرض ان تیمارداریوں کی حدود سے آگے بڑھ چکا تھا۔ رشید کی طرف سے بے رُخی اور بے اعتنائی تو پہلے دن سے تھی۔ رفتہ رفتہ یہ کشیدگی نفرت اور نفرت دشمنی میں تبدیل ہو گئی۔ گھر میں ساس کا دم صابرہ کی تسلی کا باعث تھا۔ لیکن چونکہ مصیبتیں تنہا نہیں آیا کرتیں۔ ایک برس بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ وہ بھی چل بسی۔ اب جس قدر صابرہ بے بس تھی۔ رشید اسی قدر زیادہ آزاد۔ رفتہ رفتہ گھر کی آمد و رفت کم ہونے لگی۔ اکثر باہر رہتا۔ گھر میں اس کے لئے اگر کوئی وجہ کشش تھی تو وہ صابرہ کے چار زیور تھے۔ جب ضرورت پڑتی۔ آتا اور چھینا جھپٹی سے کچھ نہ کچھ کھسوٹ کر لے جاتا۔ صابرہ کا باپ سیدھا سادھا غریب آدمی تھا۔ اگرچہ صابرہ کے لئے وہاں روٹی موجود تھی لیکن صابرہ صحیح معنوں میں صابرہ تھی۔ فاقوں پر فاقے آتے لیکن کیا مجال کہ دوسرے دروازے تک خبر ہو جائے۔ گلی کے باہر میکا تھا۔ لیکن صابرہ نے کبھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ کہ اسے کوئی تکلیف ہے۔ چپکے چپکے کچھ مزدوری کرتی۔ لیکن ایسی مزدوری بھی کون سی ہو سکتی تھی، جس سے ایک مظلومہ لڑکی مستقل طور پر اپنا گزارہ کر سکتی۔ دن رات ایک کر دیتی تو بمشکل

ایک وقت کی روٹی میسر آتی۔ اللہ رکھے سارا محلہ اپنا تھا۔ سب قریبی رشتہ دار تھے۔ اس کے سامنے دوسرے گھروں میں ہزاروں نعمتیں آتیں لیکن وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی کئی دفعہ ایسا ہوا کہ دو تین وقت کے فاقے کے بعد روٹی کا انتظام ہوا کہ رشید کہیں سے دناتا ہوا آگیا۔ صابرہ نے خاموشی سے روٹی اس کے سامنے رکھ دی۔ اس نے روٹی کھائی۔ گالی گلوچ سے اس کا صلہ دیا (کیا عجب کہ مار پیٹ تک بھی اتر آتا ہو) اور جو چیز گھر میں نظر آئی لے کر چلتا بنا۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے۔ سارا محلہ رشتہ داروں کا تھا۔ لیکن سلیم! انفرادی زندگی کی سب سے بڑی لعنت تو یہی ہے کہ مصیبت تنہا اسی کی مصیبت سمجھی جاتی ہے جس کے سر پر آ پڑے۔ صابرہ کا باپ، جیسا کہ تم نے دیکھا ہی ہے۔ ایک سیدھا سادھا غریب آدمی ہے۔ اس کے پاس شرافت کا آخری حربہ یہی تھا کہ وہ رشید کی منت سماجت کرتا۔ مقدور بھر اس کی خدمت کرتا۔ لیکن ایثار و قربانی کا اثر تو وہیں ہوتا ہے جہاں سرشت بد نہ ہو۔ رشید ان بیچاروں سے یہ سب کچھ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا۔ اور اُلٹا اُن کے سر پر احسان دھرتا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن صابرہ کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا۔ آتشِ خاموش نے اندر ہی اندر اس کی ہڈیوں تک کو خاکستر کر دیا لیکن کیا مجال جو اس نے اس کا دھواں اُبھرنے دیا ہو۔ رات کی تنہائیوں میں رو لیتی۔ لیکن کسی کے سامنے آنکھوں کو نمناک بھی نہ ہونے دیتی۔ اس کی اس حالت کا علم اس وقت ہوا جب تنہائیوں کے اس مسلسل رونے نے آشوبِ چشم کی صورت اختیار کر لی۔ دو ماہ تک بیچاری کی آنکھیں دکھتی رہیں۔ آرام ہوا تو دیکھا کہ بینائی بے حد کمزور ہو چکی ہے۔ اب یہ اس مزدوری سے بھی معذور ہو گئی جس سے گذر اوقات ہو جاتی تھی۔ گھر میں جو کچھ تھا رفتہ رفتہ رشید کی آوارگی کی نذر ہو گیا۔ اب صابرہ کا رنگ چھپائے نہیں چھپ سکتا تھا۔ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی۔ سہیلیاں ہمجولیں اسے سمجھاتیں کہ غم نہیں کھانا چاہیئے۔ ایسے فکر سے کیا بنتا ہے۔ وہ اُن کی سنتی اور ایک ہلکے سے تبسم سے' جو آنکھوں ہی آنکھوں میں 'سمجھنے والے کو سب کچھ کہہ دیتا' سُن کر چپ ہو جاتی۔ صابرہ کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی، لیکن رشید کی بلا جانے کہ ایک قیمتی جان تلف ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں اس بیچاری کو کب سے تپ آ رہا تھا لیکن

اس نے کسی سے ذکر ہی نہ کیا۔ جب وہ دن رات لازم رہنے لگا تو معلوم ہوا کہ تپ کہنہ ہے۔ جاڑے کا موسم تھا سخت سردی کے دن۔ ایک شام کسی نے آکر ذکر کیا کہ تھانے والے رشید کو کسی آوارگی کے سلسلہ میں گرفتار کر کے لے گئے ہیں اور دس روپے کی عدم ادائیگی میں حوالات میں دے رکھا ہے۔ صابرہ کی زندگی کا سہارا ایک گرم چادر تھی جسے وہ اوڑھے بیٹھی تھی چپکے سے اٹھی اور چادر ایک پڑوسن کے پاس بھیج دی۔ چادر اگرچہ قیمتی تھی لیکن اسے بمشکل دس روپے مل سکے۔ روپے لے کر رشید کے چچا کو دیئے کہ جرمانہ ادا کر دیں۔ اب اس کے پاس سردی سے بچنے کے لئے کپڑا بھی نہ رہا۔ تپ مزمن ہو گیا۔ زندگی چراغ سحری نظر آنے لگی۔ اس کی ماں اب بمشکل اسے اپنے ہاں لے آئی۔ جو کچھ بن پڑا علاج معالجہ کیا۔ لیکن ؎

ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کرے

صابرہ کو اب پہلے سے بھی زیادہ چپ لگ گئی۔ گھر والوں کو دوا۔ دعا کے لئے دوڑ دھوپ کرتے دیکھتی تو کسی سہیلی سے کہہ دیتی کہ انہیں سمجھاؤ کہ ؎

قصۂ غم نہ بڑھاؤ مجھے مر جانے دو

رشید۔ صابرہ کی بیماری میں کبھی بھولے سے بھی ادھر نہ آیا۔ ایک دن نہ معلوم جی میں کیا آئی کہ چلا آیا اور صابرہ کے سرہانے آکر بیٹھ گیا۔ اس نے پلک اٹھائی۔ رشید کو دیکھا۔ وہی غیر محسوس سا تبسم اس کی آنکھوں میں دکھائی دیا جو ہر نئی مصیبت کے وقت اس (صابرہ) کے دل کی گہرائیوں کی غمازی کیا کرتا تھا اور جو درحقیقت ہماری معاشرت کے خانہ ساز آئین و ضوابط پر ایک بے پناہ تنقیدی نشتر تھا۔ قلب کا آبگینہ پگھل کر ایک شفاف آنسو کی شکل میں سرِ مژگاں چمکا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ ایک ہچکی آئی جس کے جھٹکے نے سازِ حیات کی آخری تاریں توڑ کر رکھ دیں۔ اور صابرہ! آہ۔ غم و حرمان کی داستانِ خموش صابرہ! ہمیشہ کے لئے چپ ہو گئی۔

* * *

سلیم! تم کہاں ہو! سوچو تو سہی کہ کیا یہ اس مؤدۂ سے کم انسانیت سوز اور دل گداز واقعات ہیں اور غور

کرلو کہ ایسی ایسی کتنی معصوم زندگیاں ہیں جو اس طرح گھل گھل کر تلف ہو رہی ہیں اور تمہاری سوسائٹی کو اس کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ سلیم! تم کہدو گے کہ اس قسم کے مظالم سے نجات حاصل کرنے کے لئے اصلاحی قدم اٹھ رہے ہیں۔ چنانچہ سال گزشتہ جس قانون خلع کا نفاذ ہوا ہے وہ اسی قسم کی مشکلات کا علاج ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی اصلاحی تجاویز نیک ارادوں کی حامل ہوتی ہیں۔ لیکن ہوتا اکثر و بیشتر یہی ہے کہ ایسی اصلاحات حقیقی ستم رسیدہ واقعات (Genuine cases) میں جائز فائدہ پہنچانے کے بجائے فریب کار لوگوں کے لئے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ ہمارے اصلاحی اقدام علت مرض کے بجائے علامات مرض کا علاج سوچتے ہیں۔ جس مریض کا تمام خون خراب ہو چکا ہو اس کے پھوڑے پھنسیوں پر مرہم لگانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ ایک پھنسی دب جائے گی تو دوسری جگہ دس اور نکل آئیں گی۔ حقیقی علاج تو اس کے خون کی صفائی ہے۔ آج ہماری معاشرتی زندگی کا پورے کا پورا ڈھانچہ بگڑ چکا ہے اس لئے اس کا اصلی علاج اس کی تشکیل جدید ہے۔ از سر نو تعمیر ہے۔ ایسی تعمیر جس کی بنیادیں قوانین کے الفاظ پر نہیں بلکہ قلوب کی گہرائیوں پر ہوں گی کہ جب تک قلوب و اذہان میں تبدیلی نہیں ہوتی، نظام زندگی کا کوئی شعبہ درست نہیں ہو سکتا۔ اور قلوب کی تبدیلی ماحول اور فضا کی تبدیلی پر منحصر ہے اور یہ تبدیلی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسانی دماغ کے تراشیدہ نظام زندگی کے بجائے قوانین الٰہیہ کا متعین فرمودہ نظام حیات دنیا میں رائج نہیں ہو جائے گا۔ سلیم سوچو! کہ یہ ایک گہری سوچ کی بات ہے۔ وَفِیۡہَا بَصَآئِرٌ لِلنَّاسِ۔

وَالسَّلَامُ
مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

سلیم کے نام چوتھا خط

ذات پات کی تمیز

سلیم! تم نے اس موضوع کو چھیڑ کر ع

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!!

تمہارے سامنے تو ایک چودھری فتح خاں کی لڑکی ہی کی داستانِ الم انگیز ہے اور میرے سامنے بیسیوں ایسے شریف گھرانے ہیں جن کی لڑکیاں پچیس پچیس۔ تیس تیس برس کی ہونے کو آئی ہیں اور ان کی شادی کا کہیں ذکر نہیں۔ اس لئے کہ اپنی "ذات برادری" کا لڑکا نہیں ملتا۔ فتح خاں کی بات تو تم نے تو سن لی تھی کہ لڑکا راجپوت ذات کا ٹھیک ہے لیکن اس کی گوت ہماری گوت سے نہیں ملتی۔ کبھی تم نے سوچا بھی کہ یہ کیا قیامت ہے! سلیم! اگر تم غور سے سمجھنے کی کوشش کرو تو قرآن کریم کی تعلیم کا ماحصل ان دو لفظوں میں سمجھ میں آجائے گا۔ "وحدتِ خالق اور وحدتِ مخلوق" یعنی توحید باری تعالیٰ اور انسانی مساوات۔ تمہیں معلوم ہے کہ دنیا کی طاغوتی قوتوں نے اسلام کی جو اس قدر مخالفت کی تھی تو وہ کس بناء پر تھی؟ اسی انسانی مساوات کے عقیدہ کی بناء پر۔ یہودی نبی اکرم پر ایمان لانے کو تیار تھے لیکن انہیں شکایت تھی تو یہی کہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونے چاہئیں، نہ کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد سے۔ کفارِ عرب سب سے بڑی وجہ مخاصمت یہی قرار دیتے تھے کہ اس نبی (صلعم) کی تعلیم سے ہمارے خاندانی امتیازات خاک میں مل جاتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ

اسے دیکھو! دہقانوں کو بلا بلا کر اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہے۔ غلام زادوں اور اونچے اونچے گھرانوں کے نجیب الطرفین شرفاء کو ایک ہی دستر خوان پر جمع کر لیتا ہے! ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ یہ نیا دین کس قسم کا ہے جو انسان اور انسان میں حسب و نسب کی رو سے کچھ تمیز ہی روا نہیں رکھتا۔ ابو جہل غلاف کعبہ کو پکڑ پکڑ کر واویلا کرتا تھا تو وہ بھی یہی تھا کہ اس لڑکے (صلعم) نے تو ہمارے گھرانے کی ناک کاٹ دی۔ ہائے ہائے کہیں کا نہ رہنے دیا۔ ہماری آبرو خاک میں ملا دی۔ ہماری آبائی شرافت کو ڈبو دیا۔ وہ فریاد کرتا تھا کہ

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب — از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست — با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
احمراں با اسوداں آمیختند — آبروئے دودمانے ریختند

اور سچ تو یہ ہے کہ اُن کے نقطۂ نظر سے بات تھی بھی ٹھیک۔ بچارے صدیوں سے شرف و مجد کے ان ہی امتیازات کو نسلاً بعد نسلٍ۔ باپ دادا سے بطور وراثت لئے چلے آ رہے تھے۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی تھی کہ خان شہباز خاں کا نور نظر اور جمّن نوربافت کا لڑکا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔

سلیم! ذرا تصور میں لاؤ اس انقلاب کو کہ تمام عرب کے ممتاز ترین قبیلہ (قریش) کے معزز ترین گھرانہ (بنو ہاشم) کی واجب الاحترام خاتون۔ خود نبی اکرمؐ کی پھوپی زاد بہن ــــ کون ہو گا جو خاندانی شرافت و امتیاز کے اعتبار سے اس سے بلند کہا جا سکے گا! اس خاتون محترم کی شادی اپنے گھر کے غلام سے کر دی۔ اگر ابو جہل غلاف کعبہ کو تھام کر لات و منات و ہبل و عزیٰ کو نہ پکارتا تو اور کیا کرتا؟ ایک کام کرنا پھر یہ بات ذرا واضح طور پہ سمجھ میں آ جائے گی۔ رحمت تمہارا ملازم ہے نا کس قدر شریف لڑکا ہے۔ اور ملازم بھی کاہے کو۔ باہر کی دنیا تو یہی سمجھتی ہے کہ وہ تایا ابا کی سرکار میں عہدہ دار ہے۔ ذرا کسی دن آپا سے کہنا کہ کلثوم کی شادی رحمت سے کیوں نہ کر دی جائے۔ پھر دیکھنا کہ گھر میں ابو جہل کے نوحے سے کم کہرام مچتا ہے؟ اور ابھی غلام اور ملازم میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس سے آگے بڑھو تو ذرا اس منظر کو سامنے لاؤ کہ اسلامی لشکر مدینہ سے باہر کوچ کے لئے تیار کھڑا ہے۔ اولوالعزم

صحابہؓ۔ بڑے بڑے سرداران قریش، ذی وقار و سن رسیدہ انصار، جیشِ اسلامی میں موجود ہیں۔ سب کچھ طے ہو چکا ہے۔ شوقِ شہادت میں مجاہدین کی ولولہ انگیزی کا یہ عالم کہ گویا

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

لیکن ابھی رسالتمآب صلعم سے علم قیادت کسی کو عطا نہیں ہوا۔ ہر "امیدوار" کی نگہ طلب فیصلہ کے انتظار میں مضطرب و بے قرار ہے کہ اتنے میں وہ شہنشاہ بوریہ نشین ج۔ مساوات انسانی کے علم کو سر بلند کئے جلوہ فرمائے عساکر ہوتے ہیں۔ ہر چشم منتظر کی آرزوئیں سمٹ کر نل میں آجاتی ہیں کہ حضورؐ مجاہدین کی صفوں کا معائنہ فرماتے ہوئے ایک غلام ابن غلام (حضرت اسامہ بن زیدؓ) کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں اور علم قیادت ان کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں۔ اندازہ فرمایئے کہ لشکرِ اسلامی میں کتنے کتنے بڑے سردارانِ قریش بطور سپاہی کام کر رہے ہیں اور ایک غلام کا بیٹا اُن پر سپہ سالار مقرر کر دیا جاتا ہے۔ تم نے جنگ بدر کا واقعہ تو پڑھا ہو گا جب اسلامی لشکر سے بعض انصار میدان میں بڑھے تو صفِ مقابل سے قریشِ مکہ یہ کہہ کر میدان میں آنے سے رک گئے تھے کہ ہم اپنے برابر کے قریش (مہاجرین) سے لڑیں گے۔ انصار ہماری برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ یعنی خاندانی اور قبائلی تفوق کا یہ احساس کہ دوستی تو ایک طرف اپنے سے فروتر قبیلہ والوں کی دشمنی بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔ کہاں عہد جاہلیت کا یہ تکبر و نخوت اور کہاں پھر یہ عالم کہ ایک حبشی غلام (حضرت بلالؓ) نے شادی کی خواہش ظاہر کی تو ان ہی قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے اپنی لڑکیوں کے رشتے فخریہ پیش کر دیئے۔ سلیم! یہ تھی اسلام کی عدیم النظیر تعلیم اور یہ تھا اس تعلیم کا فقید المثل عمل۔ چنانچہ یہی تعلیم اور اس تعلیم پر عمل تھا جس کے متعلق نبی اکرمؐ نے اپنے حجۃ الوداع کے انقلاب آفریں خطبہ میں فرمایا کہ

> آج عہد جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔ لوگو! تمہارا رب ایک ہے۔ اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر۔ عجمی کو عربی پر۔ سرخ کو سیاہ پر۔ سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں۔ مگر تقویٰ کے سبب۔

اِدھر تو یہ زلزلہ انگیز اعلان ہو رہا تھا اور اُدھر سے اس پر یوں مہر توثیق ثبت ہو رہی تھی۔ کہ ہاں!

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (۵/۳)،

آج (وہ) دن آگیا، کہ تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا گیا۔ اور اپنی نعمت کا تمہارے لئے اتمام کر دیا۔ اور تمہارے لئے اسلام کا دین پسندیدہ قرار دیدیا گیا۔

سلیم! تم نے عہدِ جاہلیت کی تفریق و تقسیم انسانیت بھی دیکھ لی اور اس کے بعد اسلام کی اخوت و مساوات کے مناظر بھی دیکھے۔ اب تم خود ہی فیصلہ کرو کہ یہ تمہاری ذاتیں، اور گوتیں، برادریاں اور قومیں، کس عہد کی یادگار ہیں۔ ہندوستان میں تو مصیبت یہ ہوئی کہ ہمیں اسلام کی جھلک بھی دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ یوں کہنے کو تو یہاں صدیوں تک اسلامی حکومت رہی۔ لیکن وہ حکومت "مسلمانوں" کی تھی؛ "اسلام" کی تو نہ تھی۔ پھر یہاں مسلمانوں میں بھی اکثریت نومسلموں کی ہے۔ جن کے اسلاف میں سے کوئی شخص کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ لیکن رسومات و عقائد وہی پرانے ساتھ رہے۔ تم نے فتح خاں کے باپ کو نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔ مسلمان ہوئے تین پشت گذر گئیں۔ خود بھی کافی عمر کا ہو چکا تھا۔ لیکن جب کبھی چھینک آتی۔ زور سے کہتا "جے نندی کی" کئی مرتبہ اس سے کہا کہ بابا "الحمد للہ" کہا کرو۔ وہ یہ سن کر مسکراتا۔ اور کہتا کہ بیٹا! جے نندی نکلتے نکلے گی "الحمد" آتے آئے گی۔ یہی "جے نندی" ہے جو آج مسلمانوں کے عقائد و اعمال و رسومات و نظریاتِ حیات۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ کے رگ و پے میں سرایت شدہ وراثتاً چلی آ رہی ہے۔ اور ہم محسوس تک نہیں کرتے کہ ہم کس طرح مسلمان کہلاتے ہوئے عملی شرک میں گرفتار ہیں۔ میں نے اسی فتح خاں سے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا کہ "چودھری ذرا سوچو تو سہی تم نے لڑکی پر کیا ظلم ڈھا رکھا ہے یہ تم اپنی ناک کی فکر میں ہو جسے بچانے کے لئے غیر گوت کے لڑکے سے ناطہ نہیں کیا جا سکتا لیکن جوان بیٹی کا تمہیں کوئی خیال نہیں کہ وہ بچاری کس طرح غمِ پنہاں کے تپ دق سے اندر ہی اندر گھلتی جا رہی ہے"۔ تمہیں معلوم ہے۔ اس نے کیا جواب دیا۔ کہنے لگا کہ "اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ میں لڑکی کے روٹی کپڑے سے نہیں مرتا۔ بڑی بات یہی ہے کہ میرے بعد اس کے بھائی اس سے اچھا سلوک نہ کریں۔ سو اس کے لئے بھی بندوبست کر جاؤں گا۔ چار بیگھے زمین اس کے نام کر دوں گا۔ اسے اور کیا چاہیئے"؟ سلیم! میں اُسے

کیا سمجھاتا۔ داعیاتِ فطرت کو بھی چھوڑ دو کہ یہ تذکرہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں تو یہ بات بھی آتی تھی کہ عورت کو "اپنے گھر" کی سوکھی روٹی ماں باپ کے گھر کے خوانِ نعمت سے زیادہ خوش آیند ہوتی ہے کہ "اپنے گھر" میں وہ اپنے آپ کو گھر کی مالکہ سمجھتی ہے۔ اور ماں باپ کے گھر میں وہ اپنے آپ کو دوسروں کے رحم وکرم کی محتاج، آستاں افتادہ، ذلیل شمار کرتی ہے۔ وہ ہر وقت محسوس کرتی ہے کہ میں اُن پر بوجھ ہوں۔ وہ کسی چیز پر اپنا حق نہیں تصور کرتی۔ قدم قدم پر اس کے لیے شکستِ پندار کا سامنا ہوتا ہے۔ سانس سانس پر اس کی خودی اور خودداری کا آئینہ چور ہوتا ہے۔ اس کا سینہ مردہ آرزوؤں کا مدفن۔ اس کا قلب خوں گشتہ تمناؤں کا مزار اور وہ خود ایک چلتا پھرتا جنازہ ہوتی ہے۔ وہ انسان نہیں انسان کی پرچھائیاں ہوتی ہے کہ جس کی ہر حرکت پکار پکار کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

یہ عفت و عصمت کے نازک آبگینے۔ ان مظلوموں میں سے اکثر کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنے احساسات کی آتشِ خاموش میں اس طرح اندر ہی اندر جل کر مر جاتی ہیں کہ مغزِ استخوان تک راکھ کا ڈھیر ہو جائے لیکن لب تک دھواں نہ آئے۔ لیکن ان میں سے جب کسی کے قدم پھسلتے ہیں تو وہ پھر اکیلی ہی بے آبروئی کے جہنم میں نہیں گرتی بلکہ خاندان بھر کی عزت و ناموس کو ساتھ لے کر تباہ ہوتی ہے اور یوں اونچے گھرانے کے "چودھریوں" کی ناک بیچ چوراہے کے کٹتی ہے۔

سلیم! اگر تم ناکتخدا جوان لڑکیوں کے اسبابِ موت کی تشخیص۔ یا ایسی شریف زادیوں کے حادثاتِ لغزش کی تحقیق کرو گے تو ان کی تہ میں تمہیں ان ہی "نجیب الطرفین" ذاتوں اور گوتوں کے اجارہ داروں کی "بولہبی ناک" کارفرما نظر آئے گی۔

پھر یہ عزت و ذلت کی تفریق ذاتوں پر ہی نہیں پیشوں تک بھی آ چکی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر ذاتیں

تو بنی ہی پیشوں پر ہیں۔ کسب و ہنر۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنا۔ کبھی ممتاز ترین جوہر انسانیت تھا۔ نبی اکرم صلعم نے اس بدو کے ہاتھوں کو فرطِ مسرت سے چوم لیا تھا جس پر پھاوڑے کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ لیکن آج مسلمانوں میں "دست کار" (ہاتھ سے کام کرنے والا) طبقہ سب سے ذلیل شمار ہوتا ہے۔ درزی، دھوبی، لوہار، نجار، سقہ، جولاہا۔ "کمین" گنے جاتے ہیں۔ یہ کیوں! اس لئے کہ ویدوں کی رو سے یہ پیشہ ور برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں اور منو سمرتی کے مطابق انہیں شودر سمجھا جاتا ہے۔ کیا اس کے علاوہ مسلمان کے پاس ان دستکاروں کو ذلیل خیال کرنے کی کوئی اور دلیل بھی ہے؟ سلیم! سوچو کہ انسانیت کی یہ تقسیم کہاں سے شروع ہوئی ہے اور اس کا استعمال کہاں ہو رہا ہے؟ اور اس پر پوچھئے تو ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر نہایت فخر سے کہتے ہیں کہ "الحمد للہ مسلمان ہوں" میرے ایک دوست نے ایک واقعہ سنایا۔..... پٹھانوں کی بستی ہے، وہاں ایک محلہ میں چھوٹی سی مسجد تھی۔ محلہ کے خاں صاحب اس کے منتظم تھے۔ ایک شاہ صاحب (سید) کو امام رکھ چھوڑا تھا (ذرا اس پر بھی غور کیا تم نے کہ جیسے گھر میں ملازم رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح مسجد میں "امام" رکھا جاتا ہے۔ لیکن یہ دل خراش داستان کبھی پھر سہی) ایک دن شاہ صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ نماز کا وقت آ گیا۔ خاں صاحب ابھی پہنچے نہیں تھے۔ محلہ کے دو چار نمازی جمع تھے۔ ان میں سے ایک سبزی فروش حافظ قرآن تھا۔ لوگوں نے اسے آگے کھڑا کر دیا۔ مقتدیوں میں خاں صاحب کا چھوٹا سا لڑکا بھی شامل تھا۔ اتنے میں خاں صاحب بھی آ گئے۔ جلدی جلدی وضو کیا۔ نمازی رکوع میں جا چکے تھے۔ لپک کر بڑھے دیکھا کہ محراب میں شاہ جی نہیں۔ امام بخش سبزی والا ہے۔ دیکھ کر آنکھیں غضب آلود ہو گئیں سارا جسم غصہ سے کانپنے لگ گیا۔ آگے بڑھ کر امام صاحب کے ایک لات رسید کی اور پانچ سات گالیاں سنا کر کہا کہ ابے او کنجڑے! تجھے یہ جرأت کیسے ہو گئی کہ پٹھانوں کے بیٹے پیچھے کھڑے ہوں اور تو آگے محراب میں بڑھا جائے۔ سلیم! مسجد میں یہ کچھ ہو رہا تھا اور آسمان کے فرشتے انگشت بدنداں محوِ حیرت تھے کہ یا اللہ! یہ وہی قوم ہے جس کی یہ حالت تھی کہ بلالؓ حبشی آتے تو حضرت عمرؓ و حضرت علیؓ تعظیم کے لئے ایک طرف ہو جاتے کہ سیدنا بلال آ رہے ہیں۔ وہ قوم کہ جس کے امیر المومنین (حضرت عمرؓ) کی سب سے آخری آرزو یہ تھی کہ اُن کے جنازہ

کی نماز ایک مزدور (صہیب رومی) پڑھائیں آج اس قوم کی یہ حالت ہو چکی ہے۔ ممکن ہے کہ تم کہدو کہ یہ واقعہ تو افراط و تفریط کا Extreme case ہے۔ لیکن ذرا تم (ادروں کو چھوڑ کر خود) اپنے دل سے پوچھو کہ کیا اس میں ایک موچی اور ایک سید کے لئے ایک جیسی تعظیم کا جذبہ موجود ہے؛ حالانکہ سید السادات صلعم جناب سرور کائنات خود اپنے ہاتھوں سے جوتے گانٹھ لیا کرتے تھے۔ سیدوں کی تو یہ حالت ہے کہ مسلمانوں نے انہیں بالکل برہمن۔ اور برہمن بھی سب سے اونچی گوت کے "گوڑ برہمن" بنا رکھا ہے۔ کسی سیدزادی کے ساتھ رشتۂ مناکحت کا تصور ایک غیر سید کے دل میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ وہ یوں سمجھنے لگتا ہے گویا اس سے کوئی عظیم گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ وہ کانپتا ہے، لرزتا ہے۔ گویا اس نے کسی کے دامنِ تقدس کو نگاہِ معصیت آلود سے داغدار کر دیا ہو۔ سلیم! سوچو کہ یہ چیزیں ہم میں کہاں سے آ گئیں۔ اور آنے کے بعد یوں ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئیں کہ گویا یہ سب کچھ عینِ اسلام ہے۔

تم نے لکھا ہے کہ ہمارا "بڑا طبقہ" اب ذات برادریوں کی حدود و بندیوں کو اٹھاتا جا رہا ہے۔ یہ درست ہے لیکن تم نے اس مسئلہ کا بھی سطحی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اسی لئے حقیقت تمہاری نگاہوں سے اوجھل رہی ہے اگر تم ذرا سطح سے نیچے اتر کر دیکھتے تو صورتِ حالات ایسی اطمینان بخش نظر نہ آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ مسلمان کا کوئی اجتماعی نظام موجود نہیں اس لئے اس کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ

رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

ہمارا یہ "بڑا طبقہ" ذات برادری کی زنجیروں سے نکلا تو طبقاتی تقسیم کے طوق و سلاسل میں اُلجھ کر رہ گیا۔ انہوں نے ذات اور گوت کی پابندیوں کو اس لئے نہیں توڑا کہ یہ قیود خلافِ اسلام تھیں۔ بلکہ ان پابندیوں سے اس لئے آزادی حاصل کی کہ اپنی پوزیشن Status کے مطابق تعلقات وابستہ کرنے میں آسانی رہے۔ حسب نسب کا معیار چھوٹا تو دولت و وجاہت کا معیار آ گیا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کا قرآنی معیار تو پھر بھی قائم نہ ہوا۔ لہٰذا یہ تبدیلی کونسی مسرت بخش ہوئی۔ بلکہ اس سے تو ایک اور نقصان ہو گیا۔ تمہیں معلوم ہے مفتی نبی احمد کا

لڑکا اپنے چچا کے ہاں منسوب تھا۔ اور اس کی تعلیمی اخراجات کی کفالت بھی دراصل اسی چچا نے کی تھی۔ اللہ نے کرم کیا۔ ان غریبوں کی قسمت بر آئی۔ لڑکا آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں پاس ہو کر ڈپٹی کمشنر ہو گیا۔ اس کی منسوبہ اور اس کے چچا کی خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ لڑکے نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ کہتا ہے کہ مجھے بڑے بڑے ڈپٹیوں اور ججوں سے پیغام آ رہے ہیں۔ میں اپنے (Status) کے مطابق شادی کروں گا۔ سلیم! میں تمہیں کیا کیا بتاؤں۔ کوئی ایک کل ٹیڑھی تھوڑے ہی ہے۔ یہاں تو۔

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

* * *

اور پھر یہ ذات اور گوت کا مسئلہ صرف بیاہ شادیوں تک ہی محدود نہیں اس کا دائرۂ اثر و نفوذ حدود فراموش واقع ہوا ہے۔ یہ "آل پنجاب مسلم راجپوت کانفرنس" یہ "جمعیت القریش" یہ "الرائی لیگ" یہ "انجمن سادات" یہ "موتمر افغانان" یہ "اعوان کانفرنس" یہ سب کیا ہیں۔ اسی امتیاز رنگ و بو کی عجمی تفسیریں۔ منوجی کے خواب کی "مومنانہ" تعبیریں۔

مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی کے لئے یہی تفریق و تقسیم کچھ کم نہ تھی جو کچھ عرصہ سے پنجاب میں کاشتکار و غیر کاشتکار کی تقسیم جدید شروع ہو گئی۔

پہلے ہی سے نہ تھی مری کچھ قدر و منزلت
پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

راجپوت، سادات۔ اعوان قریش کی تقسیم تو خیر پھر بھی مسلمانوں کے اندر ہی احلطے اور دائرے قائم کرتی تھی۔ اس جدید تقسیم کی رو سے مسلمان کاشتکار اور غیر مسلم کاشتکار ایک طرف ہو گئے اور غیر کاشتکار ایک طرف۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے گاؤں میں نواب کی پٹی میں مسلمان جاٹ اور ہندو جاٹ رہتے ہیں اور باغ کی طرف شیخوں کا محلہ ہے۔ پچھلے دفعہ گاؤں میں گیا تو دیکھا کسی معاملہ میں ان شیخوں اور ہندو جاٹوں کا تنازعہ ہو گیا۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا

کہ مسلمان جاٹوں نے ہندو جاٹوں کا ساتھ دیا۔ حالانکہ وہ سراسر غلطی پر تھے۔ میں نے پوچھا تو چودھری کرم بخش نے بلاتامل جواب دیا کہ واہ صاحب! ہم جاٹوں کا ساتھ نہ دیتے تو اور کس کا دیتے۔ ہم اور وہ ایک قوم کے۔ ایک برادری کے۔ وہ بھی زمیندار۔ ہم بھی زمیندار (یعنی کاشتکار) یہ شیخ نہ ہماری ذات نہ برادری۔ یہ تو دوکاندار ہیں کاشتکار نہیں ہیں۔ سلیم! میں نے سنا تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی کہ لو! تم تو صرف ذاتوں کی تقسیم پر ہی خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ اب انسانیت کی اس جدید تقسیم کا بھی ماتم کرو۔

* * *

سلیم! تم نے بات چھیڑ دی تو آؤ تمہیں اپنے قلب درد آگیں کے نازک ترین گوشہ میں چھپا کر رکھا ہوا ایک اور واقعہ بھی سنا دوں۔ وہ واقعہ کہ جس کی یاد کو میں نے اس لئے سنبھال کر رکھا ہوا ہے کہ جب ہندوستان کے مسلمانوں کے جرائم کی فہرست مرتب ہونے لگے تو اسے اس فرد جرم کی پیشانی پر جگہ دوں۔ ہمت ہے تو ذرا ضبط سے سنو۔

ایک صاحب صوبۂ بنگال کے ہندو۔ سرکاری دفتر میں باعزت آسامی پر ملازم۔ خوشحال۔ صاحبِ دل۔ لیکن ہندوؤں کی تقسیم انسانیت کے مطابق "نیچ ذات" Low caste سے متعلق میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اسلامی مساوات و اخوت کا شیدائی ہوں اور اپنے ذاتی مطالعہ کے بعد اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں میں بھی اور میرے بیوی بچے سب۔ میں نے کہا۔ بسم اللہ۔ اس میں توقف کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے صوبہ میں جو نیچ ذات کا ہندو مسلمان ہو جاتا ہے وہ مسلمان ہونے پر بھی نیچ ذات ہی کا شمار ہوتا ہے۔ بڑی ذات کے مسلمان نہ اس سے معاشرتی تعلقات قائم کرتے ہیں۔ نہ اخوت و مساوات کا برتاؤ روا رکھتے ہیں۔ میری سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بڑی لڑکی شادی کے قابل ہے۔ اب تو یہ ہے کہ نیچ ذات ہی سہی۔ اپنا خاندان، اپنی برادری تو ہے۔ جب مسلمان ہو جاؤں گا تو ان سے قطع علائق ہو جائے گا۔ اگر اس وقت مسلمانوں نے بھی میرے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کیا تو ڈرتا ہوں کہ اس لڑکی کے لئے موزوں بر کہاں سے ملے گا۔ سلیم! یقین مانو۔ میں

یہ باتیں سن رہا تھا اور یوں سمجھ رہا تھا گویا کسی خواب کی دنیا میں ہوں۔ اس لئے کہ یہ چیز میرے حیطۂ گمان میں کبھی نہ آسکتی تھی کہ سلمان ایک نومسلم کے ساتھ اچھوتوں کا سا سلوک کرتے ہیں! میں نے انہیں حوصلہ دلایا۔ اور (سادگی ملاحظہ ہو کہ) ذمہ لے لیا کہ اس کی بابت میں انتظام کرتا ہوں۔ اور تم حیران ہو گے کہ کامل ایک برس کی تگ و دو کے بعد یہ تلخ حقیقت سامنے آگئی کہ جو کچھ وہ صاحب کہتے تھے حرف حرف صحیح تھا۔ اونچا طبقہ تو ایک طرف، متوسط درجے کے سلمان بھی نہ اُن سے معاشرتی تعلقات میں مساوات برتنے پر تیار تھے، نہ کوئی اس کے ساتھ قرابت داری کے تعلقات وابستہ کرنے پر آمادہ۔ سلیم! برس دن کی جد و جہد اور ناکام تگ و دو کے بعد اب

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

میں پوچھتا ہوں کہ اور جرائم کو چھوڑ دو۔ کیا مسلمانانِ ہند کی "فردِ جرم" میں یہی ایک جرم اتنا بڑا نہیں کہ اس کی پاداش میں اللہ کا ذلت آمیز عتاب اُن پر مسلط ہو جائے اور نکبت و ادبار کی گھٹائیں اُن پر منڈلانے لگیں۔ اور سچ پوچھو تو جو کچھ اُن کے ساتھ ہو رہا ہے وہ اللہ کا عذاب نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھ کر اس عذاب کو دیکھنے کی کوشش نہ کریں۔

سخن زنامہ و میزاں دراز تر گفتی
ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

* * *

سلیم! سلسلۂ سخن دراز ہو گیا۔ جب تم بات ہی ایسی چھیڑ دو تو میں کیا کروں۔ مجھے تم جانتے ہو کہ

جرس ہوں میں فغاں خوابیدہ ہے میرے رگ و پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

جب تم میرے بربطِ ہستی کے کسی ایک تار کو چھیڑ دیتے ہو تو ان میں خفتہ نغمات ایک ایک کر کے سکوت آگیں

فضا میں تموج پیدا کر دیتے ہیں۔ تم نے فتح خاں کی چھوٹی لڑکی کی داستانِ الم انگیز چھیڑی کہ تمہارے نزدیک اس کی مصیبت سب سے بڑی اندوہناک ہے اور اس میں شبہ بھی کیا ہے۔ لیکن اس کی بڑی لڑکی کی مصیبت تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی جو اپنی اجڑی ہوئی کائنات کو ساتھ لئے دس سال سے باپ کے گھر میں قبرستان کے محافظ کی طرح بیٹھی ہوئی ہے۔ تم چونکہ کبھی کبھار گاؤں جاتے ہو، اس لئے یہ چیزیں تمہاری نگاہ سے اوجھل رہتی ہیں۔ فتح خاں کی یہ بڑی لڑکی اپنے تایا رحمت خاں کے ہاں بیاہی ہوئی ہے۔ اور رحمت خاں کی لڑکی فتح خاں کے بیٹے سے۔ دونوں لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں ہنسی خوشی بستی رستی تھیں۔ دو دو تین تین بچے۔ زندگی کی کشتی حسین بط کی طرح ایک سکوت آفریں ندی میں تیرتی چلی جا رہی تھی۔ کہ ایک دفعہ دونوں بھائیوں میں کسی معاملہ پر تکرار ہوگئی۔ رحمت خاں نے اپنے لڑکے سے کہا کہ اگر میرا بیٹا ہے تو اسی وقت اپنی بیوی کو میکے بھیج دے۔ اس نے ایک تو کہیں سے سن رکھا تھا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ اس پر شاید جائیداد سے عاق ہونے کا ڈر بھی تھا۔ اپنے ہاتھوں اپنی جیتی جاگتی دنیا گھر سے رخصت کر دی۔ بیٹی گھر میں آگئی تو فتح خاں نے اپنے بیٹے سے بھی وہی کہا۔ نتیجہ یہ کہ دوسرے ہی دن رحمت خاں کی بیٹی معہ بچوں کے اس کے گھر میں بیٹھی تھی۔ اس واقعہ کو دس برس ہونے کو آئے۔ دونوں لڑکیاں اُجڑی ہوئی بیٹھی ہیں اور کسی کو خیال تک بھی نہیں آتا کہ یہ کیا قیامت ہے۔ نہ انہیں گھروں میں بساتے ہیں، نہ طلاق ہی دیتے ہیں اب کہو کہ میں تمہیں کس کس کی دُکھ بھری کہانی سناؤں؟ مشکل یہ ہے کہ میں نے یہاں طلاق کا لفظ لکھ دیا ہے۔ اب تمہارا اس کے متعلق استفسار آجائے گا کہ طلاق کیا ہے۔ کن حالات میں دی جاتی ہے۔ کیسے دی جاتی ہے۔ اس کی حدود و شرائط کیا ہیں۔ لیکن خیر۔ اب تم چھٹیوں میں ملوگے تو یہ باتیں زبانی ہو جائیں گی۔

والسلام

(جولائی ۱۹۴۲ء)

سلیم کے نام پانچواں خط

(گاؤں والوں کی جہالت اور غربت کی لرزہ انگیز داستان)

سلیم! دیکھا نا۔ چار دن گاؤں میں رہے اور انسانیت کی ہڈیوں کے اندر چھپی ہوئی چوٹیں کس طرح اُبھر کر تمہاری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ میں نہ کہتا تھا کہ اس شہری چمک دمک کی نظر فریب چار دیواری کو چھوڑ کر گاؤں میں جاؤ اور زندگی کو سکرات موت کی ہچکیاں لیتے ہوئے دیکھو۔ جاؤ اور وہاں انسان نہیں بلکہ انسانوں کی لاشوں کو چلتے پھرتے دیکھو۔ دیکھو اور پھر اپنے دل سے پوچھو کہ قوم کی صحیح حالت کا مقیاس Meter شہروں میں ہے یا شہروں سے دور ویرانوں میں کہ جنہیں شہر والے دیہات کہتے ہیں۔ تمہاری شہری زندگی کا شفق آگیں تمدن تو رخسار قوم پر مصنوعی غازہ ہے جس کی سرخی صرف نگاہوں کو دھوکا دے سکتی ہے۔ چہرے کا اصلی خون اور خون کی صحیح رنگت دیہات کے اندر ہے۔ غازے سے چہرے کی زردی چھپائی جا سکتی ہے۔ سُرخی میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ شہری زندگی کی اصلاح اور وہاں کے باشندوں کی بہبود و فلاح، گلگونے اور غازے کی فراہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہاں کی مرفہ الحالی اور فارغ البالی پر قوم کی عام حالت کو محمول کر لینا ایسے ہی ہے۔ جیسے کوئی اجتماع عید کے گلستانی منظر کو مسلمانوں کی بہار زندگی کا آئینہ دار قرار دیدے۔ ان شہروں میں بسنے والوں کو کیا علم کہ اُن کی قوم کے اسی نوّے فی صدی افراد پر کیا گزر رہی ہے جو دیہات کے

زندہ قبرستانوں میں زندگی کے سانس گن رہے ہیں۔ وہ شہری جو شام کی ہواخوری کی خاطر دو چار روپے کا پٹرول پھونک ڈالیں انہیں کیا معلوم کہ اس پھک سے اُڑ جانے والے پٹرول کی قیمت میں کتنی قیمتی جانیں بھوک کی موت سے بچائی جا سکتی ہیں۔ وہ شہری جو ڈیڑھ ڈیڑھ روپیہ فی کس عصرانہ (Evening tea) پر صرف کر ڈالیں انہیں کیا خبر کہ اس ایک چائے کے صرفہ میں ایک کنبہ مہینہ بھر تک روٹی کھا سکتا ہے۔ وہ شہری جن کی کوٹھیوں میں پاؤں کے نیچے روندے جانے کے لیئے پانچ پانچ ہزار روپے کے قالین بچھے ہوں وہ کیا جانیں کہ ایک قالین کے بدلے پورے کا پورا گاؤں ہلاکت کے خونی پنجہ سے بچایا جا سکتا ہے۔ سلیم! یہ شہری کیا جانیں کہ زندگی کس بھاؤ بکتی ہے اور خدا کی مخلوق پر کیا گزر رہی ہے

جو نہیں آشنا مصیبت کا   درد و غم کا نہ جو شکار ہوا
جس پہ کوئی کبھی نہ وقت پڑا   جو نہ اُٹھ اُٹھ کے رات کو رویا
وہ نہیں جانتا دعا کیا ہے!
اُسے معلوم کیا خدا کیا ہے؟

سلیم اب تو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ افلاس اور بھوک کی شدّت نے غریب و نادار کاشتکار کا کیا حال کر رکھا ہے۔ وہ سال بھر مصیبتیں اٹھاتا اور مشقتیں جھیلتا ہے۔ مئی اور جون کی چلچلاتی دھوپ اپنے سر پر لیتا ہے۔ دسمبر اور جنوری کی کپکپاتی سردیاں گاڑھے کے ایک کرتے میں گزار دیتا ہے اور سال بھر کی محنت و مشقت کے بعد جب دیکھتا ہے کہ پیداوار مہاجن لے گیا اور رہا سہا اثاثہ مالیہ کی وصولی میں نمبردار نے قرق کرا لیا۔ تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسے کوئی بات نہیں سوجھتی۔ یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بالآخر یہ کیا ہو رہا ہے! میں نے ایک مرتبہ جیونو کے آمد و خرچ کا سرسری حساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس غریب کو ایک آنہ روز کی بھی یافت نہیں۔ حالانکہ وہ خود، اس کے دونوں بیٹے اور بیوی سارا گھر کا گھر سال بھر تک یوں رات دن ایک کر دیتے ہیں، جیسے کوئی کولھو میں جُت رہا ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ علی بخش (چوہان) کا بیٹا ابھی ابھی قید

کاٹ کر آیا ہے۔ بڑا نیک لڑکا تھا۔ میں نے پوچھا کہ فادے تم کس بُری صحبت میں بیٹھ گئے کہ آخر کال کوٹھری تک جانے کی نوبت آگئی۔ سلیم! اُس نے کیا جواب دیا، کہنے لگا بابو جی! چار برس متواتر ہو گئے۔ دن رات ڈھور ڈنگر کی طرح کام کیا۔ لیکن قسم لے لو جو پیٹ بھر کر روٹی ملی ہو۔ زمین لالہ کے پاس چلی گئی۔ گھاس کھود کر بھی دیکھ لیا۔ لیکن لوگوں کے پاس اپنے کھانے کو کچھ نہیں۔ مال مویشی کو چارہ خرید کر کون ڈالتا ہے۔ بالآخر تنگ آگیا تو سوجھی کہ جیل خانے چلے چلو۔ کام اس سے زیادہ کیا لیں گے جو اب کرتا ہوں۔ اور روٹی کی ذمہ داری اُن کے سر ہو گی۔ سلیم! میں نے سنا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا کہ یا اللہ! تیری یہ وسیع و عریض زمین تیرے بندوں پر اب اس درجہ تنگ ہو چکی ہے کہ لوگ روٹی کی خاطر جیل جانے پر مجبور ہو رہے ہیں! کہو سلیم! تمہارے ان بڑے بڑے طرّہ باز شہریوں کے تصور میں بھی یہ منظر آ سکتے ہیں! "ہمدردیٔ نوعِ انسانی" "مساوات" "آزادی" "کسانوں کی بہبود" "مزدوروں کی خدمت" نرم نرم الفاظ کی خوشنما ترکیبیں ہیں جو شہر کے بلند ایوانوں میں ڈھلتی اور رفیع المنزلت پلیٹ فارموں سے فضا میں نشر کی جاتی ہیں۔ وہ الفاظ جو معانی سے اسی طرح معرّا ہوتے ہیں، جس طرح ان شہریوں کے کمروں میں کاغذ کے پھول اور کپڑے کی بیلیں حسنِ نکہت و شباب لطافت سے عاری۔ سوچو سلیم! کہ جس قوم نے اپنی ریڑھ کی ہڈیوں کو اس طرح کسمپرسی کی حالت میں چھوڑ رکھا ہو کہ اسے گھن کھاتا ہے تو کھا جائے، اس قوم کی زندگی کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟

* * *

مائی برکت بی بی کی خبر سے افسوس ضرور ہوا۔ لیکن (خدا مجھے معاف کرے) اچھا ہی ہوا۔ بچاری زمین و آسمان کی آفات سے محفوظ ہو گئی۔ ضعیفی۔ بیماری۔ بھوک۔ اور ان سب پر اس کا جنون۔ غریب کسی ایک مصیبت میں تھوڑی گرفتار تھی؟ برکت بی بی اس دنیا میں نہ رہی لیکن اس کی داستانِ الم انگیز کلنک کے ٹیکے کی طرح تمہاری قوم کے ماتھے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہ گئی۔ تم نے اس بچاری کی مصیبت کی کہانی تو سنی لیکن کچھ غلط اور کچھ نامکمل۔ تمہیں وہاں سناتا بھی کون؟ گاؤں کے بڑے بوڑھوں میں سے لے دیکے چوہدری جھنڈو خاں باقی

رہ گئے ہیں۔ لیکن کچھ عمر کا تقاضا۔ اور کچھ مقلد غیر مقلد کے جھگڑے میں اس کے سر پر جو چوٹیں آئیں اس سے اس کا حافظہ بہت بے ربط ہو گیا ہے۔ اس جھگڑے میں وہ غریب یوں ہی پٹ گیا۔ اس کی جانے بلا کہ بڑے پیر جی کی گیارہویں کیوں دیتے ہیں۔ ایک رسم تھی جو گھر میں چلی آتی تھی۔ وہ بھی اس کا پابند تھا۔ لیکن وہابی اسے کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ آرام سے سمجھاتے بجھاتے تو ممکن تھا بات اس کی سمجھ میں آ جاتی۔ لیکن اس سے جہاد کا ثواب کیسے ملتا جو پیٹ ڈالا بچارے کو۔ اور لطف یہ کہ گاؤں میں گگے پیر (سانپوں کے دیوتا) کی کڑاہی اب تک چڑھتی ہے۔ اسے کوئی نہیں روکتا۔ ہمارے ہاں وہابیوں کی ابتدا اور انتہا بھی اپنے اندر عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں رکھتی ہے۔ جڑ دیکھو تو شہداء کے مقدس خون سے نم یافتہ اور شاخیں دیکھو تو آمین بالجہر و خفی کے مباحث کی اکاس بیل سے جکڑی ہوئیں۔

وہ ابتداء کے لئے تھا یہ انتہا کے لئے

ہاں۔ برکت بی بی مرحومہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ آؤ تمہیں میں بتاؤں کہ وہ کون تھی اور اس کی بیٹیا کی داستان کیا تھی۔ جھنڈو خاں ہی کے الفاظ میں سنو جو اس نے ایک عرصہ ہوا مجھ سے کہے تھے۔ اُس نے حقے کا کش لگایا اور کہا۔

گاؤں میں ایک غریب زمیندار تھا۔ کریم بخش نام۔ اس نے اپنی حیثیت کے مطابق لڑکے کی شادی پر برادری کو کھانا کھلایا۔ شام کے وقت جب لوگ چوپال میں بیٹھے تھے، چوہدری فتح خاں بولا "ہوں! بیاہ رچانے بیٹھا ہے، اس سے اچھا تو ہم نے بڑھیا کا چالیسواں کر دیا تھا۔" میراثی نے حقہ پیش کرتے ہوئے جھک کر سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کہا "غریب نواز! سرکار کی کیا بات ہے؟" چوہدری فتح خاں نے یہ بات آج کوئی پہلی بار نہیں کہی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ کسی کے ہاں کوئی تقریب ہو، کسی کا شگن ہو، کسی کا لگن ہو، وہ ہمیشہ کچھ ایسی ہی بات کہتا۔ اور ایک فتح خاں پر ہی کیا موقوف، گاؤں میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ چوہدری فتح خاں کا بیٹا جوان ہوا، شادی کے دن قریب آ گئے۔ ایک شام چوہدرانی نے کہا کہ یوں تو گھر میں سب کچھ تیار ہے۔ لیکن بالائی

خرچ کے لئے روپیہ کافی نہیں۔ اگر کسی بات میں کسر رہ گئی تو برادری میں ناک کٹ جائے گی۔ چوہدری فتح خاں صبح سویرے سیدھا شہر کی طرف گیا اور لالہ بنواری داس کی دوکان پر پہنچا۔ وہ منڈی کا آڑھتیہ اور گاؤں کا مہاجن تھا۔ چوہدری اس سے پہلے کبھی اس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا اور لالہ اس موقع کی تاک میں تھا۔ گاؤں کی تمام باتیں ہر روز لالہ کے کان تک پہنچ جاتیں۔ چوہدری کو آتے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دوکان سے اُٹھا، پرنام کیا، چارپائی بچھوائی، حقہ بھروایا۔ شربت پلایا، کچالو کی چاٹ منگائی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا، چوہدری کچھ اداس سے معلوم ہوتے ہو۔ کیا بات ہے چوہدری نے کہا "نہیں کچھ نہیں" لالہ نے کہا "پھر بھی؟" چوہدری بولا۔ "نہیں معلوم ہے کہ لال خاں کی شادی ہے کچھ روپیہ چاہیئے" لالہ نے ہنس کر کہا "بھولے بادشاہ! یہ بھی بھلا کوئی فکر کی بات ہے۔ چھورا ہمارا، یہ دوکان تمہاری، پرمیشور کا دیا سب کچھ ہے۔ جتنا جی چاہے لیجاؤ۔ تم نے کونسا روز روز بیاہ رچانا ہے۔" چوہدری فتح خاں نے پانچسو روپیہ لالہ سے لیا۔ لالہ نے بہی میں کچھ لکھا اور اس پر چوہدری نے انگوٹھا لگا دیا۔ لال خاں کی شادی بڑی دھوم سے ہوئی۔ بارات کے ساتھ ایک چھوڑ دو۔ دو طائفے۔ الٰہی جان جگرانواں والی، اتو ڈومنی۔ رحیم آباد کے بھانڈ، رام نگر کے آتشباز، انگریزی بینڈ باجہ، کہتے ہیں کہ پچاس روپے کے سکے تو بہو کی ڈولی پر سے نچھاور کر دیئے۔ چوہدری فتح خاں دل میں خوش تھا کہ کسی کے طعن و تشنیع سننے کی گنجائش باقی نہیں رہی لیکن برادری کی زبان کون پکڑے۔ انہوں نے پھر بھی بیسیوں باتوں میں کیڑے ڈال دیئے۔ لیکن شادی کا چرچا دور دور تک ہو گیا۔

فصل نہایت عمدہ تھی۔ گیہوں، چنا، سرسوں سب بو رکھے تھے۔ کسان کے لئے کچی فصل کی ایک ایک بال جان سے عزیز ہوتی ہے۔ لیکن لالہ جی کا منیم ہر تیسرے دن آ جاتا کہ لالہ جی نے چارہ منگایا ہے۔ چار و ناچار ہری فصل کاٹ کر دینی پڑتی۔ چوہدری فتح خاں کے بیل تو کُٹی پر گزر کرتے اور لالہ بنواری داس کا ٹٹو گیہوں کی دودھیا بالیں کھاتا۔ فصل پک کر تیار ہوئی۔ کھلیانوں میں غلہ جمع ہوا تو لالہ جی کا منیم آ گیا، غلہ لدوایا اور چوہدری کو ساتھ لے کر منڈی پہنچ گیا۔ لالہ نے چارپائی بچھوائی، حقہ منگایا۔ چوہدری کو لال خاں کے بیاہ کی باتوں میں

لگائے رکھا۔ ادھر غلّہ تلتا رہا۔ خود ہی تولا خود ہی حساب لگایا۔ چوہدری کی جانے بلا کہ کیا وزن ہوا؟ نرخ کیا ہے؟ حساب کس طرح کیا گیا؟ لیکن لالہ نے خود ہی کہا کہ "نہ ہماراج بخشش لاکھ ٹکے کی، حساب پائی پائی کا۔ سن لو کہ چار اڑھیا ساڑھے سینتیس، اٹھنی اوپر کی چھوڑی۔ لگا چوہدری اڑتیس پر انگوٹھا" چوہدری نے بھی پر انگوٹھا لگا دیا۔ لالہ نے اکنی کے بتاشے منگائے اور کہا کہ ہماری طرف سے لال خاں کی بہو کو دیدینا۔ چوہدری فتح خاں خوش ہوا کہ لالہ تو دوست بن گیا۔ حساب میں سے بھی اٹھنی چھوڑ دی۔ اور خاطر تواضع الگ رہی۔ گھر میں پیسہ نہ تھا۔ کپڑے کی ضرورت ہوئی تو لالہ کی دوکان سے، نقد کچھ چاہیئے تو لالہ کے ہاں سے' جو لالہ جی کے جی میں آتا، چوہدری کو بھجوا دیتا اور جو جی میں آتا بہی میں درج کرتا۔ جب بھائی چارہ ہوگیا تو پھر وشواس کاہے کا؟

"چوہدری نے جو گیہوں گھر میں کھانے کے لیے رکھا تھا۔ اس میں سے کچھ نمک، مرچ، مصالحہ کے لیے گاؤں کے بنیا کی دوکان پر پہنچ گیا۔ کچھ دھوبی، سقہ، نائی، کمہار، شاہ جی لے گئے۔ دوسرے ہی مہینے یہ حالت ہوگئی کہ لالہ جی کے نوکر تو چوہدری فتح خاں کا موتیوں جیسا گیہوں کھاتے تھے اور چوہدری کے ہاں مکّی اور باجرہ پکتا تھا۔ بوائی کا موسم آیا، چوہدری نے بڑی محنت سے زمین تیار کی۔ لیکن بیج کے لیے غلّہ نہ تھا۔ لالہ کے ہاں پہنچا۔ لالہ نے کہا "غلہ کی کیا پرواہ۔ منوں لیجاؤ۔ لیکن پرسوں مل سکے گا، چابی بہو کے پاس ہے اور بہو ایک شادی پر گئی ہے" پرسوں آیا تو لالہ موجود نہ تھے۔ غرضیکہ لالہ ملا تو بہو نہ تھی اور بہو ملی تو لالہ نہ تھا۔ بوائی کے دن گنے چنے ہوتے ہیں۔ وقت پر بیج نہ ڈالا جائے تو فصل کیا ہو! بیج بے وقت ملا اور ملا بھی ناقص۔ مجبوراً وہی ڈالنا پڑا۔ ایک بیج ناقص، پھر بدقسمتی کہ بارش وقت پر نہ ہوئی، بازار میں نرخ گر گئے، جو گیہوں چار پانچ روپے من بکا کرتا تھا۔ اب ڈیڑھ دو روپے سے آگے نہ بڑھتا۔ سال بھر جو کچھ لالہ کی دوکان سے آتا وہی اتنا ہو جاتا کہ اس غلّہ کی قیمت سے ادا نہ ہو سکتا تھا۔ پہلے تو بہو کا زیور بکا۔ پھر ایک کھیت رہن رکھا گیا۔ ایک بیچا دوسرا بیچا، تیسرا رہن ہوا۔ یہ گیا وہ گیا۔ اوپر تلے فصلیں خراب ہوئیں، نرخ گر گئے۔ چوہدری فتح خاں ہزار ترکیبیں نکالتا، بڑی محنت کرتا اپنے گزارے کے لئے سب کچھ پیدا کر لیتا لیکن لالہ جی کچھ ایسا چکی کا پاٹ ہو کر گلے پڑے تھے کہ اٹھائے نہ اُٹھتے تھے اور

چھڑائے نہ بنے۔ پانچ ہی سال میں یہ حالت ہو گئی کہ ایک چپہ بھر زمین پاس نہ رہی۔ زمین کی قیمت گر گئی۔ جو کھیت پانچ سو میں رہن رکھا تھا اس کی قیمت اب چار سو رہ گئی تھی۔ بیل بک گئے۔ بھینسیں مر گئیں۔ نہ کھانے کو اناج نہ جوتنے کو زمین۔ عمر بھر کاشتکاری کے سوا اور کچھ نہ کیا تھا۔ روٹیوں سے محتاج ہو گیا۔ غریبی میں گھر میں اتفاق بھی نہیں رہتا۔ ساس ہمیشہ بہو کو طعنے دیا کرتی کہ جب سے یہ سبز قدم آئی ہے، بسا گھر اجڑنا شروع ہو گیا۔ لے دیکے ایک مکان رہ گیا تھا۔ لالہ ہنواری داس کی اس پر بھی نظر تھی۔ وہ اسے نیلام نہیں کرانا چاہتا تھا بلکہ خود لینا چاہتا تھا۔ چوہدری فتح خاں مکان دینے پر کس طرح رضامند ہو جاتا؟ بزرگوں کی نشانی، سر چھپانے کا ایک ہی آسرا۔ چڑیا اپنے گھونسلے کو ویران ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ لالہ کی بہت منتیں کیں۔ گاؤں والوں نے بھی کہا۔ لیکن لالہ کہتا ہیں نے ایک سادھو مہاتما کو بچن دے رکھا ہے، یہاں اس کے لئے سمادھی بنواؤں گا۔ یہ تو دھرم ارتھ کا کام ہے، ورنہ مجھے اس مکان کو لے کر کیا کرنا ہے؟"

یہاں پہنچ کر جھنڈو خاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کچھ دیر رکا۔ حقہ کا ایک لمبا سا کش لگایا۔ اور پھر کہانی شروع کر دی۔ کہا:۔

„جب لالہ نے دیکھا کہ فتح خاں کسی طرح مکان دینے کے لئے تیار نہیں، تو اس نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور خرچہ رکھوا کر چوہدری کو جیل خانے بھجوانے کا حکم لے لیا۔ لال خاں کو کاتک میں جاڑے کا بخار آیا تھا۔ ایک دو دن گاؤں کے سیانے نے کچھ دوا دارو کر دیا۔ لیکن پیسہ پاس نہ تھا، علاج کس طرح ہوتا۔ بخار بگڑ کر پرانا ہو گیا۔ جس دن چوہدری فتح خاں کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں، لڑکے کی حالت نازک تھی۔ چوہدری نے ایک مہینہ جیل میں کاٹا بالآخر مجبور ہو کر مکان لالہ کو لکھ دیا۔ عمر بھر عزت کی زندگی بسر کی تھی۔ دن کی روشنی میں گاؤں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ رات کے اندھیرے میں مکان پر پہنچا۔"

اب جھنڈو خاں کی آواز رک سی گئی۔ معلوم ہوتا تھا گھگی بندھ رہی ہے اس نے ایک کش اور لگایا، پھر ہمت کر کے بولا۔

چوہدرانی نے آہٹ پا کر کہا "کون؟ بیٹا لالو! آؤ بیٹا، تم کہاں گئے تھے میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں، روٹی لے کر بیٹھی ہوں، بندو تمہیں یاد کرتے کرتے سو گیا۔" فتح خاں نے کہا لالو کہاں ہے؟ بڑھیا بولی: "گاؤں کے لوگ اسے باہر لے گئے تھے، اب تک واپس نہیں آیا۔" چوہدری فتح خاں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ اب سمجھا کہ بیٹا بھی چل بسا اور بیوی نہ صرف آنکھیں ہی کھو بیٹھی بلکہ پاگل بھی ہو گئی۔ بہو گاؤں میں کسی کے ہاں مزدوری کرنے گئی تھی۔ بادل گھرے ہوئے تھے۔ جاڑے کے دن، باہر بالکل اندھیرا تھا۔ پتہ نہیں فتح خاں کے جی میں کیا آئی کہ باہر نکل گیا۔ اور پھر نہ پلٹا۔ کھیتوں کے رکھوالے لڑکوں نے بیان کیا کہ بجلی کی چمک میں کوئی شخص اس رات شہر کی طرف جاتا دکھائی دیا تھا۔ مچھیروں نے بھی ذکر کیا کہ دور سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص لالو اور بنواری کو پکار رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی آواز ندی کے شور میں گم ہو گئی۔"

یہاں پہنچ کر جھنڈو خاں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ گلا بالکل بیٹھ گیا۔ حقہ الگ کر کے رکھ دیا۔ ایک سرد آہ کھینچی اور کہا بیٹا! یہ ہے اندھی پگلی برکت بی بی۔ چوہدری فتح خاں کی بیوی۔ لال دین کی ماں۔ گاؤں کے عزت دار گھرانے کی بیٹی اور عزت دار گھرانے کی بہو۔ آج دنیا میں اس کا کوئی نہیں! اتنا کہا اور جھنڈو خاں دیوار کے ساتھ لگ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

سلیم! یہ تھی مائی برکت کی داستان! میں سمجھتا ہوں کہ تم کہہ دو گے کہ فتح خاں کو کس نے کہا تھا کہ چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلائے۔ کیوں اتنا خرچ کیا جو بعد میں یوں مصیبت بھگتنی پڑی۔ تمہارا کہنا درست ہے! لیکن بھائی! وعظ کہہ دینا آسان ہے ذرا سوچو تو سہی۔ تمہارے شہروں میں آئے دن ہسپتال کھلتے ہیں حالانکہ غور کرو تو نوے فی صدی بیمار ایسے آتے ہیں جن کے متعلق تم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہو کہ اگر پرہیز کرتے تو بیماری کیوں بڑھتی۔ اگر احتیاط برتتا تو یہ حالت کیوں ہوتی۔ یعنی ان نوے فی صدی بیماریوں میں لوگوں کی جہالت ذمہ دار ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود تم ان کے علاج کا انتظام کرتے ہو۔ یہ کہہ کر نہیں چھوڑ دیتے کہ جاؤ۔ اپنی جہالت کا خمیازہ بھگتو۔ یہی حالت گاؤں والوں کی جہالت کی ہے۔ وہ جہالت سے یہ کچھ کر لیتے

ہیں۔ لیکن سوچو کہ ان کی اس جہالت کے نتائج و عواقب کا مداوا بھی تم لوگوں نے سوچا ہے! اوّل تو ان کی جہالت بھی اس لئے ہے کہ تم نے اسے رفع کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔ اس لئے غور کرو کہ اس کے ذمہ دار بھی تم ہی ہو۔ پھر تم جب جسمانی بیماروں کی جہالت کے نتائج کی چارہ سازی میں یوں دوڑ دھوپ کرتے ہو تو کیا ان ذہنی بیماروں کی جہالت کے عواقب کے متعلق اتنا کہدینے سے بری الذمہ ہو سکتے ہو کہ انہوں نے ایسی جہالت کیوں برتی؟ یاد رکھو سلیم! جب تک تم شہر والے ان انسانوں کو بھی اپنے جیسا نہ سمجھو گے جو تمہارے رزق کا ذریعہ ہیں، اس وقت تک تمہاری قوم کی حالت نہیں سنور سکتی۔ تمہارا تغافل مجرمانہ ہے۔ اور تمہارا تسامح ہولناک نتائج کا ذمہ دار۔ لیکن تم شہریوں کو اتنی فرصت کہاں کہ ان باتوں کی طرف دھیان دے سکو!

لیکن شہر اور گاؤں کی کیا تمیز! خود شہروں کے اندر غریبوں پر جو کچھ بیت رہی ہے وہ گاؤں والوں سے کیا کم ہے؟ یہ سارا رونا تو اس معاشرے کا ہے جو غلط بنیادوں پر اٹھا ہوا ہے اور جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے اپنا کوئی رشتہ ہی نہیں سمجھتا۔ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ تمام انسان ایک ہی عالمگیر برادری کے افراد اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں تو پھر ہمارا نقشہ ہی کچھ اور ہو جائے۔ لیکن یہ تصور اور اس کی عملی تشکیل قرآن کے بغیر کسی اور صورت ممکن ہی نہیں!

اچھا۔ السلام علیکم
اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

سلیمؔ کے نام چھٹا خط

(طلاق کا قرآنی مفہوم)

سلیم! یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ تم نے نظری مباحث سے ہٹ کر اب عملی مسائل کے متعلق پوچھنا شروع کیا ہے۔ لیکن اس سے مجھے حیرت ہوئی کہ تم نے غزل کو مقطع سے شروع کر دیا۔ تمہیں پہلے نکاح کے متعلق پوچھنا چاہیئے تھا۔ پھر ازدواجی زندگی کے فرائض و حقوق کی بابت اور آخر میں طلاق کے متعلق۔ لیکن خیر! تم یوں بہتر سمجھتے ہو تو یونہی سہی۔ تم نے جن لغو روایات اور شرمناک رسومات کا ذکر کیا ہے وہ صرف رسوم و رواج ہی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ سن کر تمہیں تعجب ہو گا کہ انہیں تمہاری فقہ اور روایات کی سندات حاصل ہیں۔ کسی کا غصہ میں آکر طلاق۔ طلاق۔ طلاق کے "ایک دو تین" سے نیلام کنندہ کی طرح زندگی کی رفاقتوں کا مقدس رشتہ، اس طرح توڑ دینا اور اس کے بعد جب غصہ فرو ہو جائے تو پھر تمہاری خود ساختہ "شریعت" کا اس پر اصرار کہ بیوی کو ایک رات کے لئے کسی غیر مرد کے آغوشِ ہوس رانی میں دیکھنے کی بے حیائی کو گوارا کرنا ہو گا۔ اس قدر باعثِ ننگِ انسانیت اور وجہ ذلت آدمیت ہے کہ دنیا کی کسی شریف سوسائٹی میں اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ہمارے ہاں اسے شریعت مقدسہ کے احکام قرار دے کر اسلامِ مظلوم کی مٹی پلید کی جاتی ہے اور جب کسی سے اس کے خلاف کچھ کہا جائے تو ملحد و بے دین کی گالیاں سننی پڑتی ہیں۔ دیر کی بات ہے۔ میں چھٹیوں میں گاؤں گیا ہوا تھا۔ چندا تیلی نے غصہ میں آکر اپنی بیوی سے۔ "تین طلاق" کہہ دیا۔ تم اس کی بیوی کو جانتے ہو۔ بڑی نیک بخت۔ دودھ پوت، آل

اولاد والی۔ سر کے بال تک سفید ہو رہے تھے۔ چندا خود بھی بڑا بھلا مانس آدمی تھا۔ بات گاؤں بھر میں پھیل گئی۔ غصہ اترا تو چندا سخت محجوب و پشیمان تھا۔ اس کے جوان لڑکے اور لڑکیاں، بہوئیں سب گھر میں تھیں۔ مولوی چراغ دین (گھیروال) کے ہاں فتویٰ کے لئے گئے۔ انہوں نے کہدیا کہ طلاق بائن ہو گئی۔ اب حلالہ ضروری ہے۔ پوچھا کہ میاں جی حلالہ کیا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ چندا کی بیوی کو کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرنا ہوگا۔ اس شرط کے ساتھ کہ ایک شب کی ہمبستری کے بعد وہ اسے طلاق دیدے گا۔ اس کے بعد چندا پھر اپنی بیوی سے نکاح کر سکتا ہے۔ چندا کے گھر میں اس سے کہرام مچ گیا۔ اس کے بیٹوں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ اپنی ماں کی اس بے عزتی کے تصور سے اس درجہ مشتعل ہوئے کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ چندا کو مار ڈالیں گے۔ چندا بیچارا الگ شرم سے منہ چھپائے پھر رہا تھا۔ سب سے بُرا حال اس کی بیوی کا تھا۔ اس نے یہاں تک کہدیا کہ غصہ میں آکر قصور تو چندا نے کیا اور اس بڑھاپے میں مٹی میری خراب کی جا رہی ہے۔ یہ خدا کا حکم کیسا ہے؟ سلیم! یہ بات واقعی کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ خدا کا یہ حکم کیسا ہے! لیکن چونکہ مولوی چراغ دین نے کہدیا تھا کہ یہی خدا رسول کا حکم ہے اس لئے کس کی مجال تھی کہ اس سے انکار کرتا۔ اور مولوی چراغ دین بھی سچا تھا۔ اسے پڑھایا ہی یہی گیا تھا۔ وہ بیچارا کیا کرتا۔

سلیم۔ قرآن کے اعجاز پر غور کرو۔ جہاں اس میں سب سے پہلے طلاق کے احکام بیان ہوئے ہیں وہاں یہ ٹکڑا بھی موجود ہے کہ

ولا تتخذوا آیات اللہ ھزوا (۲/۲۳۱)

دیکھنا۔ احکامِ خداوندی کا مذاق نہ اُڑانا

سوچو کہ ہمارے ہاں کس طرح احکامِ خداوندی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے! قرآن میں سلیم! جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ بہت تھوڑے احکام ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی دیدی گئی ہیں۔ باقی سب احکام بطور اصول مذکور ہیں۔ جن احکام کی جزئیات بھی قرآن ہی نے متعین کر دی ہیں، وہ بیشتر عائلی زندگی سے متعلق ہیں۔ اس سے تم اندازہ کرو کہ عائلی زندگی

انسانی نظام حیات میں کس قدر اہمیت رکھتی ہے! حقیقت یہ ہے کہ عائلی زندگی، چھوٹے پیمانے پر ملکی نظام کا عکس ہے گھر کیا ہے؟ ایک چھوٹی سی ریاست جس میں بزرگ خاندان حاکم اعلیٰ ہے۔ اس میں مجلس مشاورت بھی ہے اور مجلس عمل بھی۔ ذمہ داریاں بھی ہیں اور حقوق بھی۔ تادیب و تربیت بھی ہے اور نظم و ضبط بھی۔ یہ ریاست میاں بیوی کی باہمی رفاقت سے چلتی ہے جس کے لئے ان کا ہم آہنگ اور متحد الخیال ہونا لاینفک ہے۔ اگر ان میں وحدتِ خیال اور اشتراکِ عمل نہیں تو اس ریاست میں فساد برپا ہو جائے گا اور اس کے مضر عواقب ملت کی اجتماعی زندگی تک اثر انداز ہوں گے۔

لہٰذا نکاح نام ہے ان مشترکہ ذمہ داریوں کے سنبھالنے کا باہمی معاہدہ جس کی بنیاد تراضی مابین پر ہے۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ میاں بیوی میں بعض وجوہات کے باعث ہم آہنگیٔ خیال و عمل نہ رہے اور اس عدم اشتراک و توافق کی وجہ سے عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہو رہا ہو۔ تو قرآن نے اس معاہدہ کے فسخ کر دینے کی بھی اجازت دی ہے۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن نے جس معاہدہ کی توثیق پر اتنا زور دیا ہے اور اس کی ایفاء کی اس قدر اہمیت بتائی ہے وہ اس کی تنسیخ بچوں کا کھیل نہیں بنائے گا۔ اس کے لئے اس نے ایسی شرائط و حدود متعین کی ہیں کہ جب تک انہیں پورا نہ کیا جائے یہ معاہدہ فسخ نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے ان شرائط و قیود کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ ان تفاصیل پر غور کرنے سے سلیم! یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کا مقصود یہ ہے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے سفرِ زندگی کی رفاقت کا یہ معاہدہ ٹوٹنے نہ پائے۔ وہ انسانی طبیعت کی کمزوریوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ انسان بعض اوقات شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا فیصلہ کر بیٹھتا ہے۔ جس پر بعد میں خود ہی متأسف و پشیمان ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کا وہ غلط فیصلہ ناطق نہ قرار پا جائے۔ قرآن نے اس کی رعایت رکھی ہے اور فیصلہ اور اس کے نفاذ میں اتنا وقفہ رکھا ہے کہ انسان خالی الذہن اور جذبات سے الگ ہو کر ٹھنڈے دل سے اس فیصلہ پر نظر ثانی کر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن اس توثیق و تنسیخ معاہدہ کو بازیچۂ اطفال بھی بنانا نہیں چاہتا کہ انسان عمر بھر یہی کھیل کھیلتا رہے۔ ان مبادیات کو سامنے رکھو اور پھر سلیم! قرآن کی حدود و شرائط پر غور کرو۔ بات واضح ہو جائے گی کہ قرآن کی رو سے طلاق کس طرح سے عمل میں آتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، زندگی کی کشتی کو بخیر و خوبی ساحل تک لیجانے کے لئے میاں اور بیوی کی باہمی رفاقت اور اشتراکِ عمل ضروری ہے۔ لیکن اگر میاں اور بیوی کے تعلقات ایسی کشیدگی اختیار کر جائیں کہ بیوی رفاقت کی جگہ سرکشی پر اُتر آئے تو پھر اس کی طرف خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت پڑ جائے گی۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ہے کہ واللّٰتی تخافون نشوزھن (۴/۳۴) "جن بیویوں[1] سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو تو ان کے متعلق کیا کرو؟ یہ نہیں کہ محض اس اندیشہ کی بنا پر (یا ان کی کسی حرکت سے غصہ میں آکر) فوری تعلقات منقطع کر لو۔ بلکہ فعظوھن، انہیں نرمی اور محبت سے سمجھاؤ۔ اگر وہ اس پر بھی سرکشی سے باز نہ آئیں تو واھجروھن فی المضاجع، خوابگاہ میں اُن سے الگ رہنے لگو۔ ذرا غور کرو سلیم! اگر عورت نیک سرشت اور شریف النفس ہوگی تو اس کے لئے یہ تنبیہ بہت کافی ہوگی۔ لیکن اگر حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ وہ اس پر بھی سرکشی سے نہ رُکے تو اس کی بھی اجازت ہے کہ اس پر ذرا سختی کی جائے (واضربوھن۔ تم انہیں مار بھی سکتے ہو) اس مقام پر تمہارے دل میں جو خیالات پیدا ہوں گے، اُن کا مجھے احساس ہے۔ تم یقیناً کہو گے کہ یہ تو بڑی بربریت ہے کہ عورتوں کو پیٹنا شروع کر دیا جائے۔ واقعی یہ بہت بُری بات ہے کہ مرد اُٹھ کر عورت کو پیٹنا شروع کر دے۔ لیکن تمہارے دل میں یہ خیال اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے سمجھ لیا ہے کہ یہ انفرادی احکام ہیں۔ یعنی ہر مرد کو اجازت ہے کہ وہ خود بیوی کو سزا دیدے۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ یہ احکام معاشرہ کے لئے ہیں۔ افراد کے لئے نہیں۔ یعنی اس قسم کے معاملات اربابِ حل و عقد (عدالت یا پنچایت) کے سامنے پیش ہوں گے، اور وہ قانون کی رو سے اُن کا فیصلہ کریں گے۔ یعنی عدالت سے یہ فیصلہ سرزد ہوگا اور وہی سزا دینے کی مجاز ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھو کہ قانون کی رو سے جو صورت عورت کی ہے وہی مرد کی بھی ہے۔ اس کے بعد ہے کہ فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا، اگر وہ اس پر روبہ صلاح ہو جائیں اور تمہارا کہنا مان لیں تو پھر تم خواہ مخواہ الزام دینے کی راہیں نہ تلاش کرتے پھرو۔ یاد رکھو ان اللہ کان علیا کبیرا اللہ کا قانون سب کے اوپر اور سب سے بڑائی رکھنے والا ہے۔" لیکن اگر اس پر بھی بات نہ بنے اور باہمی تعلقات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے جائیں تو پھر عدالت کے لئے ضروری ہے کہ معاملہ کی تفصیلی تحقیق کر کے دیکھے کہ یہ تعلقات قائم رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کے لئے فرمایا (وان

---

[1] ان آیات میں "میاں بیوی" کے بجائے عام مردوں اور عورتوں کے متعلق احکام بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کی تشریح دوسرے مقام پر کی جائے گی۔

خفتم شقاق بینھما۔ اگر تمہیں خدشہ ہو کہ میاں بیوی میں تفرقہ پڑ جائے گا تو وابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا۔ تو تمہیں چاہیئے کہ ایک حَکَم شوہر کے کنبے سے مقرر کرو اور ایک بیوی کے کُنبے سے ان یریدا اصلاحًا یوفق اللہ بینھما۔ اگر یہ پنچ (دل سے) کوشش کریں گے کہ میاں بیوی میں صلح صفائی کرا دیں تو اللہ میاں بیوی میں موافقت کے سامان پیدا کر دے گا۔ لیکن اگر یہ حکم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ پانی سر سے گزر چکا ہے اور حالات اس درجہ کشیدگی اختیار کر چکے ہیں کہ میاں بیوی کی باہمی موافقت ناممکن ہے۔ تو اس کے بعد عدالت علیحدگی کا فیصلہ کر دے گی۔ جسے طلاق کہتے ہیں۔

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ طلاق تک پہنچنے کے لئے کن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ شرائط طلاق کے مبادیات میں سے ہیں اور طلاق ہو نہیں سکتی جب تک پہلے ان شرائط کو پورا نہ کیا جائے۔ یعنی پہلے نرمی اور سختی سے اصلاحِ حال کی کوشش کی جائے گی اور اس کے بعد ثالثوں کی رپورٹ کے بعد عدالت فیصلہ کرے گی کہ باہمی موافقت کی صورت نکل سکتی ہے۔ یا طلاق کے سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔ اگر فیصلہ یہ ہو کہ طلاق ناگزیر ہے تو اس کی صورت حسب ذیل ہوگی۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس فیصلہ کے بعد کہ طلاق ناگزیر ہے، طلاق کب دینی چاہیئے۔ سورۂ طلاق میں ہے۔

یا ایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن... (٦٥/١)

اے نبی جب تم (لوگ) عورتوں کو طلاق دو تو انہیں عدت کی مدت پورا کرنے کے لئے طلاق دو۔

یہاں سے ظاہر ہے کہ طلاق ایسے وقت میں دینی چاہیئے جہاں سے عدت کا شمار ہو سکے (عدّت کسے کہتے ہیں اس کا ذکر آگے چل کر آتا ہے) عدت کس قدر ہے اس کے متعلق فرمایا۔

(١) والمطلقت یتربصن بانفسھن ثلٰثۃ قروء (٢/٢٢٨)

اور مُطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔

(۲) والّٰئِ یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلٰثة اشھر والّٰئِ لم یحضن (۶۵/۴)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے نا امید ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہے تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور اُن کی بھی جنہیں حیض نہ آسکتا ہو۔

(۳) واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن (۶۵/۴)

اور حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔

یعنی عدت۔

(۱) ان عورتوں کے لیے جنہیں حیض آتا ہو، تین حیض کا زمانہ

(۲) جنہیں حیض نہ آسکتا ہو (بوجہ کبر سنی یا بیماری) تین ماہ، اور

(۳) حاملہ کے لئے وضع حمل تک کا زمانہ

صورتِ اوّل میں ظاہر ہے کہ چونکہ عدت کا زمانہ ماہواری ایام کے شمار سے ہوگا اس لئے عدت کی ابتدا حیض کے بعد سے ہوگی۔ اگر عدت حیض سے پہلے یا دورانِ حیض میں شروع ہو گئی (اور اگر وہ حیض گنتی میں لے لیا تو) تین حیض کا زمانہ، تین ماہ سے بہت کم رہ جائے گا۔ (اور اگر وہ حیض نہ شمار کیا تو) ایام عدت میں چار حیض ہو جائیں گے۔ اس لئے اس کی صحیح صورت یہی ہے کہ عدت کا شمار حیض کے فوری بعد سے شروع ہو۔ لہذا حائضہ کی صورت میں طلاق، حیض کے بعد، حالتِ طُہر میں دی جائے گی۔ اس میں علاوہ دیگر مصالح کے، ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر اس دوران میں حمل قرار پا گیا ہے تو اس کا علم ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ طبائع میں تبدیلی پیدا کرنے کا موجب بن جائے اور طلاق کا فیصلہ ٹال دیا جائے اور اس کے بعد بچہ ہونے کی صورت میں ایک نئی ازدواجی زندگی کی خوشگواری تعلقات میں موافقت پیدا کر دے۔ دیکھو سلیم! قرآن نے کس طرح چلتے چلتے بھی ایک ممکن الوقوع تبدیلی سے اصلاحی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے کہ اس کا مقصد اتصال ہے، انقطاع نہیں۔ ملاپ ہے، تفرقہ نہیں۔

لہذا، حائضہ کی صورت میں طلاق کا وقت، بعد حیض بحالتِ طہر ہے۔ البتہ دوسری صورتوں میں یہ شرط نہیں عائد کی جاسکتی۔

چنانچہ، جب دل کے پورے سکون اور دماغ کے کامل ہوش کے ساتھ عدالت کی وساطت سے یہ فیصلہ کرلیا کہ یہ تعلقات کسی صورت میں بھی نبھ نہیں سکتے تو معاہدۂ نکاح کے کالعدم کردینے کا اعلان کردیا جائے گا۔ اسے طلاق کہتے ہیں۔ بس یہ طلاق ہوگئی۔ اس کے بعد نکاح ختم ہوگیا۔ میاں بیوی عقد کی بندشوں سے آزاد ہوگئے کہ طلاق کے معنی ہی بندشوں سے آزاد ہوجانے کے ہیں۔ رجعیؔ، بدعیؔ، بائنؔ وغیرہ طلاق کی قسمیں سب ہماری پیدا کردہ ہیں۔ قرآن میں طلاق کی ایک ہی قسم ہے جس طرح نکاح کی ایک قسم ہے۔ معاہدہ یا قائم رہتا ہے یا فسخ ہوجاتا ہے۔ ان کے بین بین کوئی اور شکل نہیں ہوتی۔ اب اس عورت کے ساتھ اس مرد کا نکاح باقی نہیں رہا۔

اب کیا ہوگا۔ اب عدت کا زمانہ شروع ہوگیا۔ تم پوچھو گے کہ عدت کیا ہوتی ہے؟ عدت اس مدت کو کہتے ہیں جس میں یہ مطلقہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔ لیکن یہی (سابقہ) میاں بیوی پھر چاہیں تو اس دوران میں باہمی نکاح کرسکتے ہیں۔ یہ بالکل اسی قسم کا نکاح ہوگا جیسا عام حالات میں (نیا) نکاح ہوتا ہے۔ ان ہی شرائط و قیود کے ساتھ جو قرآن نے نکاح کے لئے مقرر کی ہیں (ان کی تفصیل سلیم! اس وقت بتاؤں گا جب تم اپنی غزل کو مطلع سے شروع کرو گے) تم نے دیکھا سلیم! قرآن انسانی کمزوریوں کی کس قدر رعایت رکھتا ہے۔ یہ عدت کا وقفہ کیسا عجیب مہلت کا وقفہ ہے جس میں ایک دوسرے سے الگ ہوکر اس نئی زندگی کے تجربات سامنے آجاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہی تجربات انہیں وابستگیٔ تعلقات پر پھر آمادہ کردیں۔ اور ان کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جُڑ جائے۔ اسی لئے فرمایا کہ وبعولتھن احق بردھن فی ذالک ان ارادوا اصلاحًا (۲/۲۲۸) " اس (زمانہ عدت) میں اُن کے خاوند اُنہیں واپس لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں"۔ لیکن اگر اس زمانۂ عدت میں بھی انہوں نے تجدید نکاح نہ کی تو اس کے بعد عورت آزاد ہوگی کہ چاہے اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کرلے، چاہے کسی اور سے۔ اس آخری منزلِ انقطاعِ تعلقات کے وقت بھی دو گواہوں کی موجودگی کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ بات

چھپی نہ رہے کہ عورت اب جدید نکاح کے لئے آزاد ہے۔ واشھدوا ذوی عدل منکم (۶۵/۲)

اگر اس میاں بیوی نے عدت کے دوران میں، یا اس کے بعد باہمی نکاح کر لیا تو انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی میں طلاق کے ایک (Chance) کو (Avail) کر لیا۔ (ان الفاظ سے سلیم! تم مفہوم کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکو گے) اب اگر ان کی نئی زندگی میں، پھر وہی کشیدگی کے حالات رونما ہو گئے تو پھر اس طریق کے مطابق جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، باہمی طلاق ہو سکتی ہے۔ اس طلاق کے بعد بھی یہ امکان باقی رہتا ہے کہ عدت کے زمانہ میں یا اس کے بعد، یہ پھر باہمی تجدید نکاح سے ازدواجی رشتہ استوار کر لیں۔ اگر انہوں نے دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد پھر نکاح کر لیا تو ان کے دو (Chances) ختم ہو گئے.

الطلاق مرتٰن فامساك بمعروف او تسريح باحسان (۲/۲۲۹)

طلاق دو مرتبہ (ایسی ہوتی ہے کہ جس میں) چاہے بطریق معروف اس عورت کو رکھ لیا جائے یا بحسنِ سلوک اسے رخصت کر دیا جائے۔

اب دوسری مرتبہ کی طلاق (اور تیسری مرتبہ کے نکاح) کے بعد انہیں (Warn) کر دیا جاتا ہے کہ یہ کھیل بار بار نہیں رچائی جا سکتی۔ زندگی، مذاق نہیں، سنجیدہ حقیقت کا نام ہے۔ اب بھلے مانسوں کی طرح زندگی کی کشتی کو کنارے تک لیجاؤ۔ اگر اس مرتبہ بھی تم نے آپس میں نباہ کی صورت پیدا نہ کی اور پھر رشتہ مناکحت کو منقطع کر لیا۔ تو یاد رکھو اس تیسری بار کی طلاق کے بعد، یہ عورت تمہارے نکاح میں نہیں آ سکے گی۔ نہ دورانِ عدت میں، نہ اس کے بعد۔ اس لئے اب کے جو فیصلہ کرو، ذرا سوچ سمجھ کر کرنا۔

فان طلقها فلا تحل له من بعد (۲/۲۳۰)

اگر تیسری بار طلاق دیدی تو پھر یہ عورت اس مرد کے لئے جائز نہیں رہے گی.

یہ ہو گئی تیسری طلاق۔ اس جوڑے نے اپنی ازدواجی زندگی میں وصل و فصل کے سب (Chances) (یعنی تینوں مواقع) (Avail) کر لئے۔

اب یہاں سلیم! سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا یہ عورت اس مرد کے لئے ابدالآباد تک حرام ہوگئی؟ قرآن کہتا ہے کہ ایسا نہیں۔ اگر اس عورت نے کسی اور مرد سے نکاح کرلیا اور وہ نکاح بھی کامیاب ثابت نہ ہوا اور نوبت طلاق تک آگئی (اسی طرح طلاق جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے) تو اگر وہ عورت زمانۂ عدت کے بعد اس پہلے خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے۔ اوپر کی آیت یوں مکمل ہوتی ہے۔

فلا تحل لہٗ من بعد حتی تنکح زوجاً غیرہ - فان طلقها فلا جناح علیهما ان
یتراجعا ان یقیما حدود اللہ (۲/۲۳۰)

تیسری طلاق کے بعد یہ عورت اس خاوند کے لئے جائز نہیں ہوگی الا اس کے کہ اگر وہ کسی اور مرد سے نکاح کرلے اور وہ اسے طلاق دیدے تو اس صورت میں ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی طرف پھر رجوع کرلیں بشرطیکہ انہیں یقین ہو کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے:

یہ ہے سلیم! وہ آیۂ مقدسہ جس سے حلالہ کا مسئلہ وضع کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے تو طلاق کی یوں ہنسی اُڑائی کہ جوں ہی کسی شخص نے غصہ میں آکر کہدیا تین طلاق (یا طلاق۔ طلاق۔ طلاق) تو یہ وہ طلاق ہوگئی جس کے بعد یہ عورت اس وقت تک اپنے خاوند کے لئے حلال نہیں ہوسکتی جب تک وہ کسی دوسرے مرد سے شادی نہ کرے۔ پہلے تو احکام خداوندی کے استہزاء سے یہ مصیبت اپنے گلے ڈال لی۔ پھر مصیبت کا لگے حل تلاش کرنے۔ اب حل یوں ڈھونڈا گیا کہ کسی شخص کو تیار کیا جائے کہ وہ اس عورت سے ایک رات کے لئے شادی کرلے اور ایک شب کی ہمبستری کے بعد اسے دوسری صبح طلاق دیدے۔ اس کے بعد یہ عورت اپنے پہلے خاوند سے نکاح کرلے۔ سلیم! سوچو! کہ دنیا کی کسی قوم میں اس سے بڑھ کر شرمناک حرکت بھی ہوسکتی ہے! کیا اس نکاح کو نکاح کہا جاسکتا ہے؟ یہ نکاح کا مذاق ہے۔ یہ کھلی ہوئی حرامکاری ہے۔ یہ خدا کے احکام سے استہزاء ہے۔ خدا کے احکام سے کیا خود اپنی ذات سے استہزاء ہے۔ تم حیران ہوگے کہ اس بدبخت قوم میں پیشہ ور حلالہ کرنے والے بھی موجود ہوتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ وہ کس کس قسم کی شرائط منواتے ہوں گے؟ سلیم! مجھے تو تم سے

یہ باتیں کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لیکن جب تم نے بات پوچھی ہے تو مجھے بتانا ہی پڑے گی۔ اور تمہیں بھی یہ بے حیائی کے تذکرے سننے ہی پڑیں گے۔ اور ابھی تو میں نے تمہیں حلالہ کی تفصیلات نہیں بتائیں۔ وہ نہ میں بتا سکوں گا نہ تم سن سکو گے۔

بہرحال سلیم! یہ ہے قرآن کی رو سے طلاق۔ اچھا ہوا تم نے بات پوچھ لی اور یوں اس باب میں قرآنی احکام سامنے آ گئے۔ تم دیکھو گے کہ اس بارے میں مسلمان کس قدر جہالت میں گھرے ہوئے ہیں۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے، قرآن کے مطابق طلاق مجھے کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ کہیں ایک ہی مرتبہ ایک، دو یا تین سے تینوں طلاقیں پوری کر دی جاتی ہیں اور کہیں تین مہینوں (عدت کے زمانہ) میں، ایک ایک ماہ کے بعد، تین طلاقیں مکمل ہو جاتی ہیں۔ یہ فقہ اور روایات کی طلاق ہے۔ قرآن کی نہیں۔ اور قرآن کا مسلمانوں کے ہاں باقی ہی کیا ہے؟ یہ تو خدا کا احسان ہے (اور یہ اس لئے کہ اس نے دین کو مکمل کر دیا ہے) کہ قرآن اپنی اصلی شکل میں ہمارے ہاں موجود ہے جس کی وجہ سے اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ ہم دیکھ سکیں کہ ہمارا کون کونسا عمل قرآن کے مطابق اور کون کونسا کام اس کے خلاف ہے۔ ورنہ کوئی صورت ہی نہ تھی کہ ہم آج یہ معلوم کر سکتے کہ اسلام کی صحیح شکل کیا تھی۔ قرآن اپنی اصلی شکل میں محفوظ نہ ہوتا تو آج نہ میں یہ کچھ بتا سکتا، نہ تم سن سکتے۔

باقی مذاہب کے ساتھ یہی ہوا ہے نا کہ ان کی آسمانی کتابیں اپنی اصلی شکل میں کہیں موجود نہ رہیں۔ اس لئے وہ آج اس قابل ہی نہیں کہ یہ بتا سکیں کہ وہ کہاں کہاں غلطی کر گئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ وہ مذہب کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ بہرحال یہ داستان الگ ہے۔ جو بات تم نے پوچھی وہ اوپر آ چکی ہے۔

ایک بات سلیم! اور رہ گئی۔ اوپر کے احکام سے یوں مترشح ہوتا ہے گویا طلاق کا حق صرف مرد کو دیا گیا ہے اور عورت بیچاری مجبور ہے کہ جو فیصلہ مرد کرے اسے تسلیم کر لے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ قرآن نے احکام کو

اس شکل میں بیان کرنے کے ساتھ ہی فرما دیا کہ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (۲/۲۲۸) "عورتوں کے لئے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں۔ جس طرح کے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں" یہ ایک ایسا کلیہ اور اصول جامع بیان کر دیا گیا ہے جس کے اندر وہ تمام تفاصیل سمٹ کر آگئی ہیں جو نکاح و طلاق کے متعلق مردوں کو مخاطب کر کے بیان ہوئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن حالات کے ماتحت، جن جن شرائط کے مطابق، ایک خاوند اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ ان ہی حالات و شرائط کے مطابق ایک عورت اپنے خاوند سے طلاق لے سکتی ہے جب معاہدۂ نکاح میں عورت کو رد و قبول کا پورا پورا حق ہے تو اس معاہدہ کی تنسیخ میں اسے کیوں حق نہیں ہے؟ طلاق کی صورت میں مرد سے کہا گیا ہے کہ مہر و متاع کی ہر شے عورت کو دینی ہوگی۔ لیکن مرد کا چونکہ کوئی مہر نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے بدلے میں عورت سے کہا گیا کہ اسے طلاق کے لئے اپنے حق میں سے کچھ چھوڑنا ہوگا۔

اب تمہاری آخری بات باقی رہ گئی کہ اگر ایک شخص غصہ کی حالت میں ایسے الفاظ کہدے یا قسم کھالے جس سے میاں بیوی کے تعلقات زناشوئی میں فرق آجاتا ہو تو اس کے متعلق کیا کیا جائے۔ قرآن میں ہے۔

لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم۔ واللہ غفور حلیم (۲/۲۲۵)

تمہاری قسموں میں جو لغو اور بے معنے ہوں گی اُن پر اللہ پکڑ نہیں کرے گا۔ جو کچھ بھی پکڑ ہوگی تو وہ اس بات پر ہوگی جو (تم نے سمجھ بوجھ کر کی ہے اور اس لئے) تمہارے دلوں نے (اپنے قصد و ارادہ سے) کمائی ہے۔ اللہ غفور و حلیم ہے

یعنی جو قسم بلا قصد و ارادہ کھالی جائے اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ یہ لغویت ضرور ہے جس سے اجتناب کرنے کا حکم قرآن میں آیا ہے۔ باقی رہیں وہ قسمیں جو دل کے ارادہ سے کھائی ہوں لیکن بعد میں انسان اُن پر متاسف ہو اور چاہے کہ اُن سے رجوع کرے۔ تو اُن کے متعلق دوسری جگہ کفارہ کا حکم ہے۔ یعنی کچھ تاوان دے کر اپنی حماقت کا

خمیازہ بھگتے (دیکھو ۵/۹) لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کے (مثلاً) مقاربت کے بارے میں قسم کھالے اور اس کے بعد اس پر نادم و متاسف بھی نہ ہو۔ تو اس سے بیوی معلّق حالت میں رہ جائے گی۔ اس حالت کو غیر معین عرصہ تک کے لئے روا نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ

للذین یؤلون من نساءھم تربص اربعة اشھر فان فاؤ فان اللہ غفور الرحیم
وان عزموا الطلاق فان اللہ سمیع علیم (۲/۲۲۶)

جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے کی قسم کھالیں تو ان کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے۔ پھر اگر وہ اس مدت کے اندر رجوع کرلیں تو اللہ رحمت سے بخشنے والا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے اور) وہ طلاق کی ٹھان لیں تو (یہ سمجھ رکھو کہ) اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔

یعنی ایسی صورت میں چار ماہ کے اندر فیصلہ کرنا ہوگا کہ تمہارا باہمی نباہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر تم اپنے کیے پر پچھتاؤ، تو قسم کا کفارہ ادا کرکے باہمی ملاپ کرلو۔ لیکن اگر معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا ہو اور ملاپ کی صورت نظر نہ آتی ہو تو پھر وہ تمام شرائط پوری کرکے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، اپنے ازدواجی معاہدہ کو ختم کردو۔

* * *

اس چیز پر بھی تم نے سلیم! غور کیا ہو گا کہ قرآن نے وجوہِ طلاق کو متعین نہیں کیا۔ عیسائیت، (انجیل) صرف زنا کی صورت میں طلاق کی اجازت دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میاں بیوی، خواہ کسی وجہ سے الگ ہونا چاہیں انہیں زنا ثابت کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ صورتِ حالات جس قدر خرابیوں کا موجب بن سکتی ہے، ظاہر ہے۔ ان ہی دقتوں کی بنا پر اب عیسائی حکومتوں نے طلاق کے مذہبی قانون کو چھوڑ کر "دنیاوی قانون" الگ بنائے ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہ حدود و شرائط نہیں جو قرآن نے متعین کی ہیں۔ دوسری طرف ہندوؤں کو لیجئے تو ان کے ہاں مذہباً طلاق جائز ہی نہیں۔ اس لئے اب انہیں بھی اپنے مذہب کو چھوڑ کر طلاق کے لئے الگ راہیں تلاش کرنی پڑ رہی ہیں۔ تیسری طرف مسلمانوں کو دیکھئے کہ انہیں اُن کے خدا کی طرف سے ایسے عمدہ احکام ملے ہیں لیکن

انہوں نے فقہ اور غلط روایات کے انسان ساز قوانین اختیار کر کے اپنے آپ کو خود جہنم میں ڈال رکھا ہے۔ ان سب خرابیوں کا علاج، سلیم! ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم تمام دوسرے قوانین و رسوم سے منہ موڑ کر صرف اس قانون کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائیں جو خدائے احکم الحاکمین نے ہمارے لئے متعین کیا ہے اور یہی اصلِ دین ہے۔

* * *

جاتے جاتے تمہیں ایک دلچسپ واقعہ سناؤں۔ تمہیں یاد ہو گا کہ ایک مرتبہ ہندوستان کی اسمبلی میں ایک مسودۂ قانون پیش ہوا تھا جسے ساردا بل کہتے تھے اور جس کی رو سے نابالغان کی شادی ممنوع قرار دی جاتی تھی۔ یہ بل ایک ہندو کی طرف سے پیش ہوا تھا جن کی مقدس مذہبی کتابوں میں نابالغان کی شادی کی اجازت ہی نہیں بلکہ اسے مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہ سن کر، سلیم! تمہاری حیرت کی انتہا نہ رہے گی کہ اس موقع پر مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں کے نمائندے اس مسئلہ پر متحد ہو گئے تھے (کس قدر بوالعجبی ہے کہ ان فرقوں کا حق پر کبھی اتحاد و اجماع نہیں ہوتا۔ اور اگر کبھی یہ باہمی متفق ہوئے تو اس مسئلہ پر کہ بچوں کی شادی کو جائز قرار دیا جائے) چنانچہ ان کے ایک عظیم وفد نے وائسرائے کے ہاں شرفِ باریابی حاصل کیا تھا۔ کس قدر حسرتناک تھا، سلیم! یہ منظر کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کے نمائندے (یعنی حضرات علمائے کرام)، ایک غیر مسلم حاکم سے استدعا کر رہے ہیں کہ وہ نابالغوں کی شادی کو ناجائز قرار نہ دے کیونکہ یہ مداخلت فی الدین ہو گی۔ ہر قلبِ حساس کی آنکھ اس منظر پر خوں فشاں تھی۔ بعض حضرات نے جو فرقہ پرستی کی لعنت میں گرفتار نہ تھے، دریافت کیا کہ نابالغ کے نکاح کے جواز میں کوئی قرآنی سند بھی موجود ہے؟ جواب ملا کہ ہاں موجود ہے! سلیم! تم حیران ہو گے کہ نابالغوں کے نکاح کے جواز میں قرآنی سند کیسے مل سکتی ہے؟ نکاح تو ایک بہت بڑا اور اہم معاہدہ ہے، اور بچوں کا معاہدہ کیسا! لیکن سنو کہ وہ سند کیا تھی۔ عدت کے ضمن میں تم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے کہا ہے۔

والّٰئی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلثۃ اشھر والّٰئی لم یحضن

(۶۵/۴)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں اگر تمہیں شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے اور

ان کی بھی جنہیں حیض نہ آسکتا ہو۔

انہوں نے کہا کہ سند یہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ جن عورتوں کو حیض نہ آیا ہو (لم یحضن) ان کی عدت تین ماہ ہے "وہ عورتیں جنہیں حیض نہ آیا ہو" نابالغ لڑکیاں ہی ہو سکتی ہیں۔ سو جب اُن کی عدت کا ذکر ہے تو ان کا نکاح بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن نے سلیم! "لم یحضن" فرمایا ہے جس کے معنی "حیض نہ آیا ہو" نہیں، بلکہ یہ کہ جنہیں حیض نہ آسکا ہو" یعنی بیماری کی وجہ سے یا کسی جسمانی نقص کے باعث (Constitutionally) حیض نہ آسکے۔ اور اگر سلیم! بفرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ قرآن نے نابالغ لڑکی کی عدت کی مدت بیان کی ہے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ نابالغ لڑکی کی شادی کی اجازت بھی دیتا ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ مقصود ہے کہ اگر ایسی صورت سامنے آجائے جس میں کسی نابالغ لڑکی سے شادی کر لی ہو تو اس میں عدت یوں گنی جائے گی جیسے قرآن میں ہے کہ جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز نہ پڑھو تو اس سے یہ نہیں ثابت ہو جاتا کہ قرآن شراب کی اجازت دیتا ہے۔ شراب ممنوع ہے لیکن قرآن نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی شخص اس امرِ ممنوع کا ارتکاب کر لے تو اس کے لئے نماز کا یہ حکم ہے۔

بہر حال سلیم! یہ تو ایک ضمنی گوشہ تھا اس کے متعلق تفصیلی بحث کبھی پھر سہی۔ اس وقت تم نے طلاق کے متعلق پوچھا تھا۔ سو میرا خیال ہے کہ قرآن کی رو سے طلاق کے احکام واضح ہو گئے ہوں گے۔ مختصراً پھر سن لو کہ اس کے لئے حسب ذیل شرائط لاینفک ہیں۔

(۱) میاں بیوی کے اختلاف کی صورت میں

(ا) باہمی افہام و تفہیم سے اصلاح حال کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

(ب) اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو عدالت (یا پنچایت)، طرف سے دو ثالثوں کا تقرر۔ اگر ثالث بھی اس میں کامیاب نہ ہوں تو پھر عدالت کی رو سے فیصلہ، کہ طلاق کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں۔

(۲) طلاق حیض کے بعد، حالتِ طہر میں دی جائے گی۔

(۳) اس فیصلہ کے بعد، نکاح کا معاہدہ ختم ہو جائے گا اور عدت کا زمانہ شروع۔

(۴) زمانۂ عدت میں عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکے گی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی رضامند ہوں تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔

(۵) عدت کے بعد، عورت آزاد ہے کہ جس مرد سے جی چاہے شادی کرے۔ خواہ اپنے پہلے خاوند سے یا کسی اور سے۔ پہلے خاوند سے بھی نکاح پوری شرائط کے ساتھ ہو گا۔

(۶) اس دوسرے نکاح کے بعد ان کی نئی ازدواجی زندگی شروع ہو گی۔

(۷) اگر پھر طلاق کی نوبت آجائے تو زمانۂ عدت میں، یا اس کے بعد بھی میاں بیوی دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ اب یہ دو مرتبہ کی طلاق ہو گئی

(۸) اس نکاح کے بعد، اگر پھر طلاق کی نوبت آجائے (جو تیسری مرتبہ کی طلاق ہے) تو پھر یہ میاں آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔ نہ زمانۂ عدت میں نہ عدت کے بعد۔

(۹) البتہ اگر اس عورت کو اس کے نئے خاوند سے ان ہی شرائط کے مطابق جو اوپر درج کی جا چکی ہیں، طلاق مل جائے یا وہ بیوہ ہو جائے تو پھر اس میں کوئی ہرج نہیں کہ یہ عورت اپنے پہلے خاوند سے شادی کر لے۔

(۱۰) طلاق کے متعلق جو حقوق و فرائض مرد کے ہیں وہی عورت کے ہیں عورت بھی اسی طرح مرد کے حلقۂ تزویج سے آزاد ہو سکتی ہے جس طرح مرد معاہدہ نکاح کو فسخ کر سکتا ہے۔ لیکن نہ یہ جس طرح جی میں آئے کر سکتا ہے نہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ اُسے بھی قرآنی شرائط و حدود کے مطابق عدالت سے طلاق حاصل کرنی ہو گی اور اسے بھی۔

سمجھ گئے سلیم! یہ ہے قرآنی طلاق جسے تم تو مان لوگے، لیکن کوئی مُلّا نہیں مانے گا۔ اس لئے کہ اُن کا مذہب خدا کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے۔ یہ انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور کہتے یہی ہیں کہ یہ منزل من اللہ ہے۔ یکتبون الکتاب بایدیھم ثم یقولون

ھٰذا من عند اللہ۔

والسلام

جنوری ۱۹۴۹ء

سلیم کے نام ساتواں خط

(اسلامی نظام کے بنیادی اصول)

تمہارا خط ملا۔ سچ پوچھو تو میں اس خط کا اس دن سے انتظار کر رہا تھا جس دن تمہیں طلوع اسلام کا وہ پرچہ بھیجا ہے جس میں "اسلامی نظام"[1] سے متعلق میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس لئے تم نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے وہ غیر متوقع نہیں اور نہ ہی وہ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ جو ان شبہات کا محرک ہوا ہے۔ سلیم! تم ابھی نہیں جانتے کہ جو عقیدہ کسی قوم میں صدیوں سے متوارث چلا آرہا ہو اور توارث اور ماحول کے اثرات سے انسانی تحت الشعور (Sub-conscious) کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا ہو، وہ کس طرح مبنی علی الحقیقت نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے اس قسم کے عقیدہ کی تائید میں دلائل و براہین بھی رکھتا ہو۔ لیکن یہ دلائل و براہین ذہن انسانی کے بعد کے تراشیدہ ہوتے ہیں اس نے اُس عقیدہ کو دلائل و براہین کی بنا پر اختیار نہیں کیا ہوتا۔ عقل کا منصب تحفظ ذات (Preservation of Self) ہے اور شکستِ پندار، خواہ وہ نظری اور علمی میدان ہی میں کیوں نہ ہو، انسان کی خفت کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے عقل، ہر اس عقیدہ کے لئے جو انسان نے غیر شعوری طور پر اختیار کر رکھا ہو، دلائل و براہین وضع کرتی رہتی ہے تاکہ فریق مقابل سے شکست کھا کر انسان کے اندر احساس کمتری (Inferiority Complex) نہ پیدا ہو جائے کہ احساس کمتری جذبۂ مرعوبیت کا موجب بنتا ہے اور جذبۂ مرعوبیت انسانی خفت کا سبب۔ اس لئے جب کبھی انسان کے سامنے کوئی ایسی بات آئے جس سے اس کے

---

[1] اب یہ مضمون الگ کتاب کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

کسی عقیدہ کی تغلیط ہوتی ہو تو عقل کی طرف سے پہلا ردعمل، اس نئے نظریئے یا اصول کی تردید ہوتا ہے۔ غیر شعوری طور پر اختیار کردہ عقائد کو منزہ عن الخطا سمجھ کر ان کے گرد حصارِ عافیت کھینچنے کی کوشش کا نام تقلید اعمیٰ ہے جو صحیح علم و بصیرت کی بدترین دشمن اور ہر دعوت الی الحق اور حرکتِ انقلاب کی اولین مخالف ہوتی ہے۔ آسمانی سلسلہ رشد و ہدایت کی تاریخ پر نگاہ ڈالیئے۔ ہر داعی الی اللہ کی دعوت حق و صداقت کے جواب میں یہی کہا گیا کہ جو عقائد ہمارے آبا و اجداد سے متوارث چلے آرہے ہیں ہم انہیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وکذٰلک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا وجدنا اٰباءنا علیٰ اُمۃ وانا علیٰ اٰثارھم مقتدون [۴۳/۲۳] "اسی طرح اے رسول عربی، ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا۔ مگر وہاں کے سہل انگار طبقہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک مسلک پر چلتے دیکھا ہے اور ہم ان ہی کے نقوشِ قدم پر چلتے ہیں"۔ لیکن سلیم! ذرا سوچو کہ کسی عقیدے کے صحیح ہونے کی یہ دلیل کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے۔ اگر تپِ دق کے جراثیم جو انسان کو اپنے اجداد سے وراثتاً ملے ہوں یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انہیں فنا کر دیا جائے تو غلط معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خونِ قلب و جگر سے کی جائے۔ حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحی مبین کی شکل میں ہماری رشد و ہدایت کے لئے ہمیں عطا کی گئی ہے۔ لہٰذا میں نے جو کچھ کہا ہے اسے اس ازلی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو اور پھر نتیجہ پر پہنچو۔ یہ کہہ دینے سے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس عقیدہ کے خلاف ہے جو جمہور کو اسلاف سے ملا ہے، نہ جمہور کے اس موروثی عقیدہ کو صحیح قرار دے سکتا ہے نہ میرے معروضات کا ابطال کر سکتا ہے۔ صحت و سقم کا معیار، میزانِ قرآنی ہے، نہ میرا دعویٰ نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی شخص میری گزارشات کو باطل ٹھیراتا ہے تو اسے کہو کہ اس کے لئے قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین۔

* * *

سلیم! بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔ بڑھانے کو جتنی جی چاہے بڑھائیے جائیے لیکن سمجھنے کے لئے بالکل واضح اور سادہ۔

ہم عشق کے ماروں کا اتنا سا فسانہ ہے
سمٹے تو میرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

تم تھوڑی دیر کے لئے یوں کرو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے بھی بھول جاؤ۔ اور جو عقیدہ ورانتاً ہمیں ملا ہے اسے بھی الگ رکھدو (ثم تتفکروا) پھر از خود غور کرو کہ قرآن تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں زنا کی سزا متعین ہے لیکن شراب کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اب اس سے یا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن شراب خوری کو جرم ہی قرار نہیں دیتا اس لئے اس کی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ لیکن یہ نتیجہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے اس لئے کہ

(۱) قرآن کی رو سے خمر (شراب) رجس من عمل الشیطان (۵/۹۰) ہے یعنی ناپاک فعل شیطانی۔

(۲) زنا کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ انہ کان فاحشۃ (۱۷/۳۲) وہ فحش کاری ہے۔ اور

(۳) شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے۔ فانہ یامر بالفحشاء والمنکر (۲۴/۲۱)

اس لئے شراب بھی فواحش میں سے ہوئی (کیونکہ شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے اور شراب (خمر) شیطانی عمل ہے۔ اس لئے جس طرح زنا فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم، اسی لئے شراب فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہو گا کہ منشائے قرآنی یہ ہے کہ شراب (خمر) کی کوئی سزا نہ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شراب (خمر) کی سزا ضروری ہے تو قرآن نے اس کی سزا متعین کیوں نہیں کی جس طرح زنا کی سزا متعین کر دی ہے۔

ایک غیر مسلم معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) ناقص کتاب ہے۔ وہ کسی جرم کی سزا متعین کر دیتا ہے کسی کو غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جن جرائم کی تعزیر (یعنی اجمال کی تفصیل) قرآن نے متعین نہیں کی، اُن کی تعیین رسول اللہؐ نے کر دی ہے اور اس طرح کتاب اللہ کی تکمیل ہوئی ہے۔ اس کا نام سنّت قرار دیا جاتا ہے[1] اور دین سے مفہوم ہوتا ہے قرآن اور سُنّت۔

لیکن ذرا سوچو سلیم! کیا اس سے اس اعتراض کا واقعی جواب مل جاتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اعتراض یہ تھا کہ کیا خدا خود ان چیزوں کی تعیین نہیں کر سکتا تھا۔ جو اسے انہیں اس طرح غیر متعین چھوڑ کر دوسروں سے تکمیل کرانی پڑی؟ اسے کونسا امر مانع تھا کہ جس طرح زنا کی سزا متعین کر دی تھی اسی طرح شراب (خمر) کی بھی تجویز کر دیتا۔ یا جس طرح روزوں کے مہینے اور اوقات کی تخصیص کر دی تھی، زکوٰۃ کی شرح بھی مقرر کر دیتا۔ مقام رسالتؐ کی اس عظمت و رفعت کے باوجود جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ — بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر — ذاتِ خداوندی کے متعلق یہ اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ اس نے ان تفاصیل و جزئیات کی خود تکمیل کیوں نہیں کی۔ یہ اعتراض ایسا قوی تھا کہ اس کے لئے ایک آفاقی سہارا ڈھونڈھنا پڑا۔ یعنی یہ عقیدہ وضع کرنا پڑا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے مجموعہ کا نام قرآن ہے (اسے وحیِ متلو کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور دوسری وحی وہ جو قرآن سے باہر رسول اللہؐ کی روایات میں ہے (اسے وحیِ غیر متلو کہتے ہیں کیونکہ اس کی تلاوت نہیں کی جاتی) اس عقیدہ سے اس اعتراض کا جواب یوں مل گیا کہ ان جزئیات کی تعیین بھی خود خدا ہی نے کر دی ہے۔ البتہ وہ اصل کتاب (قرآن) میں نہیں بلکہ روایات کے مجموعوں میں ہیں۔ ذرا سوچو سلیم! کہ یہ دلیل (یا عقیدہ) کس طرح بداہتًا غلط اور درایتًا کمزور ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وحی کی اس تقسیم کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ وہاں واضح طور پر موجود ہے کہ وحی وہی ہے جو قرآن میں ہے اور جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ کہف میں ہے۔

---

[1] چونکہ شراب کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تجویز نہیں فرمائی بلکہ بعد میں حضرت عمرؓ نے متعین کی ہے اس لئے سنت کا مفہوم اور بھی وسیع کر دیا جاتا ہے جس میں نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے کے اقوال و اعمال سب شامل کر لئے جاتے ہیں۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک۔ لا مبدل لکلمٰتہٖ ولن تجد من دونہ ملتحدًا (۱۸/۲۷)

تیرے رب کی کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے لفظوں کو بدل نہیں سکتا۔ (اور اگر تو بھی بفرضِ محال ایسا کرے تو) اس کے سوا تو کہیں پناہ نہ پائے گا۔

سارے قرآن میں اس کا اشارہ تک موجود نہیں کہ خارج از قرآن وحی کہیں اور بھی ہے یا وحی کی کوئی دوسری قسم بھی ہے۔ البتہ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں (متلو اور غیر متلو) اور وہیں سے یہ عقیدہ مسلمانوں نے مستعار لیا۔ (تم نے اس کی تفصیل معراج انسانیت کے باب ظہر الفساد میں دیکھ لی ہو گی)

پھر ذرا اسے بھی سوچو سلیم! کہ وحی کی اس تقسیم سے بالآخر مقصود کیا تھا؟ وہی خدا (وحی کا بھیجنے والا)۔ وہی رسول (جس پر وحی بھیجی جاتی تھی)، وہی زبان (جس میں وحی نازل ہوتی تھی)، وہی مخاطب (جن کی ہدایت کے لئے وحی آتی تھی) دونوں وحیوں کی حیثیت بھی برابر (مثلہٗ معہٗ) لیکن اس کے باوجود کچھ وحی قرآن میں اور کچھ وحی قرآن سے باہر۔ یہ حکم کہ اٰتوا الزکوٰۃ (زکوٰۃ دو) قرآن میں، اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بشرح اڑھائی فی صدی دو، قرآن سے باہر، کیا قرآن میں "اڑھائی فی صدی" کے الفاظ نہیں لائے جا سکتے تھے؟ کیا اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا[1]۔ سوچو سلیم! کہ اس تقسیم خداوندی میں کونسی مصلحت تھی۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ایک قسم کی وحی سے حکم دیا کہ زکوٰۃ دو اور اسے قرآن میں محفوظ کر دیا اور دوسری قسم کی وحی سے بتایا کہ زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فی صدی ہے اور اسے قرآن سے باہر رکھا۔ یہ تو ہوا عملِ خداوندی کے متعلق عقیدہ کہ اس نے وحی کی اس طرح تقسیم کر دی! اب اس کے بعد عملِ رسالت دیکھئے۔ اس عقیدہ کی رو سے حضورؐ نے وحی کی ایک قسم (متلو) کے متعلق تو اتنی احتیاط برتی کہ اسے تمام و کمال لکھوا دیا۔ شروع سے اخیر تک اسی ترتیب کے مطابق جس میں یہ کتاب ہے، حفاظ کو زبانی یاد کرا دیا۔ ان کے حفظ کردہ کو بار بار سن لیا۔ اور اس طرح یہ وحی قرآن کی دفتین میں محفوظ کر کے امت کو دیدی۔ باقی رہی وحی کی دوسری قسم (روایات) سو اسے نہ کہیں لکھوایا نہ کسی کو یاد کرایا۔ نہ اس کا کوئی مجموعہ مرتب کیا۔ نہ اس کی

---

[1] سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے اس کے لئے یہی دلیل دی ہے کہ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔

حفاظت کا کوئی انتظام کیا۔ بلکہ اگر کسی نے از خود تبرکاً کچھ لکھنا بھی چاہا تو اسے روک دیا۔ کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن (مسلم) "مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو"۔ ذرا غور کرو سلیم! کہ دین نام رکھا جاتا ہے قرآن (وحی متلو) اور سنت (وحی غیر متلو) کے مجموعے کا۔ اور دین کے جزو اول کی حفاظت کا تو اس قدر انتظام و اہتمام کیا جاتا ہے اور جزو ثانی کو اس طرح لاوارث چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کیا اس سے رسول اللہ ؐ کے منصب رسالت (دینِ خداوندی کو انسانوں تک پہنچانے) پر (معاذ اللہ) حرف نہیں آتا؟ کہا جاتا ہے کہ عربوں کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ سب کچھ زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔ اس لئے روایات کو لکھوانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس پر تو غور کرو کہ اگر عربوں کا حافظہ ایسا ہی قابلِ اعتماد تھا تو پھر قرآن کو کیوں لکھوایا گیا؟ اور پھر یہ بھی کہ جس طرح قرآن کو لفظاً لفظاً یاد کرایا گیا اور ان کے یاد کئے کی تصدیق کی گئی، اسی طرح روایات کو بھی کیوں نہ یاد کرا کر ان کی تصدیق کر دی گئی! "وحی غیر متلو" کی تدوین و تحفظ کے بارے میں عمل خداوندی اور عمل رسالت تم دیکھ چکے۔ اب عملِ خلفائے راشدین دیکھئے، انہوں نے کس اہتمام سے قرآن کریم کے نسخے تیار کئے اور ان مصدقہ نسخوں کو سلطنت کے مختلف گوشوں میں پہنچایا اور اس کا حکم دے دیا کہ جہاں کہیں کوئی اختلاف ہو ان مصدقہ نسخوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ کچھ انہوں نے دین کے ایک جزو (وحی متلو یعنی قرآن) کے متعلق کیا لیکن دین کے دوسرے جزو (وحی غیر متلو۔ یعنی احادیث) کے متعلق نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہ کیا بلکہ جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص انفرادی طور پر ان کی تحریر و روایت کی کوشش کر رہا ہے اسے اس سے روکا اور عند الضرورت اس پر سخت مواخذہ بھی کیا (تفصیل اس کی تم کئی بار سن چکے ہو) ذرا سوچو سلیم! کہ یہ تمام تصریحات تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہیں! کیا لامحالہ تم اس نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ یہ عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ نہ یہ منشائے خداوندی تھا نہ منشائے رسالت اور نہ مسلک خلافت راشدہ۔ اس تمام عہد میں وحی کی ایک ہی قسم تسلیم کی جاتی تھی جو قرآن میں محفوظ تھی۔ یہی اللہ نے رسول ؐ کو دیا اسی کو رسول ؐ نے امت تک پہنچایا اور اسی کو صحابہ ؓ نے آگے بڑھایا۔

اب ایک بار پھر سن لو سلیم! کہ رسول اللہ ؐ نے احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا۔ اگر احادیث دین کا جزو ہوتیں تو کیا رسول اللہ ؐ پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا تھا کہ وہ دین کے اس حصے کو بھی مستند طور پر

مرتب کر کے اُمت کو دے کر جاتے؟ احادیث کے مجموعے، حضورؐ کی وفات کے بہت عرصہ بعد، لوگوں نے انفرادی طور پر مرتب کئے تھے۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ رسول اللہؐ دین کے ایسے اہم حصے کو اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے! اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرمؐ کے نزدیک یہ حصہ دین کا جزو تھا ہی نہیں۔ جو لوگ اب احادیث کو دین سمجھ رہے ہیں اُن سے یہ سوال پوچھئے ان میں سے کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اب یہ دیکھ کہ اس غلط عقیدہ نے دین میں خرابیاں کس قدر پیدا کیں! قرآن اپنی محفوظ شکل میں اُمت کے پاس موجود تھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی تھی۔ اس لئے اس میں ایک حرف کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس روایات کا کوئی مصدقہ مجموعہ اُمت کے پاس نہ تھا۔ لیکن انہیں اس عقیدہ کی رو سے قرآن کا ہم پایہ قرار دیا گیا تھا۔ اب سوچیئے کہ اس سے دین میں کس قدر تحریف و الحاق کا دروازہ کھل گیا۔ جس کا جی چاہتا کوئی حکم اپنی طرف سے وضع کرتا اور اس کے ساتھ دو چار راویوں کے نام کا اضافہ کر کے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتا، اور یہ حکم دین کا جزو بن جاتا۔ کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اس کی پرکھ کر سکتا کہ یہ واقعی قولِ رسولؐ ہے یا خود ساختہ روایت۔ معیار تھا تو یہ کہ جن دو چار راویوں کے نام بطور اسناد شامل کئے گئے ہیں وہ روایات پرکھنے والوں کے معیارِ ثقاہت پر پورے اترتے ہیں، یا نہیں۔ غور کرو سلیم! کہ جس دین (قرآن) کو خدا اور اس کے رسول نے اتنی احتیاط اور حفاظت سے دیا تھا اُس دین میں تحریف و الحاق کے کتنے بڑے فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ قرآن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے کہ آپ کو بھی اس کی مجال نہ تھی کہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکتے۔ قل ما یکون لی ان ابدلہٗ من تلقائی نفسی۔ ان اتبع الا ما یوحیٰ الی (۱۰/۱۵)۔ "ان سے کہدو کہ میری کیا مجال ہے کہ میں قرآن میں اپنی طرف سے کچھ تغیر و تبدل کر دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ اور دوسری جگہ ہے کہ

ولو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین۔ ثم لقطعنا منہ الوتین (۶۹/۴۴-۴۶)

"اگر رسول کسی بات کو یوں ہی ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگِ جان کاٹ ڈالتے۔"

لیکن اب واضعین حدیث کو کھلی چھٹی تھی کہ جو جی میں آئے وضع کریں اور اسے رسولؐ اللہ تک منسوب کردیں اور جب ان سے کہا جائے کہ یہ تعلیم قرآن میں تبدیلی ہے یا اس پر اضافہ، جس کے رسول اللہ مجاز نہ تھے تو اس کا کھلا ہوا جواب موجود تھا کہ یہ تبدیلی یا اضافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے نہیں کیا۔ یہ تو وحی غیر متلو کے ذریعے کیا تھا جو خدا ہی کی طرف سے تھا اس لئے یہ تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس وحی غیر متلو، نے نہ صرف ان جزئیات ہی کو ابدی طور پر متعین کر دیا، جنہیں قرآن نے غیر متعین رکھا تھا۔ بلکہ قرآن کی متعین کردہ جزئیات میں ترمیم و تنسیخ بھی کر دی۔ مثلاً قرآن نے زانی کی سزا سو دُرّے معتررکی ہے۔ روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ سزا غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی ہے۔ شادی شدہ کی سزا سنگسار ہے۔ یا قرآن نے کہا تھا کہ ہر شخص اپنے مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے لیکن روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی وارثین کے حق میں نہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ یعنی پہلے تو صرف اتنا ہی اعتراض تھا کہ قرآن نے ان احکام کی جزئیات بھی خود ہی متعین کیوں نہیں کیں۔ اس لئے یہ کتاب (معاذ اللہ) ناقص ہے۔ لیکن وحی غیر متلو کے عقیدہ نے یہ بھی کہدیا کہ جن جن احکام کی تفاصیل قرآن نے متعین کی ہیں وہ بھی ناقص ہیں۔ اور ان کی تکمیل و ترمیم وحی غیر متلو کے ذریعہ ہوتی ہے جس کا دروازہ (کم از کم) امام بخاری اور مسلم کے زمانہ تک ضرور کھلا تھا۔

کیوں سلیم! کچھ بات سمجھ میں آئی؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خلجان پیدا ہو رہا ہے کہ

(i) اس اعتراض کا صحیح جواب تو ابھی تک سامنے نہیں آیا کہ قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین کیوں چھوڑ دیا اور

(ii) یہ کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ مسلمانوں میں کس طرح رائج ہو گیا! اگر تم نے اصل مضمون کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو ان اعتراضات کے جوابات بھی وہیں سے مل جاتے۔ لیکن اس دفعہ تو تم نے بھی وہی کچھ کیا جو عوام

کیا کرتے ہیں کہ جوں ہی کوئی خیال ایسا سامنے آیا جو اُن کے کسی مروجہ عقیدہ کے خلاف ہو۔ انہوں نے بلا سوچے سمجھے اعتراضات شروع کر دیئے۔ یہ روش تو تمہاری فطری افتاد کے خلاف تھی۔ لیکن تمہاری معذوری پر میری نگاہ ہے۔ جو عقائد نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آئیں وہ انسان کے نفسِ غیر شعوریہ کی گہرائیوں میں مسلّم صداقتیں بن کر جاگزیں ہو جاتے ہیں اور آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتے۔ اس لئے اب آؤ اُن اعتراضات کی طرف۔

تم جانتے ہو کہ قرآن، تمام دنیا کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے ضابطۂ قانون ہے۔ قانون میں ایک چیز ہوتی ہے اصول اور ایک چیز فروع۔ قرآنی ضابطۂ قانون کے اصول، وہ مستقل اقدار ہیں جو ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہیں، لیکن ان کی فروعات انسان کی تمدنی زندگی کے ان عملی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں جو مختلف زمانوں کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ فروعات غیر متبدل نہیں ہو سکتیں۔ قرآن نے بجُز (چند فروعات کے) انسانی ہیئتِ اجتماعیہ سے متعلق قوانین کے اصول بتلائے ہیں، اُن کی جزئیات خود ہی متعین نہیں کر دیں۔ اس لئے کہ قرآن کا ایک ایک حرف غیر متبدل ہے (لا تبدیل لکلمات اللہ) اگر قرآن جزئیات خود ہی متعین کر دیتا تو ان میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تغیر و تبدل نہ ہو سکتا۔ (جیسا کہ ان چند جزئیات میں نہیں ہو سکتا جو اس نے متعین کر دی ہیں اور جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ منشائے ایزدی یہی تھا کہ انہیں غیر متبدل رکھا جائے)۔ اس قسم کا قانون (جس میں تمام جزئیات تک بھی غیر متبدل ہوتیں)، کبھی تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات قرار نہ پا سکتا۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہودیت، عیسائیت، ہندومت وغیرہ آج اس طرح سے ناکام کیوں ہوئے ہیں! انہیں کیوں اُن کے اپنے پیروؤں نے چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے اپنے اپنے مذہب کو خوشی سے نہیں چھوڑا۔ انتہائی مجبوری کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ مجبوری کیا تھی؟ یہی کہ جو مذہبی رسوم وقیود (یعنی جزئیاتِ قانون) کسی زمانہ میں متعین ہوئیں وہ ان مذاہب میں غیر متبدل قرار پا گئیں۔ اب وہ جزئیات عصرِ حاضر کے انسان کے تمدنی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں

تھیں۔ اربابِ مذہب، اس عقیدہ کی بنا پر کہ وہ غیر متبدل ہیں، ان کی پابندی پر مصر تھے۔ کچھ عرصہ یہ کشمکش رہی اور بالآخر اُن کے معتقدین، وقت کے اٹل تقاضوں سے ایسے مجبور ہوئے کہ انہیں ان جزئیات کو جھٹک کر پھینک دینا پڑا اور چونکہ اُن کی آسمانی کتاب اِن کے پاس اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں اس لئے ان جزئیات کے ساتھ ہی مذہب بھی گیا (دراصل ان کے ہاں مذہب نام ہی ان جزئیات کا رہ گیا تھا)۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ یہودیوں کو تالمود کی جزئیات عیسائیوں کو سینٹ پال کی جزئیات اور ہندوؤں کو منوجی کی جزئیات، جنہیں ابدی اور غیر متبدل کہا جاتا تھا، کس طرح زمانہ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر الگ کرنی پڑیں۔ قرآن کے پیشِ نظر جہاں انسانی زندگی کے نشوو ارتقا کے لئے مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول تھے وہاں اس کی تمدنی زندگی کے ہمیشہ بدلنے والے تقاضے بھی تھے۔ اس لئے اس نے ایسا ضابطۂ حیات دیا جس میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا تھا اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اس میں نوعِ انسانی کے لئے ابدی ضابطۂ حیات بننے کی صلاحیت ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے سلیم! کہ قرآن نے جزئیات کو اس لئے متعین نہیں کیا کہ وہ انہیں قابلِ تغیر و تبدل رکھنا چاہتا تھا۔ اگر کسی زمانہ میں متعین شدہ جزئیات ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنی مقصود ہوتیں تو قرآن خود ہی انہیں متعین کر دیتا۔ لہٰذا قرآن کے غیر متعین جزئیات کو کسی ایک زمانہ میں متعین کر کے انہیں آئندہ کے لئے غیر متبدل قرار دے دینا دین کی اس صلاحیت کو سلب کر لینا ہے جس کی بنا پر یہ ابدی طور پر ضابطۂ حیات بن سکتا تھا۔ ذرا سوچو سلیم! اگر کسی اسلامی حکومت کو یہ مجبوری ہو کہ وہ کسی حالت میں بھی اڑھائی فی صدی سے زیادہ انکم ٹیکس عائد نہ کر سکے اور وہ ٹیکس (زکوٰۃ) بھی سال بھر کے فاضلہ اثاثہ (Surplus Assets) پر، تو وہ حکومت کبھی چل سکتی ہے؟ قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دے کر اس کی شرح و قیود کو غیر متعین چھوڑ دیا تاکہ ہر زمانہ کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود متعین کرتی رہے۔ قرنِ اولیٰ میں اگر خلافتِ راشدہ نے اپنے زمانہ کی ضرورت کے

مطابق اڑھائی فیصدی مناسب سمجھا تھا۔ اس وقت یہی شرح شرعی تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت کہے کہ اس کی ضروریات کا تقاضا بیس فیصدی ہے تو یہی بیس فی صدی شرعی شرح قرار پا جائے گی۔ اور جب قرآنی نظام ربوبیت اپنی آخری شکل میں قائم ہوگا تو اس کی نوعیت کچھ اور ہی ہو جائے گی۔

یہ ہے وہ مصلحت سلیم! جس کی بنا پر قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دیا۔ اب کسی وقت کی متعین کردہ جزئیات کو ابدیت سے ہمکنار کر دینا اس دینِ ابدی کو وقتی بنا دینا ہے۔ سلیم! تم مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہو کہ عصرِ حاضر کا مسلمان اگر مذہب سے بیگانہ بلکہ سرکش ہو رہا ہے تو اس لئے کہ اسے ان جزئیات کو ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو اِس کے موجودہ زمانہ کے تقاضوں میں Fit نہیں بیٹھتیں۔ اگر اس زمانہ کے مسلمان کے سامنے قرآن کے اصول رکھ دیئے جائیں اور اس کے بعد اس سے کہا جائے کہ ان اصولوں کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنیوالی جزئیات خود متعین کرو، تو دیکھو وہ کس طرح لبیک۔ اللھم لبیک کہتا ہوا اس حریمِ فطرت کے گرد مستانہ وار طواف کرتا ہے۔ قرآن کی تو کیفیت یہ ہے سلیم! کہ

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چو کہن گردد جہانے در برش می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب دوسری شق لیجئے۔ یعنی یہ کہ یہ جزئیات، غیر متبدل کس طرح قرار پا گئیں۔ اسی کو بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ کیسے پیدا ہو گیا۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ ہر زمانہ کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ان کا تعین خود کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی حکومت کی تشکیل فرمائی اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متعین جزئیات کو متعین فرمایا۔ اس کے بعد خلافتِ راشدہ

کے زمانہ میں ان جزئیات میں حسبِ ضرورت اضافے بھی ہوتے رہے اور ترمیمات بھی۔ خلفائے راشدین نے ایسے فیصلے دیئے جو حضورؐ کے فیصلوں سے مختلف تھے اور یہی کہہ کر دیئے کہ ہمارے زمانے کے حالات کا یہی تقاضا ہے۔ سلیم! تم حیران ہوگے کہ وحی غیر متلو کے عقیدہ کا سراغ نہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں کہیں ملتا ہے، نہ صحابہ کے عہد میں۔ وہ زمانہ اس اصطلاح تک سے ناواقف نظر آتا ہے۔ اُن کے نزدیک وحی ایک ہی تھی اور وہ قرآن میں محفوظ تھی۔ اس سے باہر وحی کہیں نہ تھی اس لئے خارج از قرآن کوئی چیز غیر متبدل بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب خلافت، ملوکیت میں بدل گئی اور سلاطین نے امورِ سلطنت اپنے ذمہ رکھ لئے اور امورِ دین کو انفرادی طور پر علماء[1] کے سپرد کر دیا تو قرآنی اصولوں کی جزئیات متعین کرنے کا جو اسلوب قرآن نے بتایا تھا (یعنی اسلامی نظامِ مملکت کی وساطت سے) وہ خود بخود مٹ گیا۔ اندازہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے ذمے امورِ دین کا تحفظ قرار پایا، انہوں نے سوچا کہ مرکزی قوت (حکومت) نے جزئیات کو قانون کی حیثیت دے کر نافذ کرنے کا فریضہ ترک کر دیا ہے۔ اس لئے اگر مروجہ جزئیات کے متعلق یہ کہدیا گیا کہ وہ صرف اس زمانہ کے لوگوں کے لئے شریعت تھیں جن کے لئے انہیں مرتب کیا گیا تھا تو ملت شریعت کے بغیر رہ جائے گی اور اس طرح ان میں سخت انتشار (Anarchy) پھیل جائے گا۔ لہٰذا ملت کو کسی آئین پر پابند رکھنے کا یہی طریقہ تھا کہ اس وقت کی مروجہ جزئیات کو غیر متبدل قرار دے کر واجب التعمیل ٹھیرا دیا جائے۔ ان کو غیر متبدل قرار دینے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ انہیں تمام و کمال ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کر دیا جاتا۔ اور یہ کہدیا جاتا کہ حضورؐ نے انہیں

---

[1] سلیم! تم حیران ہوگے کہ علماء کا ایک جداگانہ طبقہ اور مولوی اور مولانا کے الفاظ نہ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کہیں دکھائی دیتے ہیں نہ زمانہ خلافتِ راشدہ میں۔ یہ بھی اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب سلطنت دین سے الگ ہو گئی اور "قیصر اور پوپ" کے دوائرِ منصب جداگانہ قرار پا گئے۔ "حضرت مولانا ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت مولوی عمر فاروق رضؓ" آج بھی کس قدر نامانوس نظر آتے ہیں۔

بذریعہ وحی متعین فرمایا تھا۔ اس لئے یہ ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انہیں وحی قرار دینے میں غالباً یہ مصلحت بھی تھی کہ جو لوگ ذاتی اجتہادات سے مسائل میں استنباط کر کے جزئیات متعین کر رہے تھے (یعنی اہلِ فقہ) ان کے عقیدے کی رُو سے ان کے مخالف گروہ (اہلِ حدیث) کو اُن کے رد کی ناقابلِ تردید دلیل مل جاتی تھی۔ یعنی ایک چیز کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اسے حضورؐ نے بذریعہ وحی متعین فرمایا اور دوسری کے متعلق یہ کہ اسے (مثلاً) امام ابو یوسفؒ نے اپنی رائے سے متعین کیا تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کی جبینِ عقیدت اوّل الذکر کے سامنے جھکے گی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں سلیم! جزئیات کو غیر متبدل قرار دینے کا اوّلین جذبۂ محرکہ یہی[1] تھا۔ یعنی ملت کو بالکل بے زمام چھوڑ دینے یا اشخاص کی ذاتی آراء کے تابع کر دینے کے بجائے انہیں تقلید کی حدود میں مقیّد کر دیا جائے۔ یہ طریقہ ایک اضطراری حالت کے لئے وقتی علاج تو ضرور تھا لیکن اس سے وضع احادیث کا اتنا بڑا دروازہ کھل گیا کہ جو کچھ کسی کے جی میں آیا اس نے قال رسول اللہ کے عنوان سے دو چار رواۃ کی تائید کے ساتھ گھڑا اور اسے جزو دین بنا دیا۔ اب یہی دین ملت کے لئے ابدی طور پر ناقابلِ تغیر شریعت بن گیا۔ جب تک حکومت اور مذہب کی تفریق باقی رہی یہ سوال عملی طور پر بے معنی تھا کہ یہ جزئیات جو تقلیدی طور پر اسلاف سے منتقل ہوتی آرہی ہیں علیٰ حالہ رہنی چاہئیں یا ان میں تغیر و تبدل ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ حکومت سے الگ ہٹ کر یہ جزئیات مذہبی رسوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ زکوٰۃ اڑھائی فی صدی ہوتی یا چالیس فی صدی دونوں صورتوں میں خیرات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اب جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے، لیکن مذہب حکومت سے

---

[1] میں اس وقت اس سازش سے بحث نہیں کر رہا جو عجمی عناصر (یہودیت، عیسائیت، اور مجوسیت) نے اسلام سے انتقام لینے کی ن سے کی اور جس کی رو سے انہوں نے روایات سازی کے رستے اپنے خیالات اور عقائد کو عین اسلام بنا کر دکھایا۔ اس کے متعلق دوسرے مات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے جن لوگوں نے نیک نیتی سے اس قسم کا عقیدہ پیدا کیا اُن کے پیشِ نظر غالباً ۔ ۔ ۔ ۔ س قسم کی مصلحت تھی۔ اور اگر یہ مصلحت نہ تھی تو لامحالہ کہنا پڑے گا کہ وہ بھی اس عجمی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔

الگ ہے، وہاں ان جزئیات کی حیثیت مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہاں حکومت کے ٹیکس الگ ہیں۔ اور زکوٰۃ بطور خیرات دی جاتی ہے۔ اس لئے اس سے پہلے اس سوال نے عملی حیثیت اختیار نہیں کی۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد یہ آواز ہر در و دیوار سے اٹھنی شروع ہوئی ہے کہ اس کا آئین شرعی ہونا چاہیئے (اور یہی تشکیلِ پاکستان کا مقصد بھی ہے) لہٰذا اب اس سوال نے بھی عملی شکل اختیار کر لی ہے کہ یہ جزئیات جو ہمارے ہاں متوارث چلی آ رہی ہیں، ناقابلِ تغیر ہیں یا زمانہ کے مقتضیات کے مطابق ان میں تغیر و تبدل بھی ہو سکتا ہے جو لوگ دل سے چاہتے بھی ہیں کہ یہاں نظام شریعت رائج کیا جائے وہ بھی اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر شریعت ان ہی جزئیات کے مجموعہ کا نام ہے جنہیں اربابِ شریعت ناقابلِ تغیر قرار دے رہے ہیں، تو پاکستان کا نظام چل کیسے سکے گا؟ اربابِ شریعت کا اصرار ہے کہ یہ جزئیات ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انہیں چھوا تک نہیں جا سکتا اس لئے انہیں اسی طرح اختیار کرنا ہوگا۔ اس سے انہیں کچھ واسطہ نہیں کہ اس سے ہم زمانہ میں زندہ بھی رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ تقلید کا خاصہ یہ ہے کہ اس سے ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے اور اعمال کو کبھی نتائج سے پرکھا نہیں جاتا۔ تمہیں یاد ہے ایک دفعہ دہلی میں ہم ایک پریس میں گئے تھے۔ وہاں ایک بہت بڑی روٹری مشین سرگرمی سے چل رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بڑے زور و شور کے ساتھ لیکن اس کے تختہ پر کاغذ نہیں تھا اس لئے مشین چل رہی تھی لیکن چھپ کچھ نہیں رہا تھا۔ مسلمانوں کے اعمالِ مذہبی کی مشین صدیوں سے چل رہی ہے لیکن اس پر چھپ کچھ نہیں رہا۔ اولٰئک حبطت اعمالھم (ان کے عمل بے نتیجہ رہتے ہیں) اور ضل سعیھم (ان کی کوششیں رائگاں) لیکن اب سلیم! خدا خدا کر کے ہمیں ایک ایسا موقع ملا ہے جس میں حکومت ہمارے ہاتھ میں ہے، لیکن ملوکیت کا استبداد و تغلب ہنوز ہم پر مسلط نہیں ہوا۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ جس قسم کا آئین چاہیں بنا لیں۔ صدیوں کے بعد پھر وہ وقت آیا ہے کہ ناموسِ فطرت ہمارے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ؎

تو اپنی سرنوشت پھر اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اگر سلیم! اس وقت ہم نے مبدا فیض کی اس موہبتِ کبریٰ سے فائدہ نہ اٹھایا تو اس کے بعد قرآن ہماری زندگی کا ضابطۂ حیات کبھی نہیں بن سکے گا۔ اور ہم آزادی کی فضائے بسیط میں کبھی سانس نہیں لے سکیں گے۔ میں سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر درد و کرب کی ان تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں، جنہوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ سلیم!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز مری خلوت و انجمن کا گداز

تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ ع

نہ کہیں لذت کردار نہ افکارِ عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

مجھے سلیم! یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ ہمارے نظامِ شریعت کے دعویداران وہی ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ فقہ و روایات کی وہ جزئیات جو ہزار سال پیشتر کے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں اس لئے وہ انہی جزئیات کے مجموعہ کو قانونِ شریعت بنا کر سامنے لے آئیں گے جو آج کے حالات میں کبھی قابلِ عمل نہ ہو سکے گا اور مسلمان اس سے ایسا بدکے گا کہ دوبارہ اس کی طرف رُخ نہیں کرے گا۔ اور اس طرح اللہ کی یہ نعمتِ عظمیٰ ہماری شامتِ اعمال سے بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ صرف ہم پر ہی ظلم نہیں ہو گا بلکہ تمام نوعِ انسانی پر ظلم ہو گا کہ اس سے

انسانیت اس نور سے محروم رہ جائے گی جس میں اس نے اپنے شرف و مجد کی ارتقائی منازل طے کرنی تھیں۔ وذٰلک خسران المبین۔

* * *

سلیم! تم کہتے ہو کہ جب اصولِ قانون، اللہ تعالیٰ نے معتبر کر دیئے اور ان کی جزئیات امت نے اپنے اپنے زمانہ میں متعین کیں تو رسولؐ پر ایمان لانے سے کیا مفہوم ہوگا! تمہارے اس سوال پر مجھے حیرت ہوئی اس لیے کہ تم کبھی اس قسم کا سطحی اعتراض نہیں کیا کرتے تھے۔ ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو اس کے پاس اس دعوے کی دلیل کیا ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے (معاذ اللہ، رسول اللہؐ کا خود ساختہ نہیں) تاریخ شاہد ہے (اور ہر مسلمان کو خود اقرار ہے) کہ دنیا کو قرآن محمدؐ ابن عبداللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا؟ اس کا صرف ایک ثبوت ہے کہ خود محمدؐ ابن عبداللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ کلام میرا نہیں، خدا کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائے۔ قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اور قرآن ہی حکومتِ خداوندی کا ضابطۂ قانون ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اس وقت تک وجہ شرفِ انسانیت ہے جب تک انسان اللہ کی حکومت کو باعثِ احترامِ آدمیت سمجھتا ہے۔ پھر اسے بھی سوچئے سلیم! کہ اس حقیقت سے بھی ہمیں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آشنا کرایا کہ قرآنی اصولوں کی جزئیات خود ہم نے متعین کرنی ہیں۔ اگر حضورؐ انہیں متعین کر کے حکومتِ خداوندی کو متشکل نہ فرماتے تو ہمیں کیسے معلوم ہوتا کہ منشائے خداوندی کیا ہے؟ لیکن حضورؐ کی سیادت تو اسی میں تھی کہ آپ نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر دیا اور اس طرح اسے صحیح حریتِ فکر و نظر عطا کر کے اسے ان اغلال و سلاسل کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جس میں وہ جکڑا چلا آتا تھا۔ یہ اغلال و سلاسل وہ استبداد تھا جو ملوکیت اور برہمنیت کی شکل میں انسانی اعصاب پر سوار چلا آتا تھا۔ حضورؐ نے یہ بتایا کہ

انسان کا تعلق اس کے خدا کے ساتھ براہ راست ہے۔ اور خدا اور بندے کے درمیان، اور تو اور خدا کا رسول بھی حائل نہیں ہوسکتا۔ یہ اندازِ حکومت (کہ اصول خدا نے متعین کئے ہیں اور ان کی جزئیات انسان خود متعین کریں گے) خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے وہ عدیم المثال تعلیم جسے قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ۔ ولکن کونوا ربّٰنیّٖن بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے کہ خدا سے ورے میرے بندے بن جاؤ۔ (اس کا شیوہ یہ ہوگا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم سب ربانی انسان بن جاؤ (اور اس بنا پر کہ) تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

رسول کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے فقید المثال عمل سے انسانوں کو یہ سکھلائے کہ وہ کس طرح ربانی انسان بن سکتے ہیں۔ یعنی ان کا اور ان کے خدا کا براہ راست تعلق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس تعلق کا ذریعہ کتاب اللہ ہے۔ اس تعلق کی عملی شکل پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعین کر کے دکھائی۔ آپ کے بعد آپ کی امت نے اس تعلق کو مسلسل قائم رکھنا تھا۔ لیکن امت بہت جلد اس راستہ سے بھٹک گئی اور اس نے اپنے اور خدا کے درمیان وہی انداد (غیر خدائی قوتیں) حائل کر لئے جنہیں درمیان سے ہٹانے کے لئے قرآن آیا تھا اور جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہٹا کر دکھا دیا تھا۔ یہ انداد من دون اللہ کہیں ارباب سیاست تھے اور کہیں احبار و رہبان جنہوں نے خدائی

احکام کی جگہ اپنے احکام کی پرستش کرائی۔ کسی نے قیاسات کی رو سے ائمہ کا آسرا لیکر اور کسی نے روایات کے راستے خود رسول اللہ کا سہارا پکڑ کر، حالانکہ نہ اُن ائمہ نے اس کی تلقین کی تھی اور نہ رسول اللہ نے اس کی تعلیم دی تھی کہ یہ جزئیات قیامت تک غیر متبدل ہیں۔ تو پھر سلیم! کوئی تو وقت ایسا آنا چاہیئے جب امت کو اس بے راہ روی سے روک کر اس راستہ پر لگایا جائے جس سے اس کے اور اس کے خدا کے درمیان پھر براہ راست تعلق پیدا ہو جائے۔ میرے نزدیک پاکستان نے وہ موقع بہم پہنچا دیا ہے۔ لیکن اب بھی اگر ہمارے اور ہمارے خدا کے درمیان وہی انداداً من دون اللہ حائل رہے۔ یعنی حکومت ارباب سیاست کے اپنے تصورات کے مطابق قائم ہو گئی یا ہمارے احبار و رہبان کے اشخاص پرستی کے معتقدات کے مطابق تو پھر خدا اور بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ شاید دوبارہ نہ جڑ سکے۔ یہ خدشہ ہے سلیم!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیوں۔ اور میرے دل کی پوشیدہ بیتابیوں کا موجب۔

* * *

اس آخری ٹکڑہ سے سلیم! تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ "اسلامی نظام" محض چند قوانین کے مجموعے کا نام نہیں جو کسی قوم (یا ایک حکومت کے تابع آجانے والے انسانوں) کی اجتماعی زندگی میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے میکانکی طور پر نافذ کر دیئے جائیں گے۔ قانون کیا ہے۔ انسانوں کو ان افعال سے روکنے کا ذریعہ جن سے ان کی تمدنی زندگی میں فساد و انتشار واقع ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف قوموں (یا جماعتوں اور سلطنتوں) نے مختلف انداز و طرق (قوانین) وضع کئے ہیں۔ ان میں اکثر قوانین مشترک بھی ہیں۔ مثلاً قاتل کی سزا موت، انگریز کے قانون میں بھی وہی ہے جو قرآن کے قانون میں ہے۔ اس اعتبار سے انگریز کے قانون اور ہمارے شرعی قانون میں کوئی فرق نہیں۔ اب فرض کرو کہ اگر انگریز مختلف جرائم کی وہی سزائیں اپنے ہاں رائج کر لیتا ہے جنہیں ہم شرعی حدود کہتے ہیں

تو کیا سلیم! اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ انگریز کا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا؟ بالکل نہیں! تو اس سے اب ایک قدم آگے بڑھو۔ اگر ہم بھی اپنے ہاں جرائم کی وہی سزائیں تجویز کر لیں جنہیں شرعی تعزیرات کہتے ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ ہمارا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا۔ ہرگز نہیں۔ اس سے سلیم! تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ فقط شرعی قوانینِ جرم و سزا کو نافذ کر دینے کا نام اسلامی نظام نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوانینِ شرعی نظامِ اسلامی کا ایک جزو ہیں۔ اس وقت تک جس قدر مطالبات پیش ہو رہے ہیں وہ محض قوانینِ شرعی کی تنفیذ کے لئے ہو رہے ہیں۔ اگر ہماری حکومت ان شرعی قوانین کو اختیار کر لے تو ہمارے اربابِ شریعت مطمئن ہو جائیں گے کہ "حکومتِ خداوندی" کا قیام ہو گیا۔ لیکن ادھر سے ان قوانین کا نفاذ ہو گا اور اُدھر سے قانونی موشگافیوں کے ذریعہ ان قوانین کی گرفت سے بچنے کے حیلے وضع کئے جائیں گے۔ سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں ایک باب، باب الحیل بھی ہوتا ہے۔ یعنی وہ حیلے جن سے مجرم قانونی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ تم حیران ہو گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں! لیکن سلیم! میں ایک حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو ان کتابوں کو اٹھا کر خود دیکھ لو اور پھر علامہ ابن قیم کی اعلام الموقعین دیکھو جس میں ان "شرعی حیلوں" کا رد کیا گیا ہے۔ تمہاری دلچسپی کے لئے ان حیل میں سے ایک حیلہ مثالاً لکھتا ہوں۔ اس سے تم سمجھ بھی جاؤ گے کہ "شرعی حیلوں" سے مفہوم کیا ہے۔ دو آدمیوں نے مل کر ایک مکان سے مال چرایا اور موقعہ پر گرفتار ہو گئے۔ عدالت میں پیش ہوئے۔ جرم ثابت تھا۔ شرعی تعزیر کی رو سے چور کا ہاتھ کاٹنا چاہیئے لیکن اب دیکھئے کہ یہ کس طرح اس سزا سے بچتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ سرکار! میں نے صرف نقب لگائی ہے۔ نقب لگانا چوری نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے بیشک مال اکٹھا کیا اور لے کر چلا۔ لیکن منقوب مکان میں پڑا ہوا مال، مالِ محفوظ نہیں کہلا سکتا۔ اور چوری مالِ محفوظ کو لیجانے کا نام ہے۔ لہٰذا مجھ پر چوری کا جرم عائد نہیں ہو سکتا۔ لیجئے دونوں چور، چوری کے جرم سے بری ہو گئے۔ اب ان پر کوئی اور فردِ جرم لگائیے۔ اس قسم کے حیلے

سلیم! روز عدالتوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ وکلاء کے معاش کا بیشتر حصہ اسی قسم کی حیلہ تراشیاں ہیں۔ لہٰذا محض شرعی قوانین کی تنفیذ سے نفوس میں اصلاح نہیں ہو سکتی۔ قلوب میں انقلاب قرآنی نظامِ ربوبیت کے قیام سے ہوگا۔ اسلامی نظام کیا ہے؟ اے سلیم! میں تمہیں اس خط میں نہیں سمجھا سکتا۔ اس کے لئے تمہیں دوسری فرصت میں لکھوں[1] گا لیکن وہ پھر بھی جامع اور مکمل نہیں ہوگا۔ قرآنی نظامِ ربوبیت انسانی زندگی کو اس طرح محیط ہوتا ہے، جس طرح فضا کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہوا، انسانی جسم کو لپیٹے ہوتی ہے۔ اور بایں نمط کہ یہ کرۂ ہوائی اس کی زندگی کا مدار و اساس ہوتے ہوئے اس کی آزادیوں میں کہیں خلل انداز نہیں ہوتا۔ چلتے، چلتے چند الفاظ میں سلیم، یوں سمجھ لو کہ

(۱) کائنات ایک مقصد کے ماتحت پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں جا رہی ہے۔

(۲) اسی طرح انسان کی زندگی بھی ایک مقصد لئے ہوئے ہے اور اس کی تگ و تاز کا منتہیٰ اس نصب العین کی طرف بڑھنا ہے۔

(۳) خارجی کائنات میں ہر شے بلا اختیار و ارادہ اس مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

(۴) لیکن انسان اپنی دنیا میں صاحبِ اختیار و ارادہ ہے۔ اس لئے اسے اس نصب العین کی طرف اپنے نظامِ اجتماعیہ کی رو سے بڑھنا ہوگا۔

(۵) اس نظامِ اجتماعیہ کا نام الدین یعنی اسلامی نظامِ زندگی ہے جس کی بنیاد وحدتِ خالق۔ وحدتِ قانون، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ مقصد پر ہے۔

(۶) اس نظام کا اولین نتیجہ یہ ہونا ہے کہ اس میں ہر فردِ معاشرہ کی تمام انسانی صلاحیتیں کامل طور

---

[1] دیکھئے میری کتاب "قرآنی نظامِ ربوبیت"

پر نشو و نما پانے کے لئے تمام اسباب و ذرائع ہر ایک کے لئے یکساں طور پر میسر ہوتے ہیں۔

(۷) اس نظام کی رو سے تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔

لہٰذا قوانینِ تعزیرات اس نظام کا ایک جزو ہیں جو افرادِ معاشرہ کی اجتماعی زندگی میں بدعنوانیوں کی روک تھام کے لئے نافذ کئے جاتے ہیں۔

چونکہ اس وقت بحث صرف یہ تھی کہ شرعی قوانین کی ترتیب و تدوین کس طرح عمل میں آئے گی۔ اس لئے میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" میں اپنے آپ کو صرف اسی نقطہ تک محدود رکھا ہے۔ اس مضمون کے عنوان سے اس کو اسلامی نظام نہ سمجھ لینا۔ اس مضمون میں اسلامی نظام کے صرف ایک گوشے سے بحث کی گئی ہے۔ یہ چیز کہ یہ گوشہ (یعنی ضابطۂ قوانین) کس طرح پورے نظام کا جزو بن کر اس مقصدِ عظیم کے حصول میں ممد ہوتا ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک پورے کا پورا اسلامی نظام اور اس کا منتہیٰ آپ کے سامنے نہ ہو۔ اس کے لئے سلیم!

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار[1] کر

اب سلیم! تمہاری آخری بات کا جواب آتا ہے۔ یہ تمہیں تسلیم ہے کہ ایسے معاملات سامنے آسکتے ہیں جن کی جزئیات نہ قرآن نے متعین کی ہیں اور نہ وہ کہیں روایات میں ملتی ہیں۔ اب اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جزئیات کی تعیین صرف رسول ہی کر سکتا ہے تو ان امور کی جزئیات کو کون متعین کرے گا؟ اس لئے کہ اب بابِ رسالت تو بند ہو چکا ہے۔ یہ تھی وہ الجھن جس کے لئے کہیں ہر صدی کے اخیر ایک مجدد کا عقیدہ وضع کرنا پڑا اور کہیں مہدی آخر الزمان کا انتظار اٹھانا پڑا، اسی سے مدعیانِ نبوت نے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے نبوت کا دروازہ کھول دیا۔ اگر یہ سمجھ لیا جاتا کہ جزئیات کی تعیین امت کا فریضہ ہے تو پھر نہ کسی الگ مجدد کی ضرورت پڑتی۔ نہ کسی جداگانہ مہدی کی نہ یہ کرسیاں رکھی جاتیں نہ اُن پر کوئی نبی بن کر بیٹھنے کی جرأت کرتا۔ تجدید: ہدایت کا سلسلہ مسلسل و متواتر قائم رہتا

---

[1] دیکھئے مسودۂ دستورِ اساسی پیش کردہ طلوعِ اسلام۔

لیکن مسلمانوں نے یہ نہ کیا اور جب اس غلط بینی سے پیچیدگیاں پیدا ہوئیں تو اُن کے ایسے ایسے حل تجویز کئے جن سے وہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہوتا چلا گیا۔ تم کہتے ہو کہ اس قسم کے امور کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ یہی میں کہتا ہوں فرق یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ جو اجتہاد پہلے ہو چکا ہے اس میں مزید اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اجتہاد کے محتاج ہی وہ امور ہوتے ہیں جن میں مقتضیات زمانہ کی رو سے رد و بدل ہو سکتا ہو۔ جن امور کو اللہ تعالیٰ نے کھلا چھوڑ دیا ہے ان میں کسی ایک زمانہ کا اجتہاد ابدی فیصلہ نہیں بن سکتا۔ اگر اسے ابدی فیصلہ بن جانا ہوتا تو اس کا فیصلہ خود قرآن کر دیتا۔ اور اسے اجتہاد انسانی کے لئے آزاد نہ رکھتا۔ البتہ ہم اپنے زمانہ کے اجتہاد کے لئے ان تمام اجتہادات سے مستفید ہوں گے جو ہم سے پہلے کئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اجتہاد انفرادی نہیں ہو گا۔ بلکہ ملت کے نمائندے تمام حالات پر غور و فکر کے بعد اجتہاد کریں گے اور اس سے یہ جزئیات مرتب ہوں گی۔ یہ ہے وہ طریق سلیم! جس سے ہم خدا کے ازلی اصولوں کی روشنی میں جو در حقیقت انسانی زندگی ہی کے ترجمان ہیں، ہر زمانہ کے مسائل کے نئے نئے حل دریافت کرتے چلے جائیں گے۔ یہ ہے دینِ مبین۔

لایزال و وارداتش نو بنو ہرگ و بار محکماتش نو بنو
باطنِ او از تغیر بے غمے ظاہر او انقلاب ہر دمے

والسّلام

اگست ۱۹۴۸ء

سلیمؐ کے نام آٹھواں خط

مغربیؒ اور قرآنی تہذیب کا بنیادی فرق

ہاں سلیم! تم نے ٹھیک کہا۔ قریب چھ سال کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ یوں تو سال بھی صبح اور شام کے مجموعے ہی کا نام ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے "وقت" کے لامتناہی سلسلہ پر نشانات حساب و شمار کی سہولیت کی غرض سے لگا رکھے ہیں، جیسے گز پر گرہیں لگا دی جاتی ہیں، ان گرہوں کا وجود اعتباری ہوتا ہے، فی الواقعہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح دن، مہینے، سال، وقت کے گز پر گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ ان کا وجود ہمارے ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ اگر کوئی آنکھ سورج سے اونچی جا کر زمین کو دیکھے تو اس کے سامنے ہر وقت دن ہی دن رہے گا۔ رات کبھی نہیں آئے گی۔ اس لئے اس کے نزدیک امروز، فردا کا امتیاز بھی باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا جوں جوں انسان بلندیوں پر پہنچتا جائے تعینات کے پردے اٹھتے جاتے ہیں۔ لیکن وقت کے اس لامتناہی دریا میں واقعات کے حباب ذہنِ انسانی پر اپنے مستقل نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان ہی نقوش سے انسانی زندگی ترتیب پاتی ہے۔ گذشتہ چھ سال کے حوادث و کوائف پر ایک نگہ باز گشت ڈالو اور پھر سوچو کہ وہ جو اس مردِ قلندرؒ نے، کہ جسے بصیرت فرقانی نے مومنانہ فراست عطا کی تھی، کہا تھا کہ

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

کس قدر مبنی بر حقیقت تھا۔ اس چھ سال کے عرصہ میں دیکھو کہ کس قدر تابناک و درخشندہ تاج ہیں جو فضا میں اڑتے

دکھائی دے رہے ہیں۔ کیسی کیسی عظیم المرتبت سلطنتیں ہیں جو مٹی میں ملتی نظر آرہی ہیں۔ کیسے کیسے بلند آہنگ دعاویٔ نمرود و فرعونیت ہیں جو سرِ خاک سامنے آرہے ہیں۔ کس قدر تحیّر انگیز انقلابات ہیں جو سنیما کی تصویر کی طرح نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ جو واقعات و حوادث پہلے کہیں صدیوں میں بھی تکمیل پذیر نہ ہوا کرتے تھے، اب کس طرح دنوں بلکہ گھنٹوں میں رونما ہو جاتے ہیں۔ اس "عصرِ رفتار" (Age of speed) نے وقت کے پہیوں میں بھی بجلیاں بھر دی ہیں۔ اس چھ سال کے عرصہ کو دیکھو اور اتنے انقلابات پر نگاہ ڈالو۔ اور سوچو کہ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی۔ بقول تمہارے محبوب "خیامِ ہندی" کے ؎

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی (ریاض)

اور پھر اس دوربین کو آنکھوں سے الگ کر کے، ذرا اپنے قریب کی دنیا کو دیکھو۔ وہ "خواب" جو اُسی مردِ دانا نے جس کا ذکر ابھی ابھی وجہِ نشاطِ روح ہو چکا ہے، ۱۹۳۰ء میں دیکھا تھا اور جس کا استقبال ہر ایک نے ایک استحقار آمیز تبسم زیر لبی سے کیا تھا کہ اُن کے نزدیک یہ "شاعرانہ تخیل" اسی سلوک کا مستحق تھا۔ ہاں وہی "خواب" کس طرح محسوس پیکروں میں ہمارے سامنے آگیا — اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ یہ "خوابِ شیریں" ہماری شامتِ اعمال سے، کس طرح اپنے ساتھ "تیشۂ فرہاد" لے کر آیا کہ جس نے ہمارے اثاثۂ قومی کے ہر کاخ کو اور متاعِ ملی کے ہر در و دیوار کو اس طرح تودۂ خاک بنا کر رکھ دیا کانّہ لم یکن شیئًا مذکورًا۔ سلیم! یہ قیامتیں کہیں باہر سے ہم پر نہیں ٹوٹیں۔ خود ہمارے اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی تھیں وما اصابك من سيئة فمن نفسك۔ لیکن سلیم! اس حدیثِ جگر پاش و داستانِ سینہ سوز کو اس وقت نہ چھیڑو، ورنہ تمہارے سوالات کا جواب رہ جائے گا۔ میرے بربطِ ہستی کے ان تاروں کے قریب مضراب مت لاؤ کہ ان میں نغمے نہیں، آگ بھری ہے، میں آتشِ خاموش کی طرح

اندر ہی اندر دہک رہا ہوں میرے سینۂ سوزاں کو بند ہی رہنے دو کہ اگر اسے کسی طرف سے بھی ہوا لگ گئی تو یہ آگ شعلۂ جوالہ کی طرح بھڑک اٹھے گی۔ لہذا سلیم! مجھے رکنے دو تاکہ تمہارے شبہات کا ازالہ کر سکوں۔ غور سے سنو کہ بات بڑی اہم ہے۔

* * *

تم پوچھتے یہ ہو کہ میں نے وراثتِ ارض کے ابدی قانون " کے سلسلہ میں "صلاحیت " اور "صالحیت " میں جو فرق بتایا ہے اس کی لم اور تفصیل کیا ہے؟ اگرچہ تم نے وضاحت سے نہیں لکھا۔ لیکن اس باب میں جو مشکل تمہارے سینہ میں پھانس بن کر کھٹک رہی ہے مجھے اس کا بھی پورا پورا احساس ہے۔ یہ خلش کچھ تم ہی سے مخصوص نہیں۔ آج قریب قریب ساری دنیا اسی الجھاؤ میں نظر آرہی ہے۔ تمہارے متعلق یہ امر میرے لئے ہمیشہ باعثِ مسرت رہا ہے کہ تم اپنی کھٹک کو بلا تامل کہہ ڈالتے ہو۔ یاد رکھو حقیقی اطمینان اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان دل میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات کو واضح طور پر بیان کر دے اور جب تک وہ بالکل صاف نہ ہو جائیں، پیچھا نہ چھوڑے۔ "حقیقی اطمینان " کے الفاظ میں "حقیقی " کو خاص طور پر ملحوظ رکھو۔ اس لئے کہ "جھوٹے" اطمینان کی دنیا میں بہت سی شکلیں ہیں۔ لیکن اطمینان وہی اطمینان ہے جو حقیقی ہو اور یہی ایمان کی اساس ہے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے تھوڑی دور پیچھے جانا پڑے گا۔

(۱) ایک شخص سنکھیا کھا لیتا ہے۔ اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس لئے کہ انسان کی طبیعی زندگی ایک خاص نظم اور خاص قوانین کے تابع چل رہی ہے۔ اس نظام اور ان قوانین طبیعی (Physical Laws) نے سنکھیے کو ہلک بتایا ہے۔ اس لئے کہ یہ انسانی جسم پر ایک ایسا اثر مرتب کرتا ہے جو قاطع زندگی ہے۔ اس لئے سنکھیا کھانے والے کی موت یقینی ہے۔ یہ قوانینِ فطرت کا تقاضا ہے اور اس کا ثبوت بدیہی۔

(۲) ایک شخص گھی کھاتا ہے گھی مُمدِ حیات ہے اس لئے اس سے اس میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اور توانائی سے زندگی کا قیام ہے۔

(۳) ایک شخص گھی خرید کر لاتا ہے۔ دوسرا شخص چرا کر لاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں پر گھی کا اثر یکساں ہوگا یا مختلف قوانینِ طبیعی کا جواب صاف اور واضح ہے کہ گھی کے اثر پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ گھی دونوں صورتوں میں توانائی بخش اور ممدِ حیات ثابت ہوگا۔ اس سے ہر حالت میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

(۴) مغرب کی مادی (میکانکی) تہذیب چونکہ قوانینِ طبیعی سے ماورا کسی اور نظامِ قوانین کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس لئے اس کے نزدیک جو شے ممدِ حیات اور تقویت بخش ہے (یعنی انسان یا اس سے آگے بڑھئے تو انسانوں کے مجموعہ یعنی قوم میں زندگی کی صلاحیت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے) وہ نفع رساں ہے۔ اور چونکہ کسی شے کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار لامحالہ یہی ہے کہ وہ نفع رساں ہے یا نقصان دہ۔ اس لئے ذریعۂ حصول کو اس فیصلہ میں کوئی دخل نہیں۔ گھی اچھی چیز ہے خواہ کسی طریق سے حاصل کیا جائے

(۵) تم یہ کہو گے کہ اہلِ مغرب جب چوری کو معیوب قرار دیتے ہیں اور قانون کی رُو سے جرم۔ تو وہ لامحالہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ "چوری کا گھی" بُری چیز ہے اور "خریدا ہوا گھی" اچھی چیز۔

لیکن ہم نے ابھی ابھی اوپر دیکھا ہے کہ قوانینِ طبیعی کی رو سے گھی کا اثر ایک ہی ہوتا ہے خواہ وہ مسروقہ ہو یا خریدکردہ۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ مادی تہذیب کی رو سے چوری کا گھی اور نتیجہ پیدا کرتا ہے اور خریدکردہ اور۔

لہٰذا، بات زیادہ سے زیادہ یوں ہوئی کہ

(ا) گھی بہرحال اچھی چیز ہے۔

(ب) چوری بری چیز ہے۔

شق (ب) یعنی "چوری بری چیز ہے" قوانینِ طبیعی سے متعلق نہیں۔ ضابطۂ اخلاق (Code of Ethics) سے متعلق ہے۔

لیکن جب انسان کی زندگی صرف قوانینِ طبیعی کے ماتحت ہے تو پھر یہ ضابطۂ اخلاق کیا ہے۔ زید، چوری ڈاکہ۔ دھوکا۔ فریب سے روپیہ حاصل کرتا ہے۔ اس سے اسلحہ خریدتا ہے، اپنے گرد ایک جماعت پیدا کرلیتا ہے۔

خود بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے متوسلین کو بھی آسائش و راحت کے سامان فراہم کر کے دیتا ہے دوسری طرف عمر، صبح سے شام تک محنت کرتا ہے۔ بڑی مشکل سے چار پیسے حاصل کرتا ہے۔ عمر بھر حسرت سے دن پورے کرتا ہے۔ زندگی بڑی تنگی سے گزارتا ہے۔ زیدؔ بھی مر جاتا ہے۔ عمرؔ بھی۔ دونوں کا معاملہ (قوانین طبیعی کی رو سے) ختم ہو جاتا ہے۔ ضابطۂ اخلاق کی پابندی نے عمرؔ کو کیا دیدیا اور اس کی شکست و ریخت نے زیدؔ کا کیا بگاڑ دیا۔؟ لہذا ضابطۂ اخلاق سے فائدہ کیا ہے!

مغرب کا معلمِ اخلاق یہ جواب دیتا ہے کہ ضابطۂ اخلاق سے سوسائٹی کا نظام قائم رہتا ہے۔ یعنی ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں (وہی ہربرٹ اسپنسر، سلیم! جس کے (First Principles) کے کبھی تم بہت دل دادہ ہوا کرتے تھے) ہاں اسی ہربرٹ اسپنسر کے الفاظ میں۔ اخلاق، خوفِ انتقام (Fear for revenge) کی پیدا کردہ چیز ہے۔ یعنی میں چوری اس لئے نہیں کرتا کہ ڈرتا ہوں کہ اگر اسے معیوب نہ قرار دیا گیا تو میری بھی کوئی چیز محفوظ نہ رہ سکے گی۔ میں کسی کو فریب اس لئے نہیں دیتا کہ مجھے خوف ہے کہ اگر اس پر پابندی نہ لگائی گئی تو مجھ سے زیادہ شاطر و عیار مجھے فریب دے جائے گا۔ لہذا، اخلاقیات کی ذاتی طور پر کچھ قیمت نہیں۔ یہ نظامِ سوسائٹی کو قائم رکھنے کا ایک ذریعہ ہے، اور اس کی بنیاد، خوفِ انتقام، اور پولیس عدالت، جیل، سب اسی جذبۂ خوف کو برقرار رکھنے کے ذرائع۔

اس کا مطلب، سلیم! یہ ہوا کہ اگر میں ایسا انتظام کر لوں کہ مجھے خوفِ انتقام نہ رہے۔ یعنی میں کبھی پولیس والے کے قابو نہ آسکوں۔ اور اگر قابو آ بھی جاؤں تو عدالت پر اثر ڈال لوں۔ یا اتنی طاقت حاصل کر لوں کہ کسی دوسرے کو مجھ سے یارائے انتقام ہی نہ رہے تو پھر میرے لئے اخلاق کی پابندی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ تمہیں معلوم ہے کہ اب یورپ میں ہو کیا رہا ہے؟ وہاں اب "ذہنوں کی جنگ" (Battle of wits) ہو رہی ہے، ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ میں ایسا انتظام کر لوں کہ دوسرے کو دھوکا دے جاؤں، لیکن اسے پتہ نہ چلے۔ جرم کر جاؤں، لیکن پکڑا نہ جاؤں۔

لیکن اس صورت میں پھر بھی جرم کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس کے لئے ذرا اور آگے بڑھو۔ اگر کوئی سوسائٹی یہ فیصلہ کر دے کہ اپنے قبیلہ یا اپنی قوم میں چوری کرنا، فریب دینا، جرم ہے، لیکن دوسرے قبیلہ یا دوسری قوم کے ساتھ یہ سب کچھ روا ہے۔ تو پھر ان افعال میں جرم کا احساس بھی نہیں رہے گا۔ قدیم رومیوں میں یہی قانون تھا کہ غیر رومیوں کے ہاں چوری کر لینا معیوب نہیں۔ اس کی تقلید یورپ کی نیشنلزم نے کی ہے، ہر وہ کام جس سے اپنی نیشن کو تقویت پہنچتی ہے۔ حب الوطنی (Patriotism) کا جوہر لئے ہوئے ہے۔ ہذا در خور ستائش۔ اب وہی جنگِ عقول (Battle of wits) جو ایک قوم کے افراد میں باہمدگر تھی مختلف اقوام عالم میں سرگرم عمل ہے۔ اب ہر قوم دوسری اقوام کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں رہتی ہے۔ کرنا اس کو فقط اتنا ہوتا ہے کہ اتنی قوت فراہم کر لے کہ اسے "خوفِ انتقام" نہ رہے۔ اسی کا نام اُن کے ہاں صلاحیت ہے۔ یعنی اُن کے نزدیک زندہ رہنے کی صلاحیت اس قوم میں ہے جو خوفِ انتقام سے مامون ہو جائے اور پھر جو کچھ جی میں آئے کرے۔

یہ ہے سلیم! ماحصل مغرب کی مادی (یا میکانکی) تہذیب کا، اور یہ ہے مفہوم صلاحیت کا۔ یعنی گھی، ہر نوع توانائی بخش ہے۔ خواہ خرید کر لو، خواہ چرا کر۔

اور چوری کرو تو اس اہتمام کے ساتھ کہ تمہیں خوفِ انتقام نہ رہے۔

اگر تم نے ایسا کر لیا تو ہر روز چوری کا گھی کھاؤ۔ تم میں زندہ رہنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔

* * *

یہ ایک نہجِ فکر ہے۔ دوسری طرف ایک اور اسلوبِ فکر ہے، جس کی دعوت اس بنیاد پر ہے کہ انسان کی طبیعی زندگی طبیعی قوانین کے تابع ہے۔ لیکن زندگی صرف طبیعی ہی نہیں اس سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ طبیعی زندگی حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے۔ لیکن مقامِ انسانیت سطحِ حیوانیت سے ایک درجہ آگے ہے انسانی زندگی کی اس خصوصیت کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ غرض نام سے نہیں اس حقیقت سے ہے جس کا تعارف

اس نام سے کرایا جائے۔ مقامِ انسانیت کی یہ وہ امتیازی خصوصیت ہے جو قوانینِ طبیعی کے تابع نہیں ہیں۔ اس لئے اس کا سلسلہ بھی سانس کی آمد و رفت تک محدود نہیں۔ تارِ نفس کے ٹوٹنے کے بعد بھی یہ رشتہ قائم رہتا ہے۔ یہ وہ شے ہے جسے سلیم میں شرفِ انسانیت، کہہ کر پکارا کرتا ہوں۔ جسے حضرت علامہ (اقبالؒ) خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس طرح انسان کے جسمانی قوٰی کی پرورش اور تعمیر ایک خاص نظام کے ماتحت ہوتی ہے، اسی طرح اس شے دیگر (شرفِ انسانیت یا خودی) کی تربیت و پختگی بھی ایک خاص ضابطۂ آئین کے تابع ہوتی ہے۔ اس امتیاز کے ماتحت "گھی" اور "سرقہ" دو الگ الگ چیزیں ہو جاتی ہیں۔ گھی اپنا نتیجہ قانونِ طبیعی کے مطابق مرتب کرتا ہے۔ "سرقہ" اپنا نتیجہ اس دوسرے قانون کی رو سے متشکل کرتا ہے۔ اس قانون کو قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں جو جہانِ مشیت سے متعلق ہے۔ خدا کی ذات ان دونوں نظام ہائے قوانین (قوانینِ فطرت اور قوانینِ مشیت) کی نگران ہے۔ چنانچہ جہاں اس کا قانونِ فطرت یہ دیکھتا ہے کہ گھی کا نتیجہ جسمِ انسان کے لئے قوت بخش ہونا چاہیئے، وہاں اس کا قانونِ مکافات اس پر بھی نگاہ رکھتا ہے کہ "سرقہ" کا نتیجہ زوالِ شرفِ انسانیت یا ضعفِ خودی ہونا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ ضوابطِ قوانین اٹل ہیں اس لئے اُن کے نتائج بھی اٹل ہیں۔ قوانینِ فطرت کے مطابق عمدہ نتائج کا ماحصل صلاحیت ہے۔ اور قوانینِ مکافات کے مطابق عملِ خیر کا ماحصل صالحیت۔ قرآن ان دونوں ضوابطِ قوانین کی نگہداشت کا حکم دیتا ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی صالحیت میں صلاحیت بھی خود بخود آ جاتی ہے۔ لیکن فکرِ مغرب کی صلاحیت میں صالحیت نہیں آتی۔ سمجھے سلیم!

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس صالحیت سے نظامِ سوسائٹی خود بخود صحیح خطوط پر قائم رہے گا۔ لہٰذا وہ ضابطۂ اخلاق جسے معلمینِ اخلاق نے نظامِ سوسائٹی کے قیام کی خاطر وضع (یا اختیار) کیا تھا، اس نظامِ مکافاتِ عمل کا ایک طبعی نتیجہ (Natural oorcllary) ہو گیا۔ مقصود بالذات نہ رہا۔ قرآن کا نظام انسانی معاشرہ کو بھی صحیح خطوط پر قائم رکھتا ہے اور انسانی خودی کو ارتقائے شرفِ انسانیت کی منازل طے کراتا ہوا اس زندگی سے ارفع و اعلیٰ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت بھی عطا کرتا ہے۔ لہٰذا، نظامِ سوسائٹی کا قیام، اس سفر

ہیں سنگِ میل یا چراغِ راہ بن کر رہ جاتا ہے۔ منزلِ مقصود اس سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ یعنی یہ اس "تجارتِ عظمیٰ" کا محض (By-product) ہوتا ہے[1]۔

سوسائٹی کا نظام، ہر ایسے ضابطہ کی رو سے چل سکتا ہے جسے افرادِ سوسائٹی متفقہ طور پر تسلیم کر لیں۔ اس لئے اس نظام کو چلانے والے ضابطہ کی کوئی مستقل ذاتی قدر (Intrinsic value) نہیں ہوتی۔ مثلاً اگر کوئی سوسائٹی متفقہ طور پر طے کر لے کہ مرد اور عورت کے تعلقات کے لئے مناکحت کی ضرورت نہیں۔ یہ خالص طبیعی جذبہ ہے جس کی تسکین باہمی رضامندی سے ہر جگہ کی جا سکتی ہے۔ باقی رہے اس تسکینِ جذبات کے نتائج (یعنی اولاد) تو ان کی پرورش و تربیت کا انتظام خود سوسائٹی (حکومت) کی طرف سے ہو جائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ اس سوسائٹی کا یہ نظام بھی چل جائے گا۔ اس صورت میں، اس سوسائٹی کے ضابطۂ اخلاق میں زنا کا لفظ تک بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض نظامِ سوسائٹی کو برقرار رکھنے کے لئے جو ضابطۂ اخلاق مرتب کیا جائے گا۔

---

[1] اس مقام پر سلیم ایک اور چیز کی طرف بھی غور کرتے جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ قرآنی اوامر و نواہی کی حقانیت پر بحث کی جاتی ہے تو سارا زور اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ ان قوانین کی پابندی سے سوسائٹی کا نظام بہترین انداز سے چل سکتا ہے۔ اور قطعی یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اس سے بہتر نظامِ سوسائٹی مرتب ہی نہیں ہو سکتا۔ گویا نظامِ قرآنی سے مقصود، سوسائٹی کے نظام کو بہترین خطوط پر متشکل کرنا ہے۔ اور بس۔ یعنی جو چیز اس نظام کی محض (By-product) ہے ان کے نزدیک وہ ایک اصل مقصود ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس نظام میں سوسائٹی کا نظام بہترین خطوط پر متشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اس نظام کا آخری نتیجہ نہیں۔ یہ نظام انسان میں وہ صلاحیت پیدا کرتا ہے جس سے یہ شرفِ انسانیت کی بلند منازل طے کرتا ہوا، اپنے اندر اس زندگی سے اگلی زندگی کی سرفرازیوں کی استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ یہ ہے اس نظام کا مقصود۔ اس لئے قرآنی نظام کو ہمیشہ اس حیثیت سے دیکھنا اور اسی حیثیت سے پیش کرنا چاہیئے۔ اسی سے تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ ایمان بالآخرت کا مفہوم اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ ان امور کی وضاحت تمہیں معارف القرآن میں ملے گی۔ مجھے تمہارے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ تم اسے محض "ناول" کی طرح نہیں پڑھ رہے۔

اس کی ذاتی حیثیت (Intrinsic value) کچھ نہیں ہوگی۔ اگر ایک وقت میں مناکحت، اخلاقِ حسنہ کا جزو قرار پائے گی تو دوسرے وقت بے باکانہ تسکینِ جذبات یہی حیثیت اختیار کر لے گی۔ مثال کے طور پر آج دنیائے اقتصادیات میں ربوٰ (سود) کو نظامِ سوسائٹی نے متفقہ طور پر جائز تسلیم کر لیا ہے، لہٰذا یہ نہ اُن کے ضابطہ اخلاق کی رُو سے معیوب ہے، نہ کسی قانون کی رو سے جرم۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فکرِ مغرب کی رو سے ربوٰ (سود) فی ذاتہٖ معیوب ہے نہ مستحسن۔ اگر سوسائٹی اپنے نظام کے قیام کے لئے اسے متفقہ طور پر معیوب قرار دیدے تو یہ معیوب ہو جائے گا اور اگر متفقہ طور پر اسے اختیار کر لے تو یہ مستحسن قرار پا جائے گا۔ (جس طرح یورپ میں بائیں طرف چلنا قانونِ راہ روی ہے اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا) لہٰذا مغربی نہج فکر کے مطابق ضوابطِ اخلاق کے اجزا اپنی مستقل حیثیت کچھ نہیں رکھتے۔ جس چیز کو معاشرہ متفقہ طور پر اختیار کر لے وہ مستحسن (اور جو اس کے خلاف کرے وہ مجرم) اور جس شے کو وہ متفقہ طور پر رد کر دے، وہ معیوب (اور اس سے اجتناب کرنے والا شریف) لیکن ضابطہ قانونِ مکافات کی رو سے ہر چیز، اپنی ایک مستقل قدر (Value) رکھتی ہے۔ جس طرح عالمِ طبیعی میں "اشیاء کے خواص، انسانوں کے فیصلوں کی رو سے تبدیل نہیں ہوتے، اسی طرح عالمِ مشیت (یعنی قانونِ مکافاتِ عمل) میں بھی "اشیا" کے خواص انسانوں کے فیصلوں کی رو سے نہیں بدلتے۔ مثلاً سنکھیا قاطعِ حیات ہے۔ اگر تمام دنیا کے انسان مل کر یہ فیصلہ کر لیں کہ آج سے ہم سنکھیا کو ممدِ حیات سمجھیں گے تو اس فیصلہ سے سنکھیا پر کچھ اثر نہیں پڑے گا وہ حق ہے (یعنی اپنی خاصیت میں اٹل، اس لئے وہ "اکثریت" کی رائے کے تابع نہیں چلتا۔ اسی طرح، ربوٰ (یا مثلاً جھوٹ) قاطعِ شرفِ انسانیت ہے۔ اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی فیصلہ کر دیں کہ آج سے ہم ربوٰ (یا جھوٹ) کو ممدِ نظامِ سوسائٹی قرار دیدیں گے تو وہ اپنی تاثیر کو نہیں بدل دے گا۔ اس لئے کہ اس کا قاطعِ شرفِ انسانیت ہونا بھی حق ہے اور حق انسانوں کے فیصلوں کے تابع نہیں چلا کرتا۔ ولو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السمٰوٰت والارض ومن فیھن۔ اگر حق لوگوں کے خیالات کے تابع چلنے لگ جائے تو تمام کائنات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔ پھر جس طرح سنکھیا کو اپنی تاثیر مرتب کرنے کے لئے ایک مستقل نظامِ طبیعی کی ضرورت ہے۔ جسمانی نظام میں نہ معلوم کیسے کیسے عظیم

اور لطیف تغیرات رونما ہوتے ہیں، تب کہیں جاکر سنکھیا کی سمیت، منتج بہ ہلاکت ہوتی ہے، یا گھی، جسمانی توانائی میں تبدیل ہوتا ہے۔ اسی طرح جھوٹ کو اپنا ہلاکت آگیز، یا صداقت کو انسانیت پرور، نتیجہ مرتب کرنے کے لئے بھی ایک عظیم الشان نظام کی ضرورت ہے۔ یہ نظام ایسا ہے کہ اس میں نگاہ کی خفیف سی جنبش اور دل کی ہلکی سی لرزش تک بھی بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔ اسی حقیقت غیر متبدلہ کا اعتراف اللہ پر ایمان کہلاتا ہے۔ مغرب کے علمائے فطرت، نظامِ قوانینِ طبیعی کو اٹل مانتے ہیں۔ لیکن وہ اسے بالعموم اندھی فطرت کا میکانکی عمل قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ نظام ایک بلند و بالا ہستی کا چلایا ہوا ہے اور اس طرح وہ خدا کی ہستی کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سلیم! غور کرو کہ خدا پر اس قسم کے ایمان کا کچھ نتیجہ بھی ہوتا ہے؟ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ چاند، سورج، ستارے، زمین سب اتفاقی طور پر گردش کے سلسلۂ طبیعی میں جکڑے ہوئے ہیں اور میکانکی عمل سے رواں دواں ہیں۔ اور دوسرا شخص کہتا ہے کہ نہیں۔ انہیں خدا نے بنایا ہے اور یہ اسی کے قائم کردہ نظام کے مطابق سرگرمِ عمل ہیں کہیئے کہ جہاں تک دنیائے انسانیت کا تعلق ہے، اول الذکر کے انکار سے کیا زیاں ہوتا ہے جو ثانی الذکر کے اقرار سے پورا ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ثانی الذکر نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا ہے لیکن وہ بات۔ سلیم! اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ اس اقرارِ حقیقت سے دنیائے انسانیت میں کیا فرق پڑتا ہے۔ خدا پر حقیقی ایمان شروع ہی اس حقیقت کے اعتراف سے ہوتا ہے کہ اس کے نظام میں کوئی عمل اور کوئی حرکت بلا نتیجہ نہیں رہ سکتی اور نہ کبھی غلط نتیجہ ہی مرتب کر سکتی ہے۔ اسی لئے قرآن میں متعدد بار آیا ہے کہ ولئن سألتہم من خلق السموٰت والارض وسخر الشمس والقمر اگر تو اُن سے پوچھے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور سورج اور چاند کو کس نے مسخر کر رکھا ہے۔ لیقولن اللہ یہ اقرار کریں گے کہ اللہ نے۔ یعنی وہی ایمان جو مغرب کے علمائے فطرت میں سے خدا کو ماننے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس اعتراف کے باوجود یہ اُلٹی اُلٹی راہیں چلتے ہیں (فانی یؤفکون ۲۹/۶۲) تو یہ اس لئے کہ ان کا ایمان فقط نظامِ طبیعی کے خالق پر ہوتا ہے۔ نظام

مکافاتِ عمل کے خدا پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا مغرب کی میکانکی تہذیب میں

(i) یا تو خدا کی ہستی سے کلیتہً انکار ہی ہوتا ہے

(ii) اور اگر کہیں اقرار بھی ہوتا ہے تو فقط نظامِ طبیعی کے خالق پر۔

(iii) اس کے بعد وہ نظامِ معاشرت (سوسائٹی) کے قیام کے لئے خود قاعدے مقرر کر لیتے ہیں۔ اسی کو ضابطۂ اخلاق کہتے ہیں۔ جس کی حیثیت فقط اتنی ہوتی ہے کہ انسانوں نے متفقہ طور پر اس ضابطہ کو اختیار کر لیا ہوتا ہے۔ جیسے یورپ میں سڑک کے بائیں طرف چلنا قانون راہروی ہے اور امریکہ میں دائیں طرف چلنا۔

(iv) اور ان ضوابط پر پابندی کا محرک جذبہ، خوفِ انتقام یا مؤاخذۂ قانون ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس خوف سے مامونیت کا انتظام کرلے تو پھر اسے اس پابندی کی ضرورت نہیں رہتی۔

(v) اس نظام کی پابندی سے جماعتی قوت حاصل ہو جاتی ہے جو تسخیرِ قوائے فطرت کے ساتھ مل کر، اس قوم میں طبیعی زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

(vi) اور چونکہ زندگی ان کے نزدیک فقط یہی طبیعی زندگی ہے اس لئے جس طریق سے یہ صلاحیت حاصل ہو جائے وہی طریق مستحسن قرار پا جاتا ہے۔

اس کے برعکس، اس دوسری تہذیب کی رو سے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے

(ا) نظامِ طبیعی کے علاوہ ایک اور نظام بھی ہے جسے نظامِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ اس نظام میں ہر عمل کا ایک نتیجہ متعین ہوتا ہے۔ اور کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ اعمال کے نتائج دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس سے شرفِ انسانیت (انسانی خودی) کی نشو و نما اور بالیدگی و بہرہ مندی ہوتی ہے۔ اور دوسرا وہ جس سے اس میں ضعف و انحطاط پیدا ہو جاتا ہے۔

(ب) نظامِ طبعی کی پابندیوں سے طبیعی زندگی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور نظامِ مکافاتِ عمل

کے اتباع سے انسانی زندگی میں صالحیت پیدا ہوتی ہے۔

(ج) "صالحیت" میں "صلاحیت" خود بخود آجاتی ہے۔ لیکن صرف "صلاحیت" میں "صالحیت" نہیں آسکتی۔

اس سے سلیم! ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ

(۱) مغرب کے میکانکی نظام میں طبیعی زندگی کی صلاحیت مقصود ہے۔

(۲) قرآن کے نظامِ ایمان و عمل میں طبیعی زندگی کی صلاحیت کے ساتھ ماورائے حیاتِ طبیعی، کی صالحیت بھی آجاتی ہے۔ اور

(۳) "عجمی اسلام" کے نظامِ تنویم میں نہ صلاحیت ہوتی ہے نہ صالحیت۔ خسر الدنیا والآخرہ وذٰلک خسران المبین

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

* * *

کیوں سلیم! ملا جواب تمہارے سوال کا؟ سمجھ گئے فرق صلاحیت اور صالحیت میں؟ اب آگیا تمہارے ذہن میں کہ جو وراثتِ ارض خدا کی طرف سے ملتی ہے، وہ مشروط بہ صالحیت ہوتی ہے۔ لیکن جو حکومت، سلطنت فقط صلاحیت (مادی قوت) کا نتیجہ ہوتی ہے وہ ابلیسی نظام کی عطا کردہ ہوتی ہے، اور جس میں نہ وہ ملتی ہے، نہ یہ وہ "عجمی اسلام" ہے۔

میں نے سلیم! اس خط میں دانستہ اس بات کو نہیں چھیڑا کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ

(i) طبیعی زندگی کے علاوہ انسانی زندگی میں کچھ اور بھی ہوتا ہے۔

(ii) قوانینِ فطرت کے علاوہ قوانینِ مکافاتِ عمل بھی ہیں۔

(iii) ان قوانین کی رو سے اعمال کے نتائج متعین اور ان کی اقدار (Values) مستقل ہیں۔ میں ان

چیزوں کو بطور حقیقتِ ثابتہ بیان کر گیا ہوں۔ علمی طور پر انہیں پیش نہیں کیا۔ میں نے اس وقت دانستہ اس بحث کو نہیں چھیڑا۔ اس لئے کہ اس سے بات، تمہارے سوال سے بہت دور نکل جاتی۔ تم جانتے ہو کہ میں نے ان چیزوں کو محض عقیدۃً نہیں مان رکھا، علیٰ وجہ البصیرت مانا ہے۔ اس لئے علیٰ وجہ البصیرت سمجھا بھی سکتا ہوں۔ لیکن اسے کسی دوسری فرصت پر اٹھا رکھو۔ سردست اگر تم ان ہی باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ لو جو اس خط میں سامنے آگئی ہیں تو مجھے امید ہے کہ اس سے تمہارے بہت سے الجھاؤ دور ہو جائیں گے۔ امید اس لئے ہے کہ تمہارا قلب سلیم ہے اور سعادت و ہدایت کی راہیں اُسی کے لئے کشادہ ہوتی ہیں من اتی اللہ بقلب سلیم جو اللہ کی طرف قلب سلیم لے کر آئے۔ عم مرحوم نے سلیم! تمہارا نام بھی کس قدر تمہاری سرشت کے عین مطابق رکھا ہے۔ تم بڑے ہی خوش بخت ہو۔ اچھا خدا حافظ!

والسلام

مئی سنہ ۱۹۴۸ء

سلیم کے نام نواں خط

کیا انسانی زندگی محض آب و گل کا کھیل ہے؟

مجھے پہلے ہی اندازہ تھا سلیم! کہ تم صبر نہیں کرسکو گے اور ضرور پوچھ کر رہو گے؟ تمہاری اس بیتابیٔ تمنا پر مجھے رہ رہ کر وہ ماجرا یاد آجاتا ہے جو "خدا کے ایک بندے" (جنہیں عام طور پر خواجہ خضر کہا جاتا ہے) اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان گذرا تھا۔ جب حضرت موسیٰؑ نے اُس "اللہ کے بندے" سے کہا کہ میں تمہارا رفیق سفر بننا چاہتا ہوں تو اس نے کہا کہ تم چلنے کو تو میرے ساتھ چلے چلو۔ لیکن مجھے اندیشہ یہ ہے کہ انك لن تستطيع معي صبرا (۱۸/۶۷)۔ "تم میرے ساتھ صبر نہیں کرسکو گے" اور یہ کہہ کر اس کی وجہ بھی بتادی کہ وكيف تصبر علىٰ ما لم تحط به خبرا (۱۸/۶۸)۔ تمہارا جی چاہے گا کہ ہر وہ بات جس کی تمہیں خبر نہیں، تمہیں بتا دی جائے۔ اس خواہش کا روکنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ جو نئی بات اس کے سامنے آئے اسے اس کی کنہ حقیقت کا علم ہو جائے۔ انسان کا یہ ذوق تجسس ہی تو ہے جو اسے اس طرح صحراؤں اور سمندروں میدانوں اور پہاڑوں میں لئے لئے پھرتا ہے۔ حصول علم کا سارا راز تسکین استعجاب (Satisfaction of curiosity) میں ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو بچوں کو ہمہ تن استفسار بنائے رکھتا ہے۔ "یہ کیا ہے؟" "وہ کیا ہے؟" "یہ کیوں ہے؟" "یہ۔ کیوں" کا مرحلہ۔ وہ مقام ہوتا ہے جہاں بڑے بوڑھے جھنجلا اٹھتے ہیں، یہی بھی انسان کی، عروس حقیقت کے چہرہ سے نقاب

کشائی کی وہ بے پناہ خواہش جس کی طرف اس۔ اللہ کے بندے۔ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ وکیف تصبر علیٰ مالم تحط بہ خبرا (۱۸/۶۸) حضرت موسیٰؑ نے اس سے وعدہ کر لیا کہ ستجدنی انشاء اللہ صابرا (۱۸/۶۹) اگر اللہ نے چاہا تو تو دیکھ لے گا کہ میں کس طرح خاموش رہتا ہوں۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ یہ وعدہ خود اس آتشِ شوق کی غمازی کر رہا تھا جو تلاشِ حقیقت کے لئے ان کے سینے میں موجزن تھی۔ چنانچہ پہلے ہی قدم پر اپنا وعدہ بھول گئے اور بے اختیار پکار اٹھے کہ تو نے یہ کیا کیا۔ وہ مردِ بزرگ مسکرائے اور کہا کہ الم اقل انک لن تستطیع معی صبرا (۱۸/۷۲) کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ تم سے نہیں رہا جائے گا۔ ادراکِ حقیقت کی خلش تمہیں بے قابو کر دے گی۔ تم سے ضبط نہیں ہو سکے گا۔ یہ کام بڑا مشکل ہوتا ہے۔ بالخصوص "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" کے لئے تو اس قسم کا ضبط ناممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔ تلاشِ حقیقت کا یہی والہانہ جذبہ تھا جسے قرآن نے دو لفظوں میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ جب کہا کہ

ووجدک ضالاً فھدیٰ (۹۳/۷)

ہم نے تجھے (اے رسول) تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو راستہ دکھا دیا۔

یہی تھی وہ کیفیت جسے کارلائل نے ان حسین الفاظ میں بیان کیا ہے۔

شروع ہی سے، چلتے پھرتے، آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے۔

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز کو نصب العین حیات بنانا چاہیئے؟

مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

حرا اور فاران کی پہاڑیاں۔ ریت کے ٹیلوں کا سکوت۔ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔ چرخ چنبری اور اس کے درخشندہ ستارے بھی خاموش تھے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ ان سوالات کا جواب ملتا تھا انسان کی اپنی ذات اور خدا کی اس وحی سے جو اس ذات کو اپنا مہبط بنا لے[1]

(Heroes and Hero Worship)

اس لئے تمہارے اس استفسار پر مجھے حیرت نہیں ہوئی البتہ ذرا سا تامل ضرور ہوا۔ اور وہ اس لئے کہ سوال ہے صبر طلب اور تم ہو بیتاب تمنا۔ لہذا میری مشکل یہ ہے کہ

دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک[2]

تم پوچھتے ہو کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ انسان کی زندگی، یہی طبعی زندگی (Physical Life) نہیں اس کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ اور ثبوت چاہتے ہو اس قسم کا کہ تمہیں جناح ہسپتال کے اپریشن تھیٹر میں لے جا کر بتا دوں کہ وہ دیکھو! جس مریض کا سینہ چیرا گیا ہے، اس کے دل کے پاس اس تھیلی میں وہ چیز رکھی ہے، جسے لوگ روح کہتے ہیں اور جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اس قسم کا ثبوت تو میرے بس کی بات نہیں۔ البتہ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ تم مغربی اساتذۂ سائنس و فلسفہ کے اقوال کو سند تسلیم کر لیتے ہو، اس لئے میں اتنا تو کر سکتا ہوں کہ تمہیں یہ بتا دوں کہ اس باب میں وہ کیا کہتے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں اس حقیقت کے سمجھنے میں خود بخود آسانی ہو جائے گی کہ اس ضمن میں قرآن کیا کہتا ہے۔ میں نے دراصل سلیم! اس مشکل ترین مسئلہ پر معارف القرآن کی پانچویں جلد میں نہایت شرح و بسط سے بحث کی ہے لیکن چونکہ اس کی اشاعت میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے "معراج انسانیت"۔ باب "ووجدك ضالاً فهدىٰ"

[2] غالب

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب

دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

(اگرچہ اس کے مسودے کی تکمیل ایک عرصہ سے ہو چکی ہے) اور تم اتنی دیر تک خاموش نہیں بیٹھ سکو گے، اس لئے اس خط میں (تفصیلاً نہیں) محض اختصاراً کچھ لکھ سکوں گا۔ اسی اختصار سے تفصیل تک پہنچنے کی کوشش کرنا

انسانی زندگی کے متعلق ایک تصور تو وہ ہے جسے عام طور پر میکانکی نظریۂ حیات (Mechanistic CONCEPT OF LIFE) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا موجد یونانی فلاسفر دیمقریطس قرار دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس نظریہ کی تفاصیل میں، دیمقریطس کے زمانے سے لیکر آج تک بڑے بڑے اہم اختلافات پیدا ہوئے ہیں لیکن اس کا ماحصل وہی ہے جسے اقبالؔ نے دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں سمو دیا ہے۔ یعنی

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است

اس نظریہ کی رو سے مانا یہ جاتا ہے کہ انسان بس اسی آب و گل کا پیکر ہے۔ مٹی کا گھروندا جو طبعی حادثہ کی کسی ایک ٹھوکر سے خاک کا ڈھیر بن جاتا ہے۔ نہ اس کا کوئی مستقبل ہے، نہ کاروانِ زندگی کی کوئی منزل۔ یہی وہ تصور ہے جسے چکبستؔ نے اپنے اس مشہور شعر میں (جسے تم کئی مرتبہ سن چکے ہو) یوں بیان کیا ہے کہ

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ ان ہی اجزاء کا پریشاں ہونا

یعنی مختلف عناصر (Physical Elements) میں کسی نہ کسی طرح، محض اتفاقی طور پر، ایک خاص ترتیب پیدا ہو گئی جس سے بے جان مادہ، جاندار بن گیا۔ جب تک یہ ترتیب قائم رہتی ہے، انسان زندہ کہلاتا ہے۔ جب کسی حادثے سے (وہ ہنگامی ہو یا بتدریج واقع ہو جائے) یہ ترتیب درہم برہم ہو جائے گی تو زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ انسان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔ وہ تھی زندگی کی نمود۔ یہ ہے اس کا انجام۔ اللہ۔ اللہ خیر سلا۔ اس تصورِ حیات کے ماتحت، سلیم! ان لوگوں کے نزدیک زندگی کے سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔

اور انسان بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے کہ

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

چار دن کی زندگی ہے۔ کھاؤ، پیو، مزے اڑاؤ (Eat, drink & be merry) انسانی زندگی کے تقاضے سب جسم کے تقاضے ہیں۔ عیش و آرام کی زندگی ہی مقصود حیات ہے۔ اس قسم کی زندگی کے لیئے دولت کی ضرورت ہے۔ جو شخص دولت حاصل کر لیتا ہے (خواہ کسی طریقے سے ہو) اس کے ہاں سامان زیست کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ وہ جسم کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے سب کچھ خرید سکتا ہے۔ اس کی زندگی کو بڑی کامیاب زندگی کہا جاتا ہے۔ ناکام وہ ہے جو دولت حاصل نہ کر سکے۔ جو عیش و عشرت کے سامان مہیا نہ کر سکے۔ اس انداز کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ اُن ضوابط کی پابندی ضروری ہوتی ہے جو سوسائٹی نے متعین کر رکھے ہوں۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا انتظام کر لے کہ وہ سوسائٹی کی گرفت میں نہ آ سکے تو اسے ان قواعد و ضوابط کی پابندی کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ تم گل نواز خاں سے واقف ہو وہ تمہارے محلے ہی میں تو رہتا تھا۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ وہ بڑے بڑے چوروں کا سربراہ ہے۔ اس کا گزارہ ہی "چار سو بیس،، پر تھا۔ لیکن چونکہ وہ پولیس کو اپنے ساتھ ملائے رکھتا تھا۔ اس لئے وہ ساری عمر زنلٹے سے رہا اور اچھی خاصی جائیداد چھوڑ کر مرا۔ اور ایک گل نواز خاں ہی پر کیا موقوف ہے۔ ہمارے معاشرے میں قدم قدم پر اس قسم کے گل نواز ملتے ہیں۔ کوٹھیاں ہیں۔ موٹریں ہیں۔ نوکر چاکر ہیں۔ وسیع و عریض دستر خوان ہے۔ افسروں سے یارانہ ہے۔ پارٹیوں اور رشوتوں کے زور پر ہر جگہ عزت حاصل ہے۔ یہی زندگی کی کامیابی ہے۔ اس کے بعد موت آ جاتی ہے جس سے کسی کو بھی مفر نہیں، جسم کی طبعی مشینری چلتے چلتے رک جاتی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد خود جسم بھی گل سڑ جاتا ہے۔ قصہ ختم ہو جاتا ہے اس نظریہ کے ماتحت سلیم! زندگی کی کوئی اور شکل سامنے آ ہی نہیں سکتی۔ ایک شخص جھوٹ فریب، مکر، دغا بازی، بدمعاشی، چالاکی، عیاری سے دولت کماتا، عیش اڑاتا، اور اس کے بعد مر جاتا ہے دوسرا شخص عمر بھر دیانت داری کی زندگی بسر کرتا ہے۔ بھوکوں مرتا ہے۔ فاقے اٹھاتا ہے۔ تنگ حال

رہتا ہے اور اسی عسرت کی حالت میں اسے موت آجاتی ہے۔ میکانکی نظریۂ حیات کے مطابق مرنے کے بعد دونوں کا معاملہ برابر ہے۔ یعنی دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔ اس نظریہ کے حامی یہ کہتے ہیں کہ اس دیانت دار کی اصول پرستی نے اسے کیا دیدیا جس سے وہ بدمعاش محروم رہا۔ اس کے برعکس اس بدمعاش کی عیاریوں نے اسے یقیناً وہ کچھ دیدیا جس سے اس دیانت دار کی اصول پرستی نے اسے محروم رکھا۔ یعنی دھن دولت۔ عیش و آرام۔ ناز و نعمت۔ ہر چیز سے محروم رکھا۔ لہٰذا سلیم! اگر زندگی اس جسم کی زندگی ہے اور اس کے بعد یکسر خاتمہ ہے تو پھر اصول و اخلاق کے لئے دنیا میں کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس صورت میں صرف سوسائٹی کے قوانین و ضوابط کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ اور جو شخص ان قوانین سے بچ نکلنے (Evasion) کی تدبیر کر سکتا ہے اس کے لئے یہ ضوابط بھی کچھ معنی نہیں رکھتے۔ اس لئے سلیم! تمہارا یہ سوال کہ انسانی زندگی اس جسم تک محدود ہے یا اس سے الگ کچھ اور بھی ہے، محض نظری سوال (Academic question) نہیں۔ اس کا زندگی کے مسائل سے بڑا بنیادی تعلق ہے

لہٰذا سوال یہ ہے کہ زندگی یہی طبعی زندگی ہے۔ یا اس کے ماورا کچھ اور بھی۔ موت، انسان کا خاتمہ کر دیتی ہے یا انسان میں کچھ ایسا بھی ہے جو موت سے ختم نہیں ہو جاتا۔

تم نے سلیم! کالج میں (Katabolism : Anabolism) اور (Metabolism) کے متعلق پڑھا تھا۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ انسانی جسم کے کثیر التعداد خلیات (CELLS) ہر وقت ضائع ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلۂ فنا و تجدید مسلسل جاری رہتا ہے۔ تا آنکہ کچھ وقت کے بعد سابقہ جسم تمام کا تمام ایک نئے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کچھ سمجھے سلیم! کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سلیم جو کالج میں پڑھتا تھا مدت کا ختم ہو لیا۔ اور اب ایک بالکل نیا سلیم ہے جو مجھ سے اس قسم کے سوالات پوچھتا رہتا ہے۔ بالکل نیا سلیم۔ اس سلیم میں اُس سلیم کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں۔ کیا تحیر انگیز ہے یہ انکشاف سلیم! کہ وہ سلیم جو

دس برس پہلے ہمارے ہاں آیا کرتا تھا، اس کا کہیں نام و نشان تک باقی نہیں۔ اگر سلیم! کہیں طاہرہ کو اس کا پتہ چل جائے کہ تم وہ سلیم نہیں ہو جس سے اس نے شادی کی تھی، تو سوچو کہ اس کی حالت کیا ہو جائے! اور اگر تمہاری امّی کو اس کا علم ہو جائے کہ جس سلیم کو اُس نے دودھ پلایا تھا، وہ سلیم کوئی اور تھا، تو اس کے دل پر کیا گزرے؟ لیکن سلیم! نہ تو طاہرہ اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگی کہ تم وہ سلیم نہیں ہو اور نہ ہی تمہاری امّی۔ وہ تو ایک طرف رہیں، تم خود بھی اسے تسلیم کرنے پر کب آمادہ ہو کہ تم وہ نہیں ہو جو دس سال پہلے تھے۔ تم نے دس سال پہلے جو قول استوار زاہدہ سے کئے تھے۔ تم آج بھی اسی طرح محسوس کر رہے ہو کہ وہ تم ہی نے کئے تھے۔ جب تم کہتے ہو کہ میں نے امّی جان سے یہ کہا تھا تو تم ایک ثانیہ کے لئے بھی محسوس نہیں کرتے کہ وہ کہنے والا کوئی اور تھا اور تم کوئی اور ہو۔ زندگی کے وہ چند لمحات جن میں کبھی جنّت کی بہاریں مسکرائی ہوں، ان کی یاد آج بھی تمہارے دل میں وہی شادابیاں پیدا کر دیتی ہے جو اُس وقت وجہ شگفتگی بنی تھیں جب برسوں پہلے وہ وقعہ ظہور میں آیا تھا۔ اسی طرح وہ غم آلود حوادث جن سے کبھی دل میں ٹیس پیدا ہوئی تھی، اُن کا تصور آج بھی اسی طرح پلکوں کو نم آلود کر دیتا ہے۔ حالانکہ طبیعیاتی طور پر (Physically) آج نہ وہ "دل" ہے جو اُس وقت تھا اور نہ ہی وہ پلکیں۔ سلیم! سوچو کہ جسم کے ایک ایک ذرّے کے تبدیل ہو جانے کے بعد بھی، وہ کیا چیز ہے جو بدستور اسی طرح قائم رہتی ہے اور جس میں قطعاً کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر انسان نام ہے فقط اس جسم کا جو ہر آن بدلتا رہتا ہے اور جس کا کوئی حصّہ بھی کچھ عرصے کے بعد باقی نہیں رہتا، اور بالکل ایک دوسرے جسم میں تبدیل ہو جاتا ہے، تو اس کے اندر یہ نہ بدلنے والا عنصر کیا ہے جس کے احساس سے انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ

نہ وہ بدلے۔ نہ دل بدلا۔ نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیونکر اعتبار انقلاب آسماں کر لوں

اور جس کے بدلنے کی بعض اوقات اس شدت سے دعائیں مانگی جاتی ہیں کہ

بدل دے اور دل اس دل کے بدلے
الٰہی! تو تو رب العالمیں ہے

اس سے ظاہر ہے سلیم! کہ جب تم کہتے ہو کہ "میں" نے یہ کہا تھا، تو اس "میں" سے مراد تمہارا جسم نہیں ہوتا۔ اس کے ماسوا کچھ اور ہوتا ہے یہی وہ میں (I) ہے جسے انسانی ذات (Personality) یا نفس (Self) یا آنا یا (اقبال کے الفاظ میں) خودی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ آنا (میں) ہے جس کے متعلق باردیو (Berdyeav) کہتا ہے

Personality is changelessness in change

تغیر میں ثبات، یہ ہے انسانی ذات۔ یہ قول درحقیقت برگسان کے ان الفاظ کی تشریح ہے جن میں اس نے کہا ہے کہ

We change without ceasing

یعنی "ہم میں تغیر آتا ہے معدوم ہوئے بغیر"۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ تغیر (Change) سے مفہوم یہ ہے کہ جس چیز میں تغیر آتا ہے وہ باقی نہیں رہتی، معدوم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی جگہ ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔ لیکن، برگسان کہتا ہے کہ انسانی ذات ایک ایسی شے ہے جس کی وجہ سے ہم تغیرات سے پیہم گزرنے کے باوجود معدوم نہیں ہوتے۔ "میں" ہمیشہ وہی رہتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ فنا نہیں ہوتی۔ یہی وہ تغیر ناآشنا، مستقل، غیر متبدل شے ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر وہائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ "کوئی فلسفہ بھی ہو، اسے تشخص ذات کے متعلق کوئی نہ کوئی نظریہ رکھنا ہی پڑے گا۔ اسی اعتبار سے، انسانی زندگی میں پیدائش سے موت تک، وحدت رہتی ہے۔" یہی وہ نہ بدلنے والی وحدت ہے جس پر اخلاقیات کی ساری عمارت قائم ہے۔ راشڈل کے الفاظ میں:

اخلاقی نظام کا دارمدار ہی اس مسلمہ پر ہے کہ "میں"، اپنے تمام گذشتہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہوں اس لئے اگر کچھ عرصہ کے بعد "میں" وہ نہیں رہتا جو پہلے تھا تو اس صورت میں، میں اپنے سابقہ فیصلوں اور معاہدوں کا ذمہ دار ہی نہیں قرار پاتا۔ اگر صورت حال یہ ہو تو پھر کسی شخص پر معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام ہی عائد نہیں کیا جا سکتا۔

اور نہ ہی کسی مجرم کو سزا دی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ جس شخص نے جرم کیا تھا اگر وہ آج باقی نہیں، تو اُس کے جرم کی سزا اس دوسرے شخص کو کیوں دی جائے، جس کا اگرچہ نام وہی ہے لیکن جو درحقیقت مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے۔

* * *

اس مقام پر تم یہ کہو گے سلیم! کہ جس چیز کا نام ہم نے انسانی ذات یا اَنا (میں) رکھا ہے وہ درحقیقت اس کا حافظہ (Memory) ہے۔ اگر کسی کا حافظہ خراب ہو جائے تو اسے ماضی کے تمام واقعات و حوادث بھول جاتے ہیں۔ اسے قطعاً یاد نہیں رہتا کہ اس نے پچھلے سال کیا کہا تھا اور گزشتہ ماہ کیا وعدہ کیا تھا حتیٰ کہ ایسے حوادث (Accidents) بھی پیش آتے ہیں جن میں انسان کا حافظہ یکسر معدوم ہو جاتا ہے اور اسے اپنے ماضی (Past) کے متعلق کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اپنا نام تک بھول جاتا ہے۔ مکان تک کا پتہ نہیں دے سکتا بیوی بچوں تک کو نہیں پہچانتا۔ اس کا، وہ پرانا "میں"، بالکل ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نئے "میں" کی ابتدا ہوتی ہے۔ لہٰذا انسانی ذات یا اَنا کوئی شے نہیں۔ یہ صرف انسانی حافظہ ہے اور چونکہ حافظہ مرنے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے اس لئے موت کے بعد انسان کا کچھ باقی نہیں رہتا۔

یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن بادنیٰ تعمق اس کی حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسانی ذات (یا میں) اپنے تمام فیصلوں کو جسم کے ذریعے بروئے کار لاتی ہے۔ جب میں فیصلہ کرتا ہوں کہ کسی چیز کو اٹھاؤں تو میرا ہاتھ اس فیصلے کو بروئے کار لاتا ہے۔ جب میں ارادہ کرتا ہوں کہ اُٹھ کر باہر جاؤں تو میرے پاؤں اس ارادے کی تکمیل کرتے ہیں۔ لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ فالج سے میرے ہاتھ یا پاؤں کی حرکت بند ہو جائے تو پھر اس

میں" کا کوئی فیصلہ بروئے کار نہیں آتا۔ نہ میں اس چیز کو اٹھا سکتا ہوں جسے اٹھانا چاہوں، نہ وہاں جا سکتا ہوں جہاں جانے کا ارادہ کروں"۔ اس سے تم کیا سمجھو گے سلیم! کیا یہ سمجھو گے کہ "میں" کوئی چیز نہ تھی، یہ درحقیقت ہاتھ پاؤں کی حرکت کا نام تھا۔ جب یہ حرکت بند ہو گئی تو میں بھی ختم ہو گئی (اسی طرح جب سارے جسم کی حرکت بند ہو جائے گی تو "میں" کلیتہً ختم ہو جائے گی؟) میرا خیال ہے کہ تم ایسا کبھی نہیں کہو گے۔ تم یہی کہو گے کہ "میں" کے فیصلوں کے بروئے کار لانے کے جو ذرائع تھے (ہاتھ، پاؤں)، ان میں خرابی آگئی ہے۔ "میں" بدستور موجود ہے۔

اب اسی مثال کو ذرا آگے بڑھاؤ۔ انسانی دماغ (Brain) وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنے احساسات کے نقوش کو حسبِ ضرورت سطح سے اوپر لاتی ہے۔ جب دماغ پر کوئی عارضہ لاحق ہو جاتا ہے، تو اس کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے اور انسانی ذات کے احساسات کے نقوش، اس شدت سے سطح پر نہیں آتے جس شدت سے پہلے آتے تھے۔ اس کا نام ہماری اصطلاح میں، حافظہ کی کمزوری ہے۔ بعینہٖ جس طرح ہاتھ کے اعصاب کی کمزوری سے ہم اس چیز کو اٹھا نہیں سکتے جسے ہم اٹھانا چاہیں (یا جسے ہم پہلے اٹھا سکتے تھے) اور اگر کبھی ایسا ہو کہ کسی حادثہ سے دماغ مفلوج ہو جائے تو وہ قطعاً اس قابل نہیں رہتا کہ انسانی ذات کے کسی احساس کو بھی بروئے سطح لا سکے۔ اسی کا نام ماضی کے حادثے کا گم ہو جانا ہے۔ اس سے تم نے سمجھ لیا ہو گا سلیم! کہ دماغ، ایک ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنے بعض مقاصد کو پورا کرتی ہے۔ دماغ خود انسانی ذات نہیں۔ اس لئے دماغ کے خراب ہو جانے یا موت سے بیکار ہو جانے سے یہ مطلب نہیں کہ انسانی ذات بھی ختم ہو گئی۔ تمہیں یاد ہے سلیم!

گذشتہ گرمیوں میں جب تم ایک شام ریڈیو کے پروگرام سننے میں جذب تھے تو یکایک ریڈیو سے آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ تمہیں اضطراب تھا کہ ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹنگ بند ہو گیا یا تمہارے سیٹ (Set) میں کوئی خرابی آگئی۔ معلوم یہ ہوا کہ سیٹ ہی میں خرابی آگئی تھی۔ اس وقت ایتھر کی لہریں بدستور تمہارے کمرے میں موجود تھیں۔ ان لہروں میں ریڈیو اسٹیشن سے نشر شدہ پروگرام بھی بدستور موجود تھا۔ لیکن تمہارے لئے ان لہروں کا

اور ان کے بردوش پروگرام کا عدم اور وجود برابر تھا۔ تم محسوس تک نہیں کر سکتے تھے کہ وہ لہریں اور وہ پروگرام کہیں موجود بھی ہے۔ اب سوچو کہ اگر کوئی شخص، سیٹ کی خرابی سے اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ریڈیو کی لہریں معدوم ہو گئی ہیں تو اس کا یہ خیال کس قدر غلط ہوگا۔ اسی سے یہ قیاس کر لو کہ دماغ وہ ریڈیو سیٹ ہے جس کے ذریعے انسانی ذات اپنے احساسات و تاثرات کا مظاہرہ کرتی ہے اگر کبھی دماغ خراب ہو جائے تو انسانی ذات کے احساسات و تاثرات تو بدستور موجود ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان کے اظہار کا ذریعہ بیکار ہو چکا ہوتا ہے اس لئے ہم ان تاثرات کو محسوس نہیں کر سکتے۔ حافظہ، انسانی ذات کے احساسات و تاثرات کے ریکارڈ روم کا نام ہے۔ دماغ اس حافظہ کے مشہود Manifest کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے حافظہ اور دماغ الگ الگ چیزیں ہیں۔ دماغ کا تعلق طبعی جسم Physical Body سے ہے اور حافظہ کا تعلق انسانی ذات (I) سے جو غیر طبعی ہے۔ کیونکہ وہ تغیرات سے متاثر نہیں ہوتی۔ برگساں نے اس موضوع کو اپنی معرکہ آرا تصنیف: ... Matter and Memory میں بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ وہ مختلف نظریات کا تجزیہ کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ

> آپ نے اب سمجھ لیا ہوگا کہ حافظہ کیوں دماغ کا فعل نہیں ہو سکتا۔ دماغ، حافظہ کے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور اسے مادی قالب میں سمو کر اس قابل بنا دیتا ہے کہ یہ حال Present پر اپنا تصرف کر سکے، لیکن خالص حافظہ، مادی شے نہیں۔ یہ روحانیت کا مظہر ہے۔ حافظہ کی دنیا درحقیقت روح کی دنیا ہے۔

اوسپنسکی تو اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ دماغ کے خلیات Brain Cells جسم کے دوسرے خلیات سے بالکل مختلف ہوتے ہیں اور نا قابل فنا۔ بہرحال اگر اوسپنسکی کے اس نظریہ سے اتفاق نہ بھی کیا جائے، تو بھی یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ دماغ صرف حافظہ کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ حافظہ دماغ کی پیداوار نہیں، حافظہ انسانی ذات پر مرتسم شدہ نقوش کا نام ہے۔ اس لئے دماغ کے خراب یا مستقل طور پر بیکار ہو جانے سے

انسانی ذات فنا نہیں ہو جاتی۔ فقط اس کے اظہار کا ذریعہ معطل ہو جاتا ہے۔

جاگ رہے ہو سلیم! یا سو گئے؟ مجھے تو امید نہیں کہ تم اس قدر خشک موضوع کو دلچسپی سے سن رہے ہو گے۔ لیکن جب تم نے خود ہی ایسا موضوع چھیڑ دیا ہے تو اسے صبر سے سننا ہی ہو گا۔ اگر اتنی تاب نہ تھی تو پھر

مکتبِ عشق میں کیا کام تھا۔ آیا کیوں تھا؟

بہرحال، بات یہاں تک پہنچی تھی کہ انسانی ذات، دماغ سے بالکل الگ شے ہے اور دماغ کے معطل یا بیکار ہو جانے سے اس میں کوئی کمی نہیں آتی۔ پروفیسر (Erwin Schrodinger) نے ایک چھوٹی سی لیکن بڑی اہم کتاب لکھی ہے (What Is Life)۔ وہ اس میں لکھتا ہے۔

> "میں" کسے کہتے ہیں؟
>
> اگر آپ "میں" کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ انسانی تجارب اور حافظہ سے کچھ زیادہ کا نام ہے۔ یہ وہ پردہ ہے جس پر انسانی حافظہ اور تجربہ کے نقوش جمع ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنی داخلی دنیا کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ جسے آپ "میں" کہتے ہیں۔ وہ اس بنیاد کا نام ہے جس پر تجربے اور حافظے کی عمارت اٹھتی ہے۔ اگر کوئی ماہر عمل تنویم ایسا بھی کر دے کہ تمہاری تمام سابقہ یادداشت یکسر ذہن سے محو ہو جائے۔ پھر بھی تم دیکھو گے کہ اس سے تمہاری "میں" کی موت واقع نہیں ہو جائے گی۔ لہٰذا انسانی ذات کی ہستی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ نہ ہی کبھی ضائع ہو گی۔

عملِ تنویم (Hypnotlsm ، کے متعلق میں نے سلیم! تمہیں وہ قصہ سنایا تھا جسے ہکسلے نے اپنے ہاں لکھا ہے۔ ایک عامل نے اپنے معمول کو بیہوش کر دیا۔ بالکل بے ہوش۔ اس بے ہوشی کے عالم میں اس سے کہا کہ دیکھو! جب شام کے چھ بجیں تو تم اپنے کمرے کی گھڑی کو اٹھا کر باہر پھینک دینا۔ اس کے بعد وہ معمول کو ہوش میں لے آیا۔ (اس وقت بارہ بجے تھے) معمول، ساری دوپہر اور سہ پہر بالکل اچھا بھلا اپنے کام کاج میں مصروف

رہا۔ اسے قطعاً یاد نہیں تھا کہ اس کی بیہوشی کے عالم میں عامل نے اس سے کیا کہا تھا۔ چھ بجے کے قریب وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا، اپنے کمرے میں تاش کھیل رہا تھا۔ جوں ہی گھڑی نے چھ بجائے وہ یک لخت اٹھا اور یہ کہہ کر اُسے باہر پھینک دیا کہ اس کی ٹک ٹک نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اس کے بعد وہ پھر نہایت اطمینان سے اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا اور تاش کھیلنے لگ گیا۔ عملِ تنویم کا اثر ان کے دماغ پر نہیں ہوتا، اس کی ذات پر ہوتا ہے۔ اور دماغ (اور دوسرے حواس۔ بصارت، سماعت وغیرہ) اس لئے معطل ہو جاتے ہیں کہ انسانی ذات ان سے اس وقت کام نہیں لینا چاہتی۔

عملِ تنویم کا ذکر آگیا تو تمہیں ضمناً ایک اور اہم بات بھی سنا دوں۔ معمول سے عالمِ بے ہوشی میں آپ جو جی میں آئے منواتے جائیے۔ وہ آپ کی ہر بات پر ہاں کرتا جائے گا۔ لیکن اگر آپ نے کوئی بات ایسی کہی جو اس کے عقیدے کے خلاف ہو، تو وہ اس کے جواب میں کبھی ہاں نہیں کرے گا۔ عقیدے کا اثر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ اس بے ہوشی کے عالم میں بھی آپ اسے معمول کی لوحِ ذات سے مٹا نہیں سکتے۔ اس سے اندازہ لگا لو سلیم! کہ انسان کے معتقدات کا بدلنا، (خواہ وہ کیسے ہی غلط کیوں نہ ہوں) کس قدر مشکل کام ہے۔ اب تو تمہاری سمجھ میں یہ بات بھی آگئی ہو گی کہ مسلمان اپنے غلط مذہب کو چھوڑ کر کیوں قرآن کے قریب نہیں آتا۔ حالانکہ اس کی تعلیم اس قدر عقل و بصیرت کے مطابق اور علم و دانش کو اپیل کرتی ہے۔

بہر حال۔ یہ تم نے سمجھ لیا سلیم! کہ

(۱) انسان جسم ہی کا نام نہیں، جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو طبعی تغیرات سے متاثر نہیں ہوتی۔ اسے انسانی ذات، یا نفس، یا اَنا یا ایگو یا خودی یا تشخص کہتے ہیں۔

(۲) انسانی ذات دماغ کا نام نہیں۔ دماغ وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنے نقوش کا مظاہرہ کرتی ہے۔ دماغ کے خراب ہو جانے سے انسانی ذات کے ان نقوش کا مظاہرہ نہیں ہو سکتا لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دماغ کے بیکار ہو جانے سے انسانی ذات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات اسطرح

سے ختم نہیں ہوتی۔

قرآن نے انسانی ذات کے متعلق کہا ہے کہ اس کا تعلق مادی دنیا سے نہیں جس میں ہر آن تغیرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اسے اس نے "روح خداوندی" یا (Divine Energy) سے تعبیر کیا ہے جو تغیرات سے بلند و بالا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہانتک انسان کے جسم کی طبعی ساخت کا تعلق ہے اس میں اور حیوانات میں کوئی فرق نہیں۔ استقرارِ حمل سے ان دونوں کی ابتدا ہوتی ہے اور دونوں رحمِ مادر کے اندر مختلف پہلو بدلتے ہوئے ایک خاص شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ انسان کی تخلیق میں ایک نئی منزل آتی ہے اور وہ یہ کہ فنفخنا فیہ من روحنا اس میں الوہیاتی توانائی (Divine Energy) کا کرشمہ ڈال دیا جاتا ہے۔ اسی کا نام انسانی ذات یا نفس یا انا یا خودی ہے۔ اسی سے انسان صاحب اختیار و ارادہ ہوتا ہے اور اسی سے انسان کی انسانیت مرتب ہوتی ہے۔ یہ "روح خداوندی" یا انسانی ذات ہر انسانی بچہ کے اندر موجود ہوتی ہے۔ لیکن محض امکانی شکل (Potential Form) میں۔ اس کی امکانی قوتیں مناسب نشوونما پانے سے (Develop) ہو کر بتدریج مشہود (Realised) ہوتی جاتی ہیں۔ اس کا نام تربیتِ ذات یا ربوبیت ہے۔ اسی کو تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔ تزکیہ کے لفظی معنی نشوونما (Growth) کے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ قد افلح من زکھا جس نے اسے نشوونما دے کر (Develop) کر لیا، وہ کامیاب ہو گیا اس کی کھیتی پروان چڑھ گئی اور قد خاب من دسھا۔ اور جس نے اسے مٹی کے تودے کے نیچے دبا دیا وہ برباد ہو گیا۔ سارا قرآن اسی اجمال کی تفصیل ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما (ربوبیت) کس طرح ہوتی ہے اور اس کی ربوبیت سے کس طرح نوعِ انسانی کی مضمر صلاحیتوں میں بالیدگی اور کشادگی آتی جاتی ہے (یہ موضوع الگ ہے۔ اور اس کے لئے تمہیں ابھی کچھ وقت تک اور انتظار کرنا ہوگا) جب تک انسان کی ذات (یا خودی) خام رہتی ہے وہ خارجی حوادث کے تھپیڑوں سے متزلزل ہوتا رہتا ہے لیکن جوں جوں اس میں پختگی آجاتی ہے وہ کوہ پیکر بن جاتا ہے۔

تم نے سلیم! اوسپنسکی کو تو پڑھا ہے لیکن شاید اس کے استاد گرجیف کی کتاب (All And Everything) کا مطالعہ نہیں کیا۔ اوسپنسکی نے گرجیف سے پوچھا کہ کیا انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ

> اگر انسان ہر آن بدلتا رہے۔ اگر اس میں کوئی شے ایسی نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ لیکن اگر وہ خارجی اثرات سے آزاد ہو جائے۔ اگر اس میں اس شے کی نمود ہو جائے جو اپنی زندگی جئے تو یہ شے کبھی مر نہیں سکتی۔ عام حالات میں ہم ہر ثانیہ مرتے رہتے ہیں۔ خارجی حالات بدلتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی ہم بھی بدل جاتے ہیں۔ لیکن اگر انسان اپنے مستقل آنا کو نشو و نما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے اور اس طرح طبعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے

اقبالؒ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

زندگانی ہے صدف، قطرۂ نیساں ہے خودی   وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی   یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

مغرب کا فکر (جو مادیت پر مبنی ہے)، اس شے کے وجود سے انکار کرتا ہے اور انسانی زندگی کو محض طبیعیاتی زندگی تک محدود سمجھتا ہے۔ یہ درحقیقت ردِعمل ہے عیسائیت کی اس خانقاہیت کا جس میں دنیا کو ناثبات اور روح کو ہی کائنات قرار دے کر ترکِ دنیا کو مقصودِ زندگی بتایا گیا تھا۔ یہ تصور افلاطونی فلسفۂ امثال سے مستعار لیا گیا تھا۔ یہی وہ تصور تھا جو ہندوستان میں ویدانت اور ایران میں تصوف کے نام سے چمکا اور اسی راستے سے اسلام کے اندر بھی آ پہنچا۔ اور اس طرح پہنچا کہ اسے یکسر اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر غور کرو سلیم! تو تم دیکھو گے کہ ایک اچھے دماغ کا انسان اگر غلط راستے پر پڑ جائے تو وہ نوعِ انسانی کے لئے کس قدر نقصانِ عظیم کا باعث بن جاتا ہے۔ افلاطون (Plato) نہایت طباع اور ذہین

مفکر تھا۔ لیکن غلط راستے پر پڑ گیا۔ اس نے اس غلط روش کو اپنے منطقی دلائل کی بنا پر ایسا حقیقت بنا کر دکھایا کہ اس سے قوموں کی قومیں متاثر ہو گئیں۔ اس وقت انسانی دنیا کی شاید ہی کوئی فکر ایسی ہو جو کسی نہ کسی رنگ میں افلاطونی فکر سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ بعض مقامات پر یہ اثر ایسا گہرا ہوا کہ اس نے مذہب کی حیثیت اختیار کر لی۔ اب غور کرو سلیم! کہ اس دو اڑھائی ہزار سال کے عرصے میں، اس ایک دماغ کی غلط فکر نے انسانیت کو کس قدر پستیوں میں دھکیلے رکھا ہے اگر وہ اس غلط فکر کو اختیار نہ کرتا تو آج انسان کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہوتا۔ قرآن اس فکر کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس نے مادی دنیا اور انسانی ذات کے مقام کا صحیح صحیح تعین کیا اور کھلے کھلے الفاظ میں بتایا کہ کس طرح دنیا کی تسخیر، اور اس کے ماحصل کا صحیح مصرف، انسانی ذات کی نشو و بالیدگی کا موجب بنتے ہیں۔ مسلمانوں نے قرآن کے اس فکر کو عملی رنگ دیا تو دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ (قرآن کے الفاظ میں) ان کے تمدن کی جڑیں مادی دنیا کے پاتال میں تھیں اور اس کی شاخیں بلند کائنات کی فضاؤں میں جھولے جھول رہی تھیں۔ یہ قرآن کے سانچے میں ڈھلا ہوا عربی ذہن تھا۔ جو طلسم افلاطون سے متاثر نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد جب عجمی ذہن اسلام کے دائرے میں آیا، جو یکسر افلاطونی قالب کا ساختہ پرداختہ تھا۔ تو اس نے خود اسلام ہی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ یہی عجمی اسلام ہے سلیم! جو ہزار برس سے ہمارے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا ہے کہ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر یہ نکل گیا تو اس کے ساتھ ہی ہماری جان بھی نکل جائے گی۔ بقول مومن

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

* * *

بہرحال سلیم! یہ ہے انسانی ذات جو انسانی جسم کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔ انسان کے تمام اعمالِ حیات، حتیٰ کہ اس کی نگاہ کی جنبش اور دل کی لغزش سب انسانی ذات پر اپنا نقش مرتب کرتے

رہتے ہیں۔ انسان کو اس کا احساس و شعور ہو یا نہ ہو، اس کا کوئی عمل اور ارادہ اس کی ذات پر اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتا۔ اس کا نام ہے قانونِ مکافاتِ عمل۔ یہی ہے وہ "نامۂ اعمال" جس میں سب کچھ ریکارڈ ہوتا رہتا ہے۔ یہی ہے وہ میزانِ عمل جس میں سب کچھ تلتا رہتا ہے۔ نیک اعمال وہ ہیں جن سے انسانی ذات پختگی حاصل کرتی ہے۔ برائی اسے کہتے ہیں جس سے اس میں ضعف پیدا ہوتا ہے (اس کے لئے کس قسم کے معاشرے کی ضرورت ہے اور اس معاشرہ میں کس طرح انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، اس کے متعلق کسی دوسرے خط کا انتظار کرو) اس زندگی میں انسانی ذات۔ جسم کو اپنی توانائیوں کے بروئے کار لانے کا ذریعہ بناتی ہے۔ جسم کے انتشار کے بعد (جسے طبعی موت کہا جاتا ہے) انسانی ذات کے اعمال کے ظہور (Manifestation) کے لئے کوئی اور ذریعہ مل جائے گا۔ ذرائع کے بدل جانے سے اصل شے تبدیل نہیں ہو جاتی ظروف کی تبدیلی سے مظروف کا کچھ نہیں بگڑتا۔ شراب مینا میں ہو یا ساغر میں، اس کے جوہرِ کیف آوری (نشہ) پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ غالب تو یہاں تک بھی کہہ گیا ہے کہ پیالہ نہیں تو اوک ہی سے سہی۔ شراب تو بہرکیف شراب ہی رہتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا سلیم! کہ میں انسانی جسم کی اہمیت کو کم کر رہا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ چونکہ جسم ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی ذات اپنی توانائیوں کی نمود کرتی ہے اس لئے اس ذریعہ کا مضبوط متوازن اور درست ہونا نہایت ضروری ہے اگر قمقمہ (Bulb) یا ۵ بتی کی طاقت (5 Candle power) کا ہے تو بجلی کی لہر کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس میں سے نہایت مدھم روشنی نکلے گی۔ اس کے برعکس اگر قمقمہ سو بتی کا ہے تو کمرہ جگمگا اٹھے گا۔ کرنٹ دونوں صورتوں میں ایک ہی جیسی ہے لیکن اس کی نمود، بلب کی طاقت کے مطابق ہے۔ اس لئے کرنٹ کے طاقتور ہونے کے ساتھ ساتھ بلب کا طاقتور ہونا بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مادی کائنات کی تسخیر کو اس قدر اہمیت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نے انسانی ذات کی نشوونما کا پروگرام ہی یہ بتایا ہے کہ انسان مادی اشیائے کائنات کو مسخر کرتا جائے اور اپنی تسخیر کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے عام رکھے (اسے نظامِ ربوبیت کہتے ہیں لیکن

اس کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں، جس قدر انسان ربوبیت عامہ میں زیادہ سعی و کاوش کرتا ہے، جس قدر وہ اپنی محنت کے ثمرات کو عام کئے جاتا ہے، اسی قدر اس کی ذات میں کشادگی اور استحکام پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے، تا آنکہ اس کا طبعی جسم، علم قوانین طبعی کے ماتحت، متحرک سے ساکن ہو جاتا ہے۔ یعنی اسے موت آ جاتی ہے، لیکن اس کی ذات، زندگی کی اس سطح سے آگے نکل کر دوسری سطح پر جا پہنچتی ہے اور اپنے سفر کی اگلی منزلیں طے کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔

تم نے دیکھ لیا سلیم کہ انسانی ذات کی ہستی کے اقرار اور انکار سے کس طرح زندگی کا پورا نقشہ بدل جاتا ہے۔ اگر انسانی ذات کا اقرار کر لیا جائے تو پھر خدا پر ایمان، اور مکافاتِ عمل کے غیر متبدل قانون پر ایمان ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اگر انسانی ذات ہی سے انکار کر دیا جائے تو اس کے بعد نہ خدا کی ہستی پر ایمان کے کچھ معنی رہتے ہیں اور نہ ہی قانونِ مجازات کی کچھ حقیقت۔ اس کے بعد زندگی محض حیوانی سطح (Animal Level) پر اتر آتی ہے۔ جس کے سامنے (جسم کی پرورش کے علاوہ) نہ کوئی مقصد ہوتا ہے نہ مفہوم، نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے نہ منزل۔ قرآن کے الفاظ میں والذین کفروا جو لوگ اس بنیادی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے تو ان کی زندگی فقط اتنی رہ جاتی ہے کہ یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام (۴۷/۱۲) وہ اسی طرح سامانِ زیست سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح حیوان، اور پھر انہی کی طرح کھا پی کر طبعی موت مر جاتے ہیں۔ بلکہ اس فرق کے ساتھ کہ حیوانات کو رزق کی تلاش کبھی اس طرح پریشان نہیں کرتی جس طرح انسان کو کرتی ہے اور حیوانات کو موت کا تصور بھی کبھی نہیں ستاتا۔ اس لئے کہ حیوانات موت کے تصور سے آشنا ہی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس، انسان ہر وقت موت کے تصور سے بدحواس رہتا ہے۔

یہ ہے سلیم! وہ بنیاد جس پر اسلامی نہج زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ کیا اب تم سمجھ گئے یا نہیں کہ انسانی زندگی اسی جسم کا نام نہیں۔ اس کے سوا کچھ اور بھی ہے۔ اور وہ "کچھ اور" ایسی چیز ہے

جو جسم کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔

* * *

لیکن اس حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اس ایگو یا انا کو حیاتِ جاوید بطور استحقاق نہیں ملتی، حاصل کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس جنت کے متعلق جس میں آدم دوبارہ داخل ہوگا کہہ دیا کہ وہ صرف تمہارے اعمال کا نتیجہ ہوگی، بطور بخشش نہیں مل جائے گی۔ اگر میں اس تفصیل میں چلا گیا کہ جنت کسے کہتے ہیں اور جہنم کیا ہوتی ہے، تو بات کہیں سے کہیں نکل جائے گی۔ لیکن اس تفصیل میں گئے بغیر سردست اتنا سمجھ لینا کافی ہوگا کہ ہمارا ہر عمل، ہمارے ایگو (انا) میں جنت یا جہنم کی تخم ریزی کرتا رہتا ہے۔ وہ جو اقبال نے کہا ہے کہ جہنم ایک خطۂ زمہریر ہے۔ اس میں داخل ہونے والے اپنا اپنا ایندھن اپنی پیٹھ پر لاد کر لاتے ہیں۔ تو اس استعارہ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے کہ عمل خیر وہ ہے جس سے انسانی ایگو پختگی حاصل کرلے اور عمل شر وہ جس سے اس میں ضعف و انتشار پیدا ہو جائے اس سے ظاہر ہے کہ انسانی ذات وہ معیار ہے جس سے خیر اور شر کا تعین ہوتا ہے۔ اگر انسانی ذات سے انکار کر دیا جائے تو دنیا میں خیر اور شر کا معیار ہی باقی نہیں رہتا۔ انسانی ذات میں جوں جوں پختگی آتی جاتی ہے، اس کی انفرادیت محکم ہوتی چلی جاتی ہے حتیٰ کہ اس میں ایسی احدیت (Uniqueness) آجاتی ہے کہ اپنی ذات میں یکسر منفرد ہو جاتی ہے ایسی منفرد کہ، اقبال کے الفاظ میں یہ انائے مطلق (خدا) کے حضور بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھتی ہے، اس میں جذب نہیں ہو جاتی۔

بخود محکم گزار اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحر نورش

یہی فرق ہے وحدت وجود کے عجمی تصور اور انسانی ذات کے قرآنی تصور میں۔ وحدت وجود، (ویدانت کے

تتبع میں) انسانی ذات کا منتہیٰ یہ قرار دیتا ہے کہ وہ خدا کی ہستی میں جذب (فنا) ہو جائے۔ لیکن قرآن سے اس تصور کی تائید نہیں ہوتی۔ اور یہی قرآنی تصور ہے جسے اقبال نے پیش کیا ہے۔ اسی بنا پر اقبال عالمگیر حیات Universal Life کا بھی قائل نہیں۔ وہ زندگی کی انفرادیت کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک خدا بھی ایک فرد ہے۔ بے مثل و بے نظیر فرد۔ اس لیے جوں جوں انسانی ذات اپنے اندر خدا کی صفات کو مشہود کرتی جاتی ہے وہ انفرادیت حاصل کرتی جاتی ہے۔

اوہو! تم کہو گے کہ میں نے پھر خط میں فلسفیانہ گفتگو شروع کر دی۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟ تم نے انسانی ذات کے متعلق بات چھیڑ دی۔ اس میں اگر فلسفہ نہیں آئے گا تو کیا داغ کے شعر آئیں گے۔

اچھا، لو اللہ بیلی!

اپریل، ۱۹۵۳ء

سلیم کے نام دسواں خط

(کمیونزم اور اسلام)

لا و اِلّا ساز و برگ اُمتاں
نفی بے اثبات، مرگ اُمتاں

میں سلیم! تمہیں ایک عرصہ سے کہتا چلا آرہا تھا کہ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کی مختلف تحریکوں کے پس منظر نفسیاتی اسباب و علل اور سیاسی محرکات و مؤیدات سے آگہی حاصل کرو، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ لاعلمی، یا سطحی معلومات کی وجہ سے تم بھی اس طوفان میں بہہ جاؤ گے۔ جس میں ہمارے ملک کے نوجوان عام طور پر بہے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ لیکن چونکہ تمہاری فطرت سلیم ہے اس لئے تم نے پاؤں اکھڑنے سے پہلے آواز دیدی اب مجھے امید ہے کہ تم سنبھل جاؤ گے۔ ورنہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں ہر ایک کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ جس سے پوچھئے وہ کمیونزم کے متعلق اتنا ہی جانتا ہے کہ یہ ایک معاشی نظام کا نام ہے جس میں تمام لوگوں میں دولت کی تقسیم مساویانہ ہوتی ہے اور امیر و غریب، مزدور اور سرمایہ دار، زمیندا اور کاشتکار کا امتیاز مٹ جاتا ہے، جس سے سب خوش حال اور مرفہ الحال ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دا کسی غریب کا خون نہیں چوس سکتا اور غریب محض پیٹ کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اپنی جان تک اہل دولت

کے ہاتھوں فروخت نہیں کرتا۔ اور یوں یہ دنیا جو اس وقت سرمایہ داری کی لعنت سے غریبوں کے لیے جہنم بن رہی ہے مسرت و اطمینان کی جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ معاشی نظام کا یہ منظر ایسا خوش آیند ہے کہ ہر شخص رواں دواں اس کی طرف کھنچے چلا جاتا ہے اور یہ نگاہ فریب جاذبیتیں اسے اتنی فرصت ہی نہیں دیتیں کہ وہ اس کے گرد و پیش پر ایک نظر ڈال سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ داری کی لعنت نے فی الواقعہ جمہور کو اس قدر ستا رکھا ہے کہ ان بھوکوں محتاجوں اور بےکسوں کو جہاں کہیں سے روٹی کا اشارہ ملتا ہے یہ اس کی طرف لپک کر جاتے ہیں۔ اور اس باب میں یہ سچے بھی ہیں۔ بھوکے میں اس کی تاب ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی تحقیق کرے کہ جو حلوہ اس کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اس میں کہیں زہر تو نہیں ملا رکھا۔ بھوک کی ایسی جانگسل شدت میں اس تمیز کا ہوش رکھنا کارِ ہر دیوانہ نیست۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کے نزدیک جان سے بھی زیادہ کوئی اور متاع ہو۔ موجودہ معاشرہ میں ایسی متاعِ عزیز کی تلاش، سعی لاحاصل ہے کہ اس معاشرہ کی بنیاد ہی "روٹی" پر استوار ہے۔ اس لئے ہمارے دور کا بھوکا مجبور و معذور ہے کہ وہ "روٹی" کی آواز پر لبیک کہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی تحریکوں کی کامیابی کا راز ان تحریکوں کے ذاتی جوہروں (Intrinsic values) میں نہیں بلکہ ان حالات میں ہے جو ہمارے دور کے ابلیسی نظام نے پیدا کر رکھے ہیں۔ اس نظام میں غربت اور فلاکت نے جس درجہ کی شدت اختیار کر رکھی ہے اس کے پیش نظر اگر ہر غریب پیدائشی کمیونسٹ دکھائی دیتا ہے تو یہ کچھ تعجب انگیز نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اللہ نے تمہیں ایک نہایت دردمند دل عطا فرمایا ہے جو ہر مظلوم کی مصیبت پر تڑپ اٹھتا ہے۔ لہٰذا تمہارے لئے ان غریبوں کی ہمدردی کے جذبہ سے متاثر ہونا کچھ مستبعد نہ تھا۔ بنا بریں مجھے اس کے متعلق بھی کوئی شکایت نہیں۔ وہ بدبخت شقی القلب ہے جو غریبوں اور مفلسوں کی مظلومیت پر خون کے آنسو نہ بہائے اور ان کے دکھ کی دوا ڈھونڈھنے میں دن اور رات کی تمیز روا رکھے۔ لیکن مجھے جس بات کا افسوس ہے وہ صرف یہ ہے کہ تم نے اس تحریک کا صحیح مطالعہ نہیں کیا اور اپنی روش کے خلاف، محض جذباتی طور پر اس کے متعلق رائے قائم کر لی کہ "کمیونزم اور اسلام ایک ہی چیز ہے اور اگر اسلام کچھ اور ہے تو ایسے اسلام کو دور ہی سے سلام ہے"۔

تم نے شدتِ جذبات میں اس اصول کو بھی فراموش کر دیا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ "جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔" تمہیں چاہیئے تھا کہ پہلے اس کے متعلق پوری پوری معلومات حاصل کرتے۔ اور پھر رائے قائم کرتے۔ بہرحال جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے یہ غنیمت ہے کہ تم نے عملی اقدام سے پہلے اس کے متعلق دریافت کر لینا ضروری سمجھا۔ یہی تمہاری فطرتِ سلیم کی شہادت ہے۔

کمیونزم، معاشی نظام کا نام نہیں۔ یہ ایک پورا فلسفۂ زندگی ہے اور معاشی نظام اس کے ایک گوشے کا مظہر۔ لہذا جب ہم کمیونزم کے متعلق گفتگو کریں تو ہمارے سامنے پورا فلسفۂ حیات ہونا چاہیئے نہ صرف روس کا معاشی نظام۔ "فلسفۂ حیات" کے معنی یہ ہیں کہ ہم زندگی کو کیا سمجھتے ہیں اور وہ کونسی اقدار (Values) ہیں جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ جس طرح کمیونزم ایک فلسفۂ زندگی ہے اسی طرح اسلام بھی ایک فلسفۂ زندگی ہے۔ لہذا یہ کہنے سے پہلے کہ کمیونزم اور اسلام ایک ہی چیز ہے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کیا ان دونوں کا فلسفۂ حیات ایک ہی ہے۔ اگر ایک ہی ہے تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ لیکن اگر ان کے فلسفے مختلف ہوں تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے معاشی نظام اور کمیونزم کے معاشی نظام میں مشابہت پائی جاتی ہے لیکن اتنے سے تشابہ سے یہ دونوں ازمز (Isms) ایک تو نہیں ہو سکتے! یہ تو ایسے ہی ہے جیسے تم کہہ دو کہ ہندوستان کی حکومت نے امتناعِ شراب کا حکم دیدیا ہے لہذا وہاں کی حکومت اسلامی حکومت ہے۔ یا یہ کہ مرزا ارشد کی شکل حمید ریحانی سے بہت ملتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کی سیرت بھی ایک ہی ہے۔ بعض اجزاء کے تشابہ سے کل، یا ظواہر کے تشابہ سے، اصل کی یکسانیت لازم نہیں آتی۔

مشکل یہ ہے کہ تم فلسفہ کے مبادیات تک سے بھی واقف نہیں ہو، اس لئے تم سے فلسفیانہ موضوعات پر گفتگو میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ میں نے اسی دشواری کے پیشِ نظر تم سے کبھی فلسفیانہ انداز میں گفتگو نہیں کی۔

لیکن جس بات کا مدار ہی فلسفہ پر ہو اس کے متعلق کیا کیا جائے؟ میں کوشش کروں گا کہ فلسفیانہ اسلوب سے بچ کر عام فہم زبان میں بات سمجھائی جا سکے۔

کمیونزم کو مارکس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مارکس ایک فلسفی تھا۔ لیکن اس کا فلسفہ متفرع تھا ہیگل کے فلسفہ پر۔ لہذا مارکس تک پہنچنے کے لئے ہیگل کے فلسفہ کے متعلق دو چار باتیں جاننا نہایت ضروری ہیں۔ ہیگل (Hegel) کے فلسفۂ کو عام طور پر فلسفۂ اضداد (Opposites) کہا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہتا ہے کہ دنیا میں ہر شے اپنی ضد سے قائم ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ انسانیت نے جس قدر ترقی کی ہے وہ اضداد ہی کی جنگ و پیکار سے کی ہے۔ لیکن ان اضداد کا دائرہ صرف تصور اور فکر Ideas and Thought کی دنیا تک محدود ہے۔ محدود ہی نہیں بلکہ وہ اصل حقیقت صرف تصور کو جانتا ہے وہ کہتا یہ ہے کہ ایک تصور Idea جب اپنی حد سے آگے بڑھ جاتا ہے تو اس میں سے اس کی ضد پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں کے تصادم سے ایک نئے تصور کی تخلیق ہوتی ہے جس سے پہلے تصور کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے وہ دلیل یہ لاتا ہے کہ ہر تصور محدود اور ناقص ہوتا ہے۔ اس نقص اور محدودیت کی وجہ سے وہ اپنی ضد پیدا کرتا ہے۔ یہ نیا تصور اپنے سے پہلے تصور کے ناقص پہلوؤں کا ابطال کرتا ہے۔ لیکن ان ناقص پہلوؤں کا کچھ نہ کچھ اثر اس کے اندر باقی رہتا ہے۔ یہ تصور وسعت اختیار کر لیتا ہے اور پھر اپنی انتہا تک پہنچکر ایک نئے تصور کی تخلیق کرتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ اور یہ سلسلہ اس طرح سے جاری رہتا ہے۔ ہیگل اس عمل کا نام جدلی عمل، Dialectical Process قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ جدلی عمل، زندگی کی عین فطرت ہے۔ ایک مخفی قوت ہے جو انسان کو بار بار اس پر آمادہ کرتی رہتی ہے کہ وہ پرانے تصورات کی جگہ نئے تصورات پیدا کرتا ہے۔ جو پہلے تصورات کی نقیض یا ضد ہوں۔ اس مخفی قوت کو ہیگل روح عالم (World Spirit) کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ روحِ عالم ایسا کیوں کرتی ہے؟! اس کے متعلق ہیگل کہتا ہے کہ اس سے اس روح کو خود اپنی ذات کی تکمیل مقصود ہوتی ہے۔

تم سلیم! کہوگے کہ یہ لفظوں کا گورکھ دھندا کیا ہے۔ لیکن تم ذرا غور سے دیکھو گے تو تمہیں نظر آجائیگا کہ اسی لفظی گورکھ دھندے کی بنیاد پر زندگی کی پوری کی پوری عمارت قائم کر دی گئی ہے۔ ہیگل کے نظریہ کا ماحصل یہ ٹھہرا کہ:-

(۱) دنیا میں کوئی قدر (Value مستقل طور پر اپنا وجود نہیں رکھتی۔ ہر قدر میں نقص موجود ہوتا ہے۔ وہ تغیرات کی دنیا میں چکر کاٹتی ہے اور اس کے بعد ایک نئی قدر پیدا کرتی ہے جو اس کی ضد ہوتی ہے۔ یہ نئی قدر بھی اپنی ذات میں مکمل یا مستقل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک اور قدر کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

(۲) یہ سلسلہ تخریب و تعمیر ایک مخفی قوت کی تحریک پر قائم ہے اور اس سے مقصد یہ ہے کہ وہ مخفی قوت اپنی ذات کی تکمیل کرے۔

(۳) کائنات میں مادہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ اس کی بنیاد تصورات (Ideas پر قائم ہے۔

اس سے نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ

(ل) خدا (مخفی قوت یا روحِ عالم) بھی اپنی ذات میں مکمل نہیں۔ بلکہ وہ تکمیلِ ذات کے لئے تصورات کے تعمیری اور تخریبی چکر میں پھنسا ہوا ہے۔

(ب) دنیا میں مستقل اقدار (Permanent Values) کا کہیں وجود نہیں۔ ہر تصور (قدر) اپنے اندر نقائص رکھتا ہے اور ایک حد تک پہنچ کر خود معدوم ہو جاتا ہے اور ایک نئے تصور (قدر) کی تخلیق کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ یہ نئی قدر پھر اپنے اندر نقائص رکھتی ہے اور اس طرح تغیرات کا یہ سلسلہ حوادث جاری ہے۔ لہٰذا دنیا میں کوئی شے ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں۔

(ج) دنیا میں جنگ و پیکار صرف تصورات کی ہوتی ہے، مادیت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لہٰذا یا تو مادہ اپنا وجود ہی نہیں رکھتا۔ اور اگر وہ وجود رکھتا ہے تو روح سے یکسر الگ شے ہے۔ ان دونوں میں باہمی امتزاج ناممکن ہے۔

تم کہو گے کہ ان چیزوں کو کمیونزم سے کیا واسطہ؟ اور یہ اس لئے کہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، تم نے کمیونزم کو فقط روس کا معاشی نظام سمجھ رکھا ہے۔ بہر حال ہیگل کے فلسفہ کے ان اصولوں کو سامنے رکھ کر آگے بڑھو۔

* * *

مارکس Karl (Marx -1818-1883) ہیگل کے فلسفہ کا متبع تھا۔ لیکن چار ہی قدم آگے چل کر اس نے ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ ہیگل کا سارا فلسفہ اس کے ہاتھوں تہس نہس ہو گیا۔ اس نے ہیگل سے اس باب میں اتفاق کیا کہ تاریخ جنگِ اضداد کی داستان ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے، جب وہ اپنے عروج کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالف قوتیں وجود کوش ہوتی ہیں۔ یہ مخالف قوتیں، اس نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک جدید نظام مسلط کر دیتی ہیں۔ اور یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

تم نے سلیم! غور کیا کہ مارکس کی اس موافقت میں کتنے بڑے اختلافات کا پہلو نمایاں ہے۔ ہیگل نے کہا تھا کہ ایک تصور (Idea) کی جگہ دوسرا تصور لے لیتا ہے اور یہ جنگ اضداد، تصورات (Ideas) کی جنگ ہوتی ہے۔ مارکس جنگ اضداد کا تو قائل ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ جنگ تصورات کی نہیں، مختلف "نظامہائے عالم" کی ہوتی ہے۔ ہیگل کے نزدیک، انقلاب انسانوں کی تصوراتی (داخلی) دنیا میں رونما ہوتا ہے۔ مارکس کے نزدیک داخلی دنیا کا کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تمام انقلابات انسان کی خارجی دنیا میں رونما ہوتے ہیں اور انسانی تصورات (Ideas) ان ہی خارجی انقلابات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ یعنی ہیگل کے نزدیک کائنات کی بنیاد تصور Idea پر ہے۔ لیکن مارکس کے نزدیک اس کی بنیاد خالص مادہ Matter پر ہے۔ ہیگل کے فلسفہ کی رو سے انسان کا خارجی ماحول، اس کے تصور و فکر کی تبدیلی سے بدلتا ہے۔ مارکس کے فلسفہ کی رو سے انسانی فکر و تصور، اس کی مادی دنیا کے تغیرات کے مطابق بدلتے ہیں۔ بالفاظ دیگر مارکس نے ہیگل کے جدلی تصور (Dialectical Idealism) سے جدلی طریق (Dialectic) کو تو لے لیا۔ لیکن اس کی تصوریت (Dialalism) کو چھوڑ دیا اور اس کی جگہ

خالص مادیت کو دیدی۔ اس لیے مارکس کے فلسفہ کو جدلی مادیت (Dialectical MateriaMisM) کہتے ہیں۔ ہیگل کے نزدیک اس جنگ اضداد کی محرک روح عالم یا روح مطلق (Absolute Spirit) تھی۔ اگرچہ وہ روح نامکمل تھی اور اس نے اس تمام سلسلہ جنگ و پیکار کو اپنی تکمیل ذات کے لیے قائم کر رکھا تھا۔ لیکن مارکس نے کہا یہ مطلقیت (Absolutism) انسان کو حاصل ہے۔ انسان کے ماورا کوئی قوت نہیں۔ مادے سے توانائی از خود پیدا ہوتی ہے اور یہی از خود پیدا شدہ توانائی یا Self-generated (-Energy) کائنات میں حرکت کا موجب ہے۔ یہ ہے مارکس کے فلسفہ کی بنیاد۔ یعنی خالص مادیت۔

مادیت (Materialism) کا لفظ تو تم زن میں سینکڑوں بار سنتے ہو گے لیکن مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں کہ تم اس کے مفہوم سے بھی واقف ہو یا نہیں۔ میں نے ایک دفعہ تمہیں (Heackel) کی کتاب (Riddle of the Universe) بھیجی تھی۔ خدا معلوم اسے تم نے پڑھ لیا تھا یا وہ بھی ناولوں کے ساتھ کباڑیوں کے ہاں چلی گئی۔ یا شاید تم نے چولھے کی نذر کر دی۔ اگر تم نے اسے پڑھا تھا تو تم نے دیکھا ہو گا کہ ہیکل کائنات میں سات معمے بتاتا ہے۔

(۱) مبدا رحیات

(۲) ربط اشیائے فطرت

(۳) مبدا رفکر و لسان

(۴) انسانی اختیار و ارادہ

(۵) ماہیت مادہ و توانائی

(۶) مبدا رحرکت اور

(۷) مبدا رشعور

ہیکل کے نزدیک یہ سات معمے، دو بنیادی اصولوں کے ماتحت حل ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ "مادہ اور قوت غیر متبدل

ہیں"، اور دوم یہ کہ کائنات میں عمل ارتقا جاری ہے"۔ جس سے مفہوم یہ ہے کہ غیر شعور و غیر ذی حیات مادہ (Matter) سے ارتقائی طور پر زندگی "(Life) اور "شعور" consciousness پیدا ہو جاتا ہے۔

چلئے! کائنات کے معمے کا حل دریافت ہو گیا!

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یہ ہے سلیم! مادیت یعنی مادہ، از خود موجود ہو گیا اور پھر عمل ارتقا سے اس سے زندگی، حرکت، ارادہ، شعور، سب کچھ پیدا ہو گیا۔ جب تک ان اجزا میں ربط باہمی قائم ہے (جس کا نتیجہ زندگی اور شعور ہے) انسان زندہ ہے اور باشعور۔ جب یہ اجزا پریشان ہو جاتے ہیں تو زندگی اور شعور ختم ہو جاتا ہے اور انسان مٹ جاتا ہے۔

جہاں تک فلسفہ مادیت کا تعلق ہے، مارکس پر ایک اور فلاسفر کا اثر تھا۔ اس کا نام تھا Ludwi Feuerbach یہ ہیگل کا شاگرد تھا اور عیسائیت کا بنیادی دشمن۔ عیسائیت کی تخریب کے لئے اس نے فلسفہ مادیت کی عام ترویج کی۔ اس کی کتاب Essence of Christianity اس کے مذہب کی "بائبل" ہے۔ اس میں یہ لکھتا ہے کہ "فطرت کے ماورا کسی شے کا وجود نہیں۔ مذہب جن مافوق الفطرت ہستیوں اور طاقتوں کا ذکر کرتا ہے وہ ذہن انسانی کی تخلیق ہیں"۔ لہٰذا مارکس کے نزدیک "سب سے سخت تنقید مذہب کی تنقید ہے، اس لئے کہ "مذہب انسانوں کے لئے افیون کا حکم رکھتا ہے"۔ وہ کہتا ہے کہ

> مذہب، انسانی ذہن کی پیداوار ہے، انسان مذہب کی پیداوار نہیں، مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے جو یا تو ابھی تک اپنے مقام انسانیت سے بے خبر ہے یا جس نے اس مقام کو پاکر پھر سے اسے کھو دیا ہے۔ مذہب مظلوموں کی سسکیاں۔ ایک پتھر کی دنیا کا قلب اور ان حالات کی روح ہے جن میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کے فنا میں حقیقی انسانی مسرت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات، مذہب، مابعدالطبیعیات اور دیگر تمام تصورات سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادی انسان کی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مارکس کے نزدیک مذہب، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور اسی قسم کے دوسرے تصورات کا کوئی حقیقی وجود نہیں، تو پھر وہ کونسی قوت ہے جس کی بنا پر تاریخ میں جدلیاتی جنگ جاری ہے۔ ایک نظام اپنے عروج پر پہنچکر، کیوں ایک اور نظام پیدا کرتا ہے، جو پہلے نظام کو ہٹا کر اس کی جگہ خود مسلط ہو جاتا ہے؟ یہ نظامِ استبدال و استخلاف کس قوتِ محرکہ کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے؟

مارکس کہتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں زندگی کی اصل و بنیاد اس دور کا معاشی نظام ہوتا ہے جس پر مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی عمارت قائم ہوتی ہے۔ جس دور میں جس قسم کا معاشی نظام ہوگا، اس دور میں اسی قسم کا اخلاق و تمدن ہوگا۔ لہذا اصل شے، معاشی نظام ہے۔ تاریخ کے میدان میں کوئی جنگ تصورات (Ideas) کے اختلاف سے نہیں لڑی جاتی بلکہ معاشی نظام کے اختلاف سے لڑی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ انسان کی اخلاقی اقدار (Moral Values) معاشی نظام کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ایک معاشی نظام ایک وقت تک کار فرما رہتا ہے۔ پھر آفرینشِ دولت کے طریقے (Methods of Produotion) بدل جانے سے اس نظام کی بنیادیں مرتعش ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد ایک جدید نظام ظہور پذیر ہو جاتا ہے اور اس جدید نظامِ معیشت (Economic System) کے ساتھ ہی سوسائٹی کی تمام اقدار (Values) بدل جاتی ہیں۔ کبھی معاشی نظام کی بنیاد غلامی پر تھی۔ اُس دور میں، اطاعت، فرمانبرداری، فروتنی، انکساری، خاکساری، "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال آگے کر دینا" اخلاقی اقدار تھیں۔ پھر اس کی جگہ جاگیرداری نظام نے لی تو شجاعت غیرت، حمیت، فخر و تکبر نے اخلاق کی جگہ لے لی۔ اب سرمایہ داری Capitalism کا دور دورہ ہے تو جھوٹ، فریب، مصلحت کوشی، نفع بینی، خود غرضی ہی وہ اقدار ہیں جن کا بازار میں چلن ہے۔ بیکیاولی کی طرح مارکس بھی یہی کہتا ہے کہ نیکی وہ ہے جو پیداوار کی فراوانی میں مدد دے اور برائی وہ جو اس کی وسعتوں کی راہ میں حائل ہو۔

پھر وہ یہ کہتا ہے کہ ایک معاشی نظام کے عروج کے وقت اس کے مختلف طبقات میں باہمی نفرت کھلی ہوئی

مبارزت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ تصادم اس نظام کی تخریب کا باعث اور ایک نظام جدید کی تخلیق کا موجب بنتا ہے۔ ساری تاریخ ان ہی طبقاتی تصادم (Class-struggles) کی آئینہ دار ہے۔ جس طرح کتے ہڈی پر لڑتے ہیں اسی طرح انسان ہمیشہ روٹی کی خاطر لڑتا رہا ہے۔ اس کو وہ (Economic Interpretation of History) "تاریخ کی اقتصادی تعبیر" قرار دیتا ہے۔ یعنی اس کے نزدیک نوعِ انسانی کی تمام تاریخ عبارت ہے فقط روٹی کی جنگ سے۔ چنانچہ وہ اشتمالی منشور۔ (Communist Manifesto) کے پہلے صفحہ پر لکھتا ہے:۔

> انسان نے اس وقت تک جتنے معاشرے قائم کئے ہیں ان سب کی تاریخ، طبقاتی نزاع کی تاریخ ہے۔ غلام اور آقا، امراء و جمہور، سرمایہ دار اور مزدور ہمیشہ ایک دوسرے کے مخالف اور باہم برسرِپیکار رہے ہیں۔ یہ لڑائی صدیوں سے یوں ہی مسلسل جاری ہے۔ کبھی اس کی آگ دھیمی پڑ جاتی ہے اور مخفی طور پر اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور کبھی اس کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں پھر اس کا انجام یا تو یہ ہوتا ہے کہ ایک انقلاب پورے معاشرے کو بدل ڈالتا ہے۔ یا پھر دونوں برسرِپیکار طبقے مٹ جاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معاشی نظام کی یہ جدلیت (تصادم و تزاحم) پیدا کیوں ہوتی ہے۔ کیوں ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام لے لیتا ہے؟ مارکس اس کے جواب میں کہتا ہے کہ یہ چیز تاریخی اقتضاآت (Historical Necessity) میں سے ہے۔ یعنی اس تبدیلی کے لئے کوئی خاص مقصد محرک نہیں ہوتا۔ مادی کائنات کی ہر شے ایک اندھی فطرت کے تابع چل رہی ہے۔ اسی طرح تاریخ کے تقاضے بھی اندھے ہیں۔ ان ہی تقاضوں میں سے یہ بھی ہے کہ ایک معاشی نظام دوسرے سے ٹکرائے اور دوسرا نظام اس کی جگہ لے لے۔ چونکہ تاریخی وجوب (Necessities) صرف تبدیلی کا خواہاں ہے اس لئے ضروری نہیں کہ نیا نظام، پہلے نظام سے بہر حال بہتر ہو۔ تاریخی وجوب صرف یہ چاہتا ہے کہ پہلا نظام بدل جائے اور اس کی جگہ ایک اور نظام لے لے۔ جب یہ تبدیلی ایک بلا مقصد قانونِ تاریخ کے ماتحت واقع ہوتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس انقلاب میں حصہ لینے والے

بھی کسی کار خیر" میں مدد و معاون نہیں ہوتے بلکہ ایک "ہو کر رہنے والے واقعہ" کے جلد بروئے کار آجانے میں معاونت کرتے ہیں۔ اسی لئے مارکس کے نزدیک تاریخ کی بڑی بڑی ہستیوں کی عظمت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ انہوں نے کسی ایسے انقلاب کے وقت اس جماعت کی قیادت کی جو نظامِ کہن کی جگہ نظامِ جدید کی تخلیق میں مُمد و معاون تھی، خواہ یہ نظامِ جدید کیسا ہی کیوں نہ تھا۔

سلیم! تم نے دیکھا ہوگا کہ اس انقلاب میں انسان کس طرح تاریخی وجوب کے ہاتھوں، ایک بے جان آلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ ایک بات تمہارے لئے یقیناً وجۂ ہزار استعجاب ہوگی۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ مغرب نے خدا کا انکار اس لئے کیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے سے اسے خدا کے احکام کی اطاعت کرنی پڑتی تھی جس سے انسانی ارادہ و اختیار سلب ہو جاتا تھا۔ لہذا دہریت یا مادہ پرستی، انسانی اختیار و ارادہ کو حدود فراموش قرار دیتی ہے۔ اور اس کا یہ دعویٰ ہے کہ خدا کے انکار سے انسانی عظمت کی بلندی ہوتی ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنی دنیا کا آپ مالک و مختار قرار پاتا ہے۔ لیکن تم حیران ہوگے کہ یورپ کی مادہ پرستی انسان کو صاحب اختیار و ارادہ کی بجائے مجبورِ محض بنا دیتی ہے۔ بظاہر یہ چیز متضاد سی نظر آئے گی۔ لیکن حقیقت بالکل یہی ہے۔ ڈارون کے نظریہ کی رو سے کائنات میں ارتقا کا سلسلہ جاری ہے اور انسان عمل ارتقاء کی ایک کڑی ہے۔ چونکہ انسانی عقل، شعور، فکر سب ہی حیاتیاتی ارتقا (Biological Evolution) کا نتیجہ ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں، اس لئے انسان ارتقائی طور پر مجبور ہے۔ یعنی انسان اسی عمل کی اگلی کڑی ہے جس کی پچھلی کڑی حیوانات کی زندگی ہے۔ لہذا انسان اور حیوان میں فرق صرف درجہ (Degree) کا ہے، نوعیت Quality کا نہیں۔ یہ حیاتیاتی جبریت (Biological Determinism) ہے، قدریت نہیں ہے۔ مارکس آیا تو اُس نے کہا کہ انسانی اقدار اس کے خارجی ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اور خارجی ماحول ہوتا ہے تاریخی وجوب کا نتیجہ۔ انسان کو نہ تاریخی وجوب کے بدلنے پر اختیار ہے۔ نہ خارجی ماحول کی تبدیلی پر قدرت۔ لہذا اس کے نظریہ کی رو سے بھی انسان مجبورِ محض ہے۔ دونوں میں یہی فکری مماثلت تھی جس کی وجہ سے مارکس نے ڈارون سے

درخواست کی تھی کہ وہ اس کی ایک کتاب کا انتساب قبول کرلے۔ ڈارون جبریت حیاتیاتی (Biological Determinism) کا امام اور مارکس (Economic Determinism) کا قائل۔ اسی طرح نفسیات کی دنیا میں آیئے تو ڈاکٹر واٹسن کا نظریہ (Behaviourism) انسان کے تمام اختیار و ارادہ کو چند غدودوں کی ساخت اور عمل تخریج (Secretion) کا پابند بنا دیتا ہے۔ اور ژُونگ اور اڈلر سے پوچھئے تو وہ اسے یکسر ماحول و وراثت کا رہین منت قرار دیتے ہیں۔ خود ان کے امام فرائڈ کو لیجئے تو وہ شعور کو غیر شعوری دنیا کی زنجیروں سے بندھا ہوا بتاتا ہے۔ تم نے دیکھا سلیم! مغرب کی مادیت کس طرح انسان کو صاحب اختیار و ارادہ کے بجائے مجبور محض بنا دیتی ہے۔ چونکہ اخلاق کی ساری عمارت انسانی ارادہ پر استوار ہوتی ہے۔ اور مغرب کی مادیت اس سے اس کا ارادہ سلب کر لیتی ہے۔ اس لئے وہاں اخلاق کا کوئی ضابطہ باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس کے فلسفہ میں بھی اخلاق کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ لہٰذا جب اشتراک کے حامل، مزدوروں کی حمایت میں علم بغاوت بلند کرتے ہیں تو یہ کسی اخلاقی جذبۂ ہمدردی کی بنا پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ اخلاقی اقدار کا ان کے ہاں تصور ہی نہیں۔ بلکہ یہ انقلاب ایک تاریخی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے اور یہ لوگ اس تقاضے کا ساتھ دیتے ہیں۔

سلیم! تم کسی اشتراکی سے پوچھو کہ غریبوں اور مزدوروں کی حمایت کیوں کرنی چاہیئے؟ وہ لامحالہ یہی کہے گا کہ یہ عقل کا تقاضا ہے۔ اس سے پوچھئے کہ کس کی عقل کا؟ سرمایہ داروں کی عقل کا تقاضا تو اس کے خلاف ہے! لہٰذا یہ معاملہ عقل سے تو طے نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ کہے کہ یہ انسانی فرض ہے تو پوچھئے کہ انسان پر یہ فریضہ کس نے عائد کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس فریضہ کو عائد کرنے والی قوت، مزدوروں اور سرمایہ داروں، یعنی انسانوں سے ماوراء ہونی چاہیئے۔ اشتراکی فلسفہ کسی ایسی قوت کا قائل ہی نہیں۔ لے دیکے وہ یہ کہے گا کہ یہ تاریخی اقتضاء ہے۔ تو یہ سوائے اعتراف عجز کے اور کچھ نہیں۔ یعنی جب "ایسا کیوں ہونا چاہیئے" کا کوئی جواب نہیں پاتے تو اس کے لئے کوئی مبہم سا نام رکھ لیتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ وجہ دریافت کر لی ہے۔ ڈارون کی "اندھی فطرت" اور مارکس کا "تاریخی وجوب" سب نام ہیں۔ وہی نام جن کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ اسماء سمیتموھا انتم و اباءکم یہ صرف

نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑے ہیں)۔ کتنی بڑی حقیقت ہے جسے سلیم! قرآن نے چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

سلیم! کہیں تم اکتا تو نہیں گئے! ہر چند میں نے کوشش کی ہے کہ بات فلسفیانہ نہج و اسلوب سے ہٹ کر، عام انداز میں کی جائے لیکن فلسفہ کی یبوست اپنا اثر بہر حال قائم رکھتی ہے۔ بات چونکہ ذرا پھیل گئی ہے۔ اس لئے منقطع شدہ منزل پر نگہ بازگشت ڈال لینا ضروری ہے۔ مارکس کے فلسفہ کا ماحصل یہ ہے کہ

(۱) خدا کا تصور ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا مذہب ایک بہت بڑا فریب ہے۔

(۲) انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ معاشی ہے

(۳) جب ایک معاشی نظام اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک دوسرا نظام پیدا ہو جاتا ہے جو اس نظام کہن کی ضد ہوتا ہے۔

(۴) ہر معاشی نظام میں طبقات کی نزاع لاینفک ہوتی ہے۔ ساری تاریخ ان ہی طبقاتی نزاعات کی داستان ہے۔

(۵) معاشی نظام کے پیدا کردہ ماحول سے انسانی ذہن متاثر ہوتا ہے اس لئے اس کے افکار و تصورات اور اخلاق و عقائد سب اسی ماحول کے پیدا کردہ ہوتے ہیں

(۶) چونکہ معاشی نظام اور اس کے ساتھ ساتھ خارجی ماحول بدلنے والی چیزیں ہیں۔ اس لئے افکار و تصورات اور اخلاق و عقائد کی دنیا میں کوئی مستقل قدر نہیں۔ نیکی وہ جو دولت کی پیداوار میں فراوانی کا موجب ہو اور برائی وہ جو اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے۔

(۷) یہ سب سلسلۂ تغیر و تبدل ایک مبہم نظریہ کے ماتحت واقع ہوتا ہے جسے تاریخی وجوب کہتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک سرمایہ داری کا حامی، خدا کے بعد حکومت کا وجود ہے۔ اس لئے کمیونزم ایک ایسی سوسائٹی

کی تخلیق چاہتا ہے جس میں حکومت کا وجود نہ ہو۔ اسے (Anarchy) یا نوضیت کہتے ہیں۔ لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک عبوری دور سے بھی گزرنا پڑتا ہے جس میں مزدوروں کی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کی حکومت ہو گی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں لینن نے انقلاب روس کے بعد وہاں آمریت قائم کی۔ لینن ۱۹۲۴ء میں مر گیا۔ اور اس کی جگہ اب سٹیلن[1] روس کا ڈکٹیٹر ہے۔ مارکس، منشور اشتراکیت (Communist Manifesto) میں لکھتا ہے کہ

> سرمایہ داروں نے جو ظلم و تشدد برپا کر رکھا ہے اس کا واحد علاج یہ ہے کہ دنیا سے جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے۔ عمرانی زندگی کے مصائب و آلام صرف جماعتی امتیازات کی بنا پر ہیں اور اس کا ازالہ مزدوروں کی جماعت کا برسر اقتدار آ کر، عالمگیر یکسانیت و مساوات پیدا کرنا، اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ دنیا سے ذاتی ملکیت اور شخصی اور انفرادی حقوق کے خیال کو فنا کر دیا جائے اور اس طرح جب مزدوروں کی جماعت کو تسلط حاصل ہو جائے تو تدریجاً سرمایہ داروں کے املاک و خزائن پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ مقاصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ موجودہ نظام معاشرت کو مسلح قوت کے ذریعہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔

لینن لکھتا ہے کہ

> سرمایہ داری کی غیر مرئی قوتوں نے ذہن انسانی میں ایک ڈر کی صورت پیدا کر دی ہے جس سے ایک حاکم اعلیٰ کے تخیل کی بنیاد پڑی۔ اسے انسان نے خدا کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ سو جب تک خدا کا تخیل ذہن انسانی سے نتانہ کر دیا جائے یہ لعنت کسی طرح دور نہیں ہو سکتی۔

ایک اور جگہ یہ لکھتا ہے۔

> "مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے" اس لئے مارکس ازم کی رو سے دنیا کے تمام مذاہب اور کلیسا سرمایہ داری کے آلہ کار ہیں جن کے توسط سے مزدور جماعت کے حقوق کو پامال کیا جاتا ہے اور انہیں فریب دیا جاتا ہے۔ لہذا نفس مذہب کے خلاف جنگ کرنا ہر اشتراکی کے لئے ضروری ہے۔ تا آنکہ دنیا سے مذہب کا وجود ہی مٹ جائے۔

---

[1] یہ اس وقت لکھا گیا تھا جب اسٹیلن ہنوز زندہ تھا۔

اخلاق کے متعلق لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:-

> ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے، عین اخلاق ہے۔ اشتراکیین کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت و سطوت کا استحکام و استقرار کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے۔ چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی فریب دہی، عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ معاندین کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔

یہ فریب دہی اور دروغ بافی، دشمنوں کے خلاف ہی نہیں، بلکہ عند الضرورت خود اپنی جماعت کے افراد سے بھی ان ہی حربوں سے کام لیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ (Gollancz) اپنی کتاب (Our Threatened Valuss) میں لکھتا ہے کہ (Dr. G.Luckuz) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی جماعت کے لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب و فریب دہی سے کام لیں؟ تو اس کے جواب میں اس نے کہا کہ

> اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے، یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے، انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

اب رہا طریق کار۔ سو اس کے متعلق لینن اپنی کتاب (State ano Revolucion) میں لکھتا ہے کہ

> سرمایہ داری نظام حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسر اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ، انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے، لینن لکھتا ہے!

> انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و تسلط، قوت و

استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی کراتا ہے۔

ڈکٹیٹرشپ کے متعلق (Stalin) اپنی کتاب (Laninism) میں خود لینن کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ

> ڈکٹیٹر ایسی مختار عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود قاطبۃً قوتوں کے ہجوم پر مبنی ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی جو کسی قانون اور کسی ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظام حکومت کے علمبردار سن لیں اور خوب غور سے سن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں "قوت"، غیر محدود اور قاہرہ قوت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ سروکار نہ ہو۔

میں نے سلیم! یہ اقتباسات اس لئے دیدیئے ہیں تاکہ تم ازخود دیکھ سکو کہ مارکس ازم کے ماتحت جس قسم کا نظامِ معاشرت قائم ہوگا اس کے عناصرِ ترکیبی کیا ہوں گے، اس کے مقاصد کیا ہوں گے اور طریقِ بکار کیا۔ خدا کی نفی، ضوابطِ اخلاق کی نفی، اور حکومت کی نفی۔ بقول علامہ اقبالؒ

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطین، لا کلیسا، لا اِلٰہ

حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم، سرمایہ داری کے نظام کے خلاف ایک شدید ردعمل ہے۔ جس کے پیشِ نظر صرف تخریب ہی تخریب ہے، تعمیر کا پہلو اس میں کچھ نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ کوئی قوم محض تخریبی فلسفۂ حیات سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ زندگی کا تقاضا مثبت فلسفہ ہے۔ اگر تخریب کسی تعمیر کا پیش خیمہ نہیں تو اس تخریب سے کچھ فائدہ نہیں۔

لا و اِلّا ساز و برگِ اُمتاں
نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

یہ ہے سلیم! مختصر الفاظ میں کمیونزم؛ یعنی وہ فلسفۂ زندگی جو ہیگل کے فلسفۂ اضداد سے شروع ہوا۔ پھر مارکس نے اس کی بنیاد خالص مادیت پر رکھی اور روس میں لینن اور سٹالن کے ہاتھوں اس نے ایک عملی نظام کی صورت اختیار کی۔ اب اس کے اجزائے ترکیبی یوں قرار پائے کہ

(۱) خدا کا تصور سرمایہ داری کی قوتوں کا پیدا کردہ ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ذہنِ انسانی کو اس ڈر سے نجات دلانی چاہیئے۔

(۲) ضوابطِ اخلاق، نظامِ سرمایہ داری کے قائم کردہ ہیں اس لئے انہیں توڑنا ضروری ہے۔

(۳) انسانی زندگی کا بنیادی مسئلہ معاش کا ہے۔ افکار و تصورات اور اخلاق و شرائع سب اس کے تابع رہنے چاہئیں۔

(۴) جب ایک معاشی نظام اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک دوسرا نظام پیدا ہو جاتا ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔

(۵) یہ سلسلۂ تغیر و تبدل، تاریخی اقتضاء کے ماتحت از خود رونما ہوتا رہتا ہے۔

(۶) جماعتی نزاع ہر معاشی نظام میں لاینفک ہوتی ہے اور حکومت ان افراد پر مشتمل جن کے ذاتی مفاد نظامِ سرمایہ داری سے منسلک ہوتے ہیں۔

(۷) لہٰذا نظامِ جدید میں جماعتی تفریق کو مٹا دیا جائے گا۔ اور خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ حکومت کے وجود کو بھی ختم کر دیا جائے گا۔

یہ تو رہی کمیونزم۔ اب اس فلسفۂ زندگی کے مقابلہ میں اسلام بھی ایک فلسفۂ زندگی پیش کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کمیونزم اور اسلام میں کیا فرق ہے، اسلام کے فلسفۂ زندگی کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ اسے ایک مرتبہ پھر سمجھ لو، سلیم! کہ میں اس وقت صرف فلسفۂ زندگی سے بحث کر رہا ہوں، اسلام کے احکام و ارکان سے بحث نہیں کر رہا۔ اس فلسفۂ زندگی کے متعلق میں بہت کچھ نہیں لکھ چکا ہوں لیکن معلوم نہیں کہ وہ مربوط طریق سے تمہارے ذہن میں مستحضر ہے یا نہیں۔ اس لئے مختصر الفاظ میں اس فلسفۂ زندگی کی اہم شقوں کو دہرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ذرا غور سے سنو کہ یہ باتیں بڑی اہم ہیں اور جب تک تم انہیں سینے کی آنکھوں سے نہیں پڑھو گے اور دل کے کانوں سے نہیں سنو گے، اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکو گے۔ اسلام کا فلسفۂ حیات یہ ہے کہ

(۱) کائنات کی پیدا کرنے والی اور اسے چلانے والی ایک اعلیٰ ہستی ہے جسے ہم خدا کہہ کر پکارتے ہیں۔

(۲) کسی شے کو مخلوق اس وقت کہتے ہیں جب وہ محسوس و مشہود پیکر میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل اس کا تعلق عالم امر سے ہوتا ہے۔ لہذا مادہ، عالم امر کی ایک محسوس شکل ہے

(Materialisation of Spirit)

(۳) مادہ میں جو عالم امر کا مظہر (Manifestation) ہے، ہر آن تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن عالم امر تغیرات سے ماوراء ہے

(۴) عالم امر سے جو کچھ متعلق ہوگا وہی مستقل ہوگی۔ مستقل کو حق کہتے ہیں۔ یعنی جو اپنی جگہ پر اٹل ہو۔ خدا حق ہے اور اس کا امر بھی حق۔

(۵) خدا نے کائنات کو ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لہذا کائنات کے تغیرات و حوادث یونہی اتفاقی اور ہنگامی طور پر رونما نہیں ہوتے بلکہ ایک ہدایت (Direction) کے ماتحت ہوتے ہیں۔

(۶) یہ ہدایت، عالم امر ہی سے مل سکتی ہے کیونکہ وہی تغیرات سے ماوراء ہے۔ اس ہدایت کے ماتحت سلسلۂ کائنات اپنے مقصد متعینہ کی طرف رواں دواں چلے جا رہا ہے۔ اس لئے کائنات کی "تخلیق بالحق" ہوئی ہے۔

(۷) کائنات کی باقی ہر چیز بلا چون و چرا، اس ہدایت کے مطابق سرگرم عمل ہے، لیکن انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔

(۸) یہ اختیار و ارادہ مادی ارتقاء کا نتیجہ نہیں کیونکہ مادہ مجبور ہے اور جو خود مجبور ہو وہ اختیار پیدا نہیں کر سکتا۔

(۹) یہ اختیار و ارادہ اور حیات و شعور، شئونِ الٰہیہ کی ایک شان (Aspect) ہے جسے انسان کے مادی پیکر میں پھونک دیا گیا ہے۔ یہ انسانی انا (Self) ہے۔

(۱۰) یہ انا تمام انسانوں میں قدر مشترک ہے۔ یہی اشتراک سے انسانی اشتراک کی بنیاد پڑتی ہے۔ یعنی مساواتِ انسانی۔ آدمیت احترام آدمی۔

(۱۱) انسان کو بھی اسی عالمِ امر سے ہدایت (Direction) ملتی ہے جہاں سے کائنات کی دیگر اشیار کو ہدایت مل رہی ہے۔ اس ہدایت کو وحی کہا جاتا ہے۔

(۱۲) وحی مستقل اقدار (Permanent Values) متعین کرتی ہے اور ان ہی اقدار کا نام اصولِ فطرت یا احکامِ الٰہیہ ہے۔

(۱۳) انسان سے کہا گیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے اور دنیا کے ہر گوشے میں، ان مستقل اقدار کے مطابق کام کرے۔

(۱۴) انسانی فکر اور عمل جس قدر ان مستقل اقدار سے ہم آہنگی اختیار کرتا جائے گا اسی قدر اس کے اندر "شانِ استقلال" پیدا ہوتی جائے گی (اسے تعمیرِ سیرت یا استحکامِ خودی کہا جاتا ہے) اور چونکہ استقلال (PERMANENCY) صرف حق کا خاصہ ہے۔ اس لئے اس طرح یہ حق سے قریب اور قریب تر ہوتا چلا جائے گا۔ (اسے قربِ خداوندی، یا صبغۃ اللہ خدا کے رنگ میں رنگے جانا کہتے ہیں۔)

(۵) کائنات کی کوئی شے انفرادی طور پر کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف عوامل میں باہمی تعاون و تناصر ہو۔ اسی ربطِ باہمی سے تمام سلسلۂ کائنات قائم ہے۔

(۱۶) یہی اصول انسانی زندگی میں بھی کارفرما ہے۔ اس لئے اس مقصدِ عظیم کے لئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، انسانوں کو باہمی تعاون و تناصر سے کام لینا ہوگا۔ اسے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کہا گیا ہے اس ربطِ باہمی سے سوسائٹی (جماعت) کا وجود قائم ہوتا ہے۔ ایک ربط صرف (Co-operative System) کا ہوتا ہے۔ یہ اتحاد ہے۔ اسلام اس سے آگے لے جاتا ہے۔ اور اتحاد کی بجائے ائتلاف کی تعلیم دیتا ہے۔ یعنی ایسا ربط جیسے درخت کے بیج، مٹی، پانی اور ہوا کا ربط ہوتا ہے کہ ان سب کے ائتلاف سے ہر ایک کے جوہرِ پوشیدہ کی نشوونما ہوتی ہے اور ان کا نتیجہ ایک سرسبز و شاداب درخت کی صورت میں سامنے آجاتا ہے۔

(۱۷) اس جماعت کا کام یہ ہے کہ پہلے اپنی زندگی کو مستقل اقدار کے تابع رکھے اور پھر ان مستقل اقدار کو عالمگیر

حیثیت سے تمام نوعِ انسانی تک پھیلائے اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔

(۱۸) چونکہ دنیا میں ایسے لوگ (جماعتیں اور قومیں) موجود ہیں جو "مستقل اقدار" کے نفاذ پذیر ہو جانے میں اپنے ان ذاتی منافع و مصالح کا نقصان محسوس کرتے ہیں جو انہوں نے غاصبانہ طور پر (یعنی اصول فطرت کے خلاف) حاصل کر رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

(۱۹) اس مخالفت کی روک تھام قوت کے بغیر ناممکن ہے۔ لہٰذا اس جماعت کے لئے جس کا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے، قوت کا ہونا لاینفک ہے۔ اس نظام یا قوت کو نظامِ حکومت کہتے ہیں۔

(۲۰) اس نظام، اور انسانی خود غرضیوں پر مبنی غاصبانہ نظام ہائے معاشرت میں تصادم ضروری ہے۔ اسی کا نام خیر و شر کی جنگ ہے، حق و باطل کی لڑائی ہے، تاریخ اس تصادم کی داستان کا نام ہے۔ نمرود و ابراہیمؑ، فرعون و موسیٰؑ، بولہب و محمدؐ اسی تصادم کے مظاہر ہیں۔

(۲۱) مستقل اقدار کے تابع قائم شدہ نظامِ زندگی کا فطری نتیجہ ربوبیت اور عدل ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں آغاز سے اختتام تک کی تمام منازل میں سامانِ پرورش کی فراہمی اور عدل سے مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد کی فطری صلاحیتوں کے مکمل طور پر ابھرنے اور نشوونما حاصل کرنے کے یکساں مواقع مہیا کرنا۔

(۲۲) اس معاشرہ میں عدل کے ساتھ احسان بھی ہوتا ہے۔ احسان، حسن سے ہے۔ اور حُسن کے متعلق تم جانتے ہی ہو کہ یہ توازن (Proportion) کا دوسرا نام ہے۔ لہٰذا احسان سے مفہوم ہے معاشرہ میں توازن کا قیام۔ اگر کسی ایک فرد یا گروہ میں ہنگامی حوادث سے کسی چیز میں کمی آ گئی ہے اور دوسرے میں زیادتی، تو باہمی ترتیب (Adjustment) سے اس کمی کا اس طرح پورا کرنا کہ نظامِ معاشرہ میں توازن قائم ہو جائے۔ توازن کے بگڑنے کا نام فساد ہے۔ اور قرآن، فساد کو طاغوتی نظام کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ڈارون کے نظریہ کی رو سے دنیا میں جو اصلح (The Fittest) نہیں اسے زندہ رہنے کا حق نہیں۔ لیکن اس نظام عدل واحسان میں جو (The Fittest) نہیں اسے (The Fittest) بنایا جائے گا۔ اسی لئے

اس نظام کا اصول "بقا للانفع" ہے۔ یعنی باقی وہ رہے گا جو نوع انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع رساں ہو (سورۂ رعد)

(۲۳) اور اس نظام میں یہ کچھ یوں ہی "تاریخی وجوب" کے مبہم مفروضہ کے ماتحت میکانکی طور پر رونما نہیں ہوتا بلکہ ہر فرد کے دل کے ارادوں، ذہن کی کاوشوں اور بازو کی قوتوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس فرد کا ایمان ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بلانتیجہ نہیں رہتی۔ اور ظہور نتائج سانس کی آمد و رفت ہی کا پابند نہیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو موجودہ مادی اجزا کے پریشان ہو جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ اس کا ہر وہ عمل جو مستقل اقدار کے مطابق ہے (اسے مشیت سے ہم آہنگی اور رضائے الٰہیہ کا حصول کہیئے) اس کے شرف انسانیت کی تکمیل کا موجب ہے (اور یہ جنت کا مقام ہے) اور ہر وہ کام جو ان اقدار کے خلاف ہے اس سے مقام انسانیت چھین لینے کا باعث (یہ جہنم کی زندگی ہے)

میں نے سلیم! کوشش کی ہے کہ نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں اسلام کا فلسفۂ حیات تمہیں سمجھا سکوں۔ خدا کرے کہ تم نے اس سلسلۃ الذہب کی ہر کڑی کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لیا ہو (ذہن نشین ہی نہیں بلکہ دل نشین)، اگر کسی شق میں کوئی اشتباہ یا الجھاؤ محسوس کرو تو مجھ سے پھر پوچھ لینا۔ بہر حال یہ ہے اسلام کی رو سے فلسفۂ زندگی۔ اب اس فلسفۂ زندگی کو اور اس فلسفۂ حیات کو جو کمیونزم پیش کرتی ہے آمنے سامنے رکھو اور پھر خود ہی فیصلہ کرو کہ کیا یہ دونوں ایک ہی ہیں؟ تم واضح طور پر دیکھ لوگے کہ نہ صرف یہ کہ یہ دونوں ایک نہیں، یہ ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہو گا کہ ایک شخص ایک ہی وقت میں کمیونزم کا بھی قائل ہو اور اسلامی فلسفۂ زندگی کا بھی۔

میں نے تمہارے خط کے اس حصہ کو بڑے غور سے پڑھا ہے جس میں تم نے لکھا ہے کہ

جب آپ لوگ کمیونزم کو اسلام کے خلاف بتاتے ہیں تو اس سے موجودہ نظام سرمایہ داری کو بڑی تقویت

مل جاتی ہے اور مفاد پرست گروہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ کمیونزم اسلام کے خلاف ہے لہذا ان کی روش زندگی اسلام کے مطابق۔

میں اس خطرہ سے آگاہ ہوں۔ اس لئے اس حقیقت کو بھی واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح اسلام کا فلسفۂ زندگی اور نظامِ حیات کمیونزم کے خلاف ہے اسی طرح وہ مفاد پرستانہ اور سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی کے بھی خلاف ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار اور عجمی تصورات کی یادگار ہے، جہاں تک سرمایہ داری نظام کا تعلق ہے اسلامی نظام بھی اس کا کمیونزم سے کم دشمن نہیں۔ اسلامی نظام کیا ہے؟

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کیلئے   نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف   منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب   پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

اور جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

میرے پیارے سلیم! اس وقت یہ ممکن نہیں کہ میں اسلام کے معاشی نظام کو وضاحت سے تمہارے سامنے رکھ دوں۔ اس وقت میں صرف اتنا بتا سکوں گا کہ اسلام نظامِ سرمایہ داری کا سب سے بڑا دشمن ہے اور اپنے نظام کے اندر رہنے والے ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل۔ سرمایہ داری کی لعنت کی ابتدا زمینداری سے ہوتی ہے۔ یعنی ایک شخص دس ہزار ایکڑ اراضی کا مالک ہے۔ غریب کاشتکار سال بھر محنت کرتا ہے اور اس کی محنت کا ماحصل زمیندار کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ جہاں تک سلیم! میری قرآنی بصیرت میری رہنمائی کرتی ہے میں دیکھتا ہوں کہ قرآن۔ زمین پر انفرادی ملکیت کی اجازت نہیں دیتا۔ زمین کو وہ ملتِ اسلامیہ (نظامِ حکومت قرآنیہ) کی ملکیت قرار دیتا ہے جو اس کی پیداوار کو افرادِ معاشرہ کی ضروریات کے مطابق تقسیم کرتی رہتی ہے۔ زمین ہی نہیں، بلکہ رزق کے جس قدر چشمے قدرت

کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، وہ ان سب کو ہر ضرورتمند کے لئے یکساں طور پر کھلا رکھتا ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ میں دیکھو جہاں ارشاد ہے کہ

> اللہ نے زمین کی سطح پر پہاڑ پیدا کئے اور اس میں ایسی چیزیں پیدا کیں جو موجب) برکات ہیں۔ اور اس میں چار فصلوں میں خوراک کا سامان کا اندازہ متعین کیا۔ (ان سب کے دروازے) ہر ضرورتمند کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔

قرآنی احکام کے متعلق میں کئی مرتبہ بتا چکا ہوں کہ وہ اصول بیان کرتا ہے جن کی جزئیات ہر دور میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق متعین کی جا سکتی ہیں۔ ہمارا زمانہ صنعت و حرفت (Industries) کا ہے۔ اس لئے جو اصول، زمینداری کے متعلق ہے وہی کارخانوں پر بھی نافذ ہوگا۔ اصل شے تو، دولت کا جمع کرنا ہے جس کے متعلق ارشاد ہے کہ

> کس قدر بدبختی ہے اس کے لئے جو دولت جمع کرتا ہے اور پھر اسے گنتا رہتا ہے (کہ اس میں کس قدر اضافہ ہوا) کیا یہ سمجھتا ہے کہ یہ دولت اس کے پاس ابد الآباد تک رہے گی؟ کبھی نہیں۔ بلکہ یہ تو اسے ایک ایسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والے جہنم کی طرف لیجائے گی جس کی آگ کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں۔ (۱۰۴/۱-۷)

دوسری جگہ ہے کہ

> جو لوگ چاندی اور سونے کے دفینے جمع کر رکھتے ہیں اور اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ انہیں ایک دردناک عذاب کی بشارت دیجئے۔ جس دن ان سکوں کو آگ میں تپایا جائے گا (اور کہا جائے گا کہ ہاں) یہ ہے وہ دولت جسے تم نے اپنے لئے روک رکھا تھا۔ سو اب اس کا مزہ چکھو (۹/۳۴-۳۵)

اس اکتناز سے صرف یہ مفہوم نہیں کہ روپوں کو گھروں کے اندر دفینے کی شکل میں نہ رکھا جائے۔ بلکہ یہ کہ دولت کو ایسے نہ رکھا جائے کہ وہ پیداوار کا ذریعہ نہ بن سکے۔ اور "دولت کی پیداوار" سے مراد "روپے پر منافع" نہیں۔ کیونکہ اسے ربوٰ کہا جاتا ہے۔ اور ربوٰ حرام ہے۔ ربوٰ میں ہر وہ آمدنی آجاتی ہے جس میں کسی کی محنت کو دخل نہ ہو۔ اب یہ

روپے کی گردش، سو اس کے متعلق واضح طور پر فرما دیا کہ دولت کی گردش اس طریق پر نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ امراء کے طبقہ میں پھرتی رہے۔ (۵۹/۷)

سرمایہ داری کا بڑا مدار انفرادی کاروبار (Private Enterprise) پر ہے یعنی ایک شخص جس قدر کاروبار کرے اس کا ماحصل (آمدنی۔ روپیہ) سب اس کی ملکیت ہوتا ہے۔ لیکن ذرا سوچو سلیم! کہ قرآنی نظام میں فالتو روپے کی کہیں گنجائش بھی ہوتی ہے؟ غور کرو کہ

(i) زمین پر انفرادی ملکیت ہو نہیں سکتی۔ اس لئے کوئی شخص زمین خرید نہیں سکتا۔

(ii) جائیداد بہر حال زمین پر تعمیر ہوگی۔ جب زمین ہی نہیں خریدی جاسکے گی تو اس پر جائیداد کیسے بن سکے گی۔ لہذا اسکنی مکان سے زائد مکان بنوانے کی بھی گنجائش نہیں ہوگی۔

(iii) بلا ضرورت کہیں روپیہ خرچ نہیں کیا جاسکے گا (اسے تبذیر کہتے ہیں۔)

(iv) نہ ہی ضرورت سے زائد (اسے اسراف کہتے ہیں)

(v) نہ ہی روپیہ جمع رکھا جاسکے گا۔

(vi) اور نہ ہی اسے اوپر ہی اوپر گردش دیا جاسکے گا۔

اب سوچو سلیم! کہ اس نظام میں فالتو روپے کی گنجائش کہاں ہوگی؟ وہ تو وبال جان بن جائے گا۔ اس کے رکھنے کے لئے کہیں جگہ ہی نہ ہوگی اسی لئے قرآن میں ہے کہ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہمیں کس قدر روپیہ مفادِ عامہ کے لئے کھلا رہنا ہوگا۔ ان سے کہدیجئے کہ قل العفو وہ سب کا سب جو ضرورت سے زائد ہوگا اس روپے کو ربوبیت عامہ (یعنی افرادِ نوعِ انسانی) کی مضمر صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے لئے صرف کیا جائے گا۔ یہ اس نظام کی بنیادی ذمہ داری ہوگی۔ اگر یہ اس ذمہ داری کو پورا کرے گا تو اسے حق حاصل ہوگا کہ افراد معاشرہ سے قانون کی اطاعت کرائے۔ اگر یہ ذمہ داری پوری نہیں کرے گا تو اُسے "حکم دینے" کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ "ایاك نعبد وایاك نستعین" کا یہی عملی مفہوم ہے۔

یہ ہیں سلیم! موٹے موٹے اصول جن کی روشنی میں ہم، اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق، ایک واضح معاشی نظام وضع کر سکتے ہیں۔ اس نظام کی تمام جزئیات میرے پیشِ نظر ہیں۔ لیکن ان کے بیان کرنے کی نہ یہاں گنجائش ہے نہ ضرورت۔ اور پھر اس اصلِ عظیم کو کبھی نہ بھولو کہ یہ معاشی نظام اسلامی سوسائٹی کے ہمہ گیر نظام کا ایک ٹکڑہ ہے۔ وہ ہمہ گیر نظام انسان کو تماماً اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ اس لئے اس معاشی نظام کو کبھی اس ہمہ گیر نظام سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس کے برعکس کمیونزم کے نزدیک انسانی زندگی کا سارا مسئلہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ لیکن اس سے تو تم بھی متفق ہو گے، سلیم! کہ انسانی زندگی کا مسئلہ صرف روٹی کا نہیں۔ یہ تو انسانی زندگی کی بڑی توہین ہے کہ اسے محض روٹی کا مسئلہ قرار دیا جائے۔ یہ تو حیوانی زندگی ہو گی نہ کہ انسانی۔ یا انسان کے اس قدیم زمانہ کی زندگی، جب اس کی زندگی ہنوز حیوانی زندگی سے متمیز نہیں ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کو محض مادہ کی تخلیق قرار دیدیا جائے تو پھر زندگی کا مفہوم خورد و نوش کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ اس لئے اگر مارکس کی نگاہ اس سے آگے نہ جا سکی تو اس کا قصور نہیں۔ لیکن اسلام، جو انسانی ذات کو روحِ خداوندی کا پرتو قرار دیتا ہے، وہ اس کی زندگی کو محض آب و گل کی چاردیواری میں کس طرح محبوس کر سکتا ہے! سچ پوچھو تو روٹی کے مسئلہ کا جو حل کمیونزم پیش کرتا ہے وہ جیل خانہ میں پورے طور پر موجود ہوتا ہے۔ وہاں ہر قیدی کو وہ کام دیدیا جاتا ہے جو اس کے لئے داروغہ مقرر کرے اور پھر تمام قیدیوں کو یکساں طور پر روٹی دیدی جاتی ہے۔

اس مقام پر تم سلیم! کہو گے کہ سوسائٹی میں ایسے حالات بھی تو پیدا ہو جایا کرتے ہیں کہ لوگ محض بھوک سے تنگ آ کر جیل خانے چلے جاتے ہیں کہ وہاں کام لیا جائے گا تو ساتھ روٹی تو مل جائے گی۔

یہ درست ہے۔ اور کمیونزم پھیلتی ہی وہاں ہے جہاں نظامِ معاشرت ایسا ہو جائے کہ کام کرنے والوں کو بھی کم از کم ضروریاتِ زندگی کے پورا کرنے کے لئے پیسہ نہ مل سکے۔ جب کسی معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو پھر وہاں کمیونزم کو کون روک سکتا ہے! لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے؟ غیر فطری نظام ایسے حالات پیدا کرتا ہے جن میں انسان محض روٹی کی خاطر سب کچھ قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور "کمیونزم" اس کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ لیکن سلیم!

کمیونزم، خود ایک غیر فطری فلسفۂ زندگی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک غیر فطری نظام کی تباہ کاریوں کا حل دوسرا غیر فطری نظام نہیں کر سکتا۔ غیر فطری نظام کا حل صرف کائناتی نظام کر سکتا ہے جسے ہم اسلام کہہ کر پکارتے ہیں۔ لہٰذا ہر سلیم الطبع انسان کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہمارے موجودہ غیر فطری نظامہائے زندگی کی جگہ (جس میں مسلم اور غیر مسلم کی آج کوئی تمیز نہیں)، کائناتی نظام مسلط ہو جائے۔ لیکن اگر اس کی کوشش نہ ہوئی تو ایک غیر فطری نظام کی جگہ دوسرا غیر فطری نظام آ جائے گا۔ وکذٰلك نولی بعض الظٰلمین بعضًا (اس طرح ہم ایک غیر فطری نظام کو دوسرے غیر فطری نظام پر مسلط کر دیتے ہیں) اس لئے کہ نظام سرمایہ داری کے لئے مشکل ہے کہ وہ کمیونزم کا حریف ہو سکے۔ لیکن اسلام، روٹی کے اس مسئلہ کا حل بھی نہایت حسن و خوبی سے کرتا ہے جو کمیونزم کے معاشی نظام کا نصب العین ہے۔ اور اس کے بعد انسان کے شرفِ انسانیت کی تکمیل کا سامان بھی کرتا ہے جو کمیونزم کے پیشِ نظر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس اعتبار سے اسلام اور کمیونزم ایک نہیں، بلکہ اسلام، کمیونزم کے معاشی نصب العین کو اپنے آغوش میں لیکر کمیونزم سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسلام اور کمیونزم کو ایک سمجھنا بنیادی غلطی ہے۔ نہ کمیونزم اسلام ہے اور نہ ہی وہ اس کے مقابل ٹھہر سکتا ہے۔

سلیم! یہ خط بہت لمبا ہو گیا۔ اس لئے اس گوشے کے باقی تضمنات کے لئے دوسرے خط کا انتظار کرو۔

والسلام

جلائی سنہ ۱۹۴۹ء

سلیم کے نام گیارہواں خط

(کمیونزم اور اسلام نمبر ۲)

جہانتک مجھے یاد پڑتا ہے۔ سلیم! میں نے کمیونزم کے متعلق تمہیں گزشتہ جولائی میں لکھا تھا۔ تم نے ۹ ماہ کے بعد اس کے متعلق پھر ذکر کیا۔ لیکن مجھے اس سے خوشی ہوئی کہ تم نے بات سمجھنے کے لئے اب انداز ٹھیک اختیار کیا ہے۔ اگر بات کو قرینے سے سلجھا لیا جائے تو اس کے سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی۔

تم کہتے ہو کہ کمیونزم کے دو اجزا ہیں۔ ایک تو وہ فلسفہ جس کی ابتدا ہیگل نے کی اور اس کی بنیادوں پر مارکس نے عمارت بلند کی اور دوسرا جزو وہ معاشی نظام ہے جسے لینن نے ڈھالا اور اسٹالن اور اس کے رفقائے کار نے روس میں نافذ کیا۔ تم کہتے ہو کہ بحث صرف اس معاشی نظام تک محدود رکھنی چاہیئے جس کا تجربہ روس میں ہو رہا ہے۔ اس فلسفہ کو الگ رکھ دینا چاہیئے جس پر وہ نظام متفرع ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح بات زیادہ واضح ہو سکے گی تو یوں ہی سہی۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ تم کسی کمیونسٹ سے بات کرو، تو وہ مارکس کے فلسفے اور روس کے معاشی نظام، دونوں کے مجموعے کا نام کمیونزم قرار دے گا۔ اوبات ہے بھی ٹھیک۔ کمیونزم جس نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر رکھی ہے، اس فلسفۂ زندگی کے بغیر، جس کی وہ پیداوار ہے، باقی رہ ہی نہیں سکتی۔ دوسری طرف اسلام کا معاشی نظام بھی اس کے فلسفۂ زندگی سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔ اسلام کا نظام ایسا کُل ہے

جس کے مختلف اجزائے ترکیبی ایک جسم نامی کی طرح ایک دوسرے میں یوں سموئے ہوئے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کو باقیوں سے الگ کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کل کے متعلق کچھ سمجھ میں نہیں آسکتا، اس ایک جزو کو بھی صحیح طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔

بایں ہمہ، جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اگر تم معاشی نظام کو اس کے فلسفہ سے الگ کر کے ہی سمجھنا چاہتے ہو تو یوں ہی سمجھنے کی کوشش کرو۔ بالخصوص اس لئے کہ تمہاری یہ بات مجھے خوش آئی کہ یہ "کیا دلیل ہوئی کہ چونکہ روس کا کمیونسٹ خدا کا قائل نہیں۔ اس لئے وہاں اشتمالی طریق زراعت قابل قبول نہیں ہو سکتا۔" معلوم نہیں تمہارے سامنے یہ دلیل کس نے پیش کر دی۔ لیکن تمہارے طنز کی شوخی اس کی حقدار ہے کہ تمہاری تسکین خاطر کا سامان اسی انداز سے بہم پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

تم کہتے ہو کہ "اسلامی نظام معاش اور اشتراکی نظام میں فرق صرف یہ ہے کہ اسلامی نظام ذاتی ملکیت ضروری قرار دیتا ہے اور اشتراکی نظام میں اس کی نفی ہوتی ہے۔ اس فرق کے علاوہ ان دونوں میں کوئی اختلاف نہیں۔" قطع نظر اس کے کہ ان ہر دو نظامہائے معیشت میں "صرف یہی فرق" ہے یا کچھ اور بھی، میں پوچھتا ہوں کہ جس فرق کو تم نے "صرف یہ فرق" کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا ہے کہ اس طرح اسلامی نظام اشتراکی نظام کے بہت قریب آجاتا ہے، کیا وہ فرق تمہارے نزدیک ایسا ہی معمولی فرق ہے کہ اسے اس طرح نظر انداز کر دیا جا سکتا ہے؟ سلیم میاں! تم اچھی وزندار باتیں کیا کرتے تھے۔ تم نے سوچا ہی نہیں کہ یہ تم نے کیا کہہ دیا؟ عزیزم! "یہ ذاتی ملکیت" ہی تو ہے جو دنیا میں نظام سرمایہ داری کی جڑ ہے۔ تم اگر غور سے دیکھو تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ سرمایہ داری اور اشتراکی نظام معاشی میں بنیادی فرق ہی "ذاتی ملکیت" کا ہے۔ جب تم ذاتی ملکیت کا اصول مان لو تو اس ملکیت کی تحدید (حد بندی) تو کی نہیں جا سکتی۔ اور ذاتی ملکیت بلا تحدید کا دوسرا نام سرمایہ داری ہے۔ اور جب سرمایہ داری، ذاتی ملکیت ہی کی پھیلی ہوئی شکل کا دوسرا نام ہے تو ذاتی ملکیت اور اشتراکی نظام ایک دوسرے کے نقیض ٹھہرے۔ لہذا یہ کہنا کہ

ذاتی ملکیت کو ضروری قرار دینے والے نظام اور اشتراکی نظام میں فرق صرف "ذاتی ملکیت" ہی کا ہے۔ باقی ہر طرح سے وہ دونوں ایک ہیں، ایک بہت بڑی جہالت یا خود فریبی کا ثبوت دینا ہے۔ تم سے تو مجھے اس کی توقع نہ تھی۔

یہی دلیل ہے سلیم! جو آجکل عام طور پر اسلام اور اشتراکیت کے تقابل میں پیش کی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ اسلام میں ذاتی ملکیت ضروری ہے اور اشتراکیت اس کی نفی کرتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام ذاتی ملکیت کو فی الواقعہ ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ بات سمجھ لینے سے باقی تمام باتیں خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔

اسلام میں سلیم: ذاتی ملکیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اب تم پھر کہہ دوگے کہ میں نے ایک اور دنیا جہان سے نرالی بات کہدی۔ لیکن قرآن کی ہر بات آج نرالی سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ مسلمان کے سامنے اور سب کچھ ہے بجز قرآن کے۔ لہٰذا اس کے سامنے جب کبھی کوئی بات قرآن کی آئے گی تو وہ اسے نامانوس نظر آئے گی اور وہ محسوس کرے گا کہ یہ تو کچھ نرالی سی بات ہے۔ لیکن اس میں قرآن کا تو قصور نہیں قصور تو اس ذہنیت کا ہے جو ہر غیر قرآنی تصور کو اسلامی سمجھے چلی آرہی ہے اور ہر قرآنی تصور ان کے نزدیک غیر اسلامی ہے۔

سلیم! اگر غور سے دیکھو تو معاشی نظام کا مسئلہ درحقیقت صرف اس قدر ہے کہ فرد اور جماعت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ ان کے حقوق و واجبات کے دائرے کیا ہیں۔ قرآن کریم نے اس تمام مسئلہ کو ایک آیت میں حل کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر اس آیت کا صحیح مفہوم قرآن سے متعین کر لیا جائے تو وہ تمام الجھاؤ خود بخود صاف ہو جاتے ہیں جنہوں نے اس وقت مختلف قلوب و اذہان کو اس طرح پریشان کر رکھا ہے۔ قرآن نے ہیئت اجتماعیہ اسلامیہ کی بنیاد اس آیت مقدسہ پر رکھی ہے جس میں فرمایا ہے

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ نے مومنین کی جان اور مال خرید لئے ہیں اور اس کے بدلے میں انہیں جنت عطا کرنے کا ذمہ لے لیا ہے۔

یہ آیت اس معاہدہ (Agreement) کی اصل ہے جس پر اسلامی نظام اجتماعیہ کی فلک بوس اور آفاق گیر

عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس معاہدہ میں دو فریق ہیں۔ ایک فریق اللہ اور دوسرا فریق مومن۔ اور دو چیزیں ہیں ایک چیز جو بیچی جاتی ہے اور دوسری چیز اس کی قیمتِ فروخت ہے۔ مسلمانوں نے جب سے اللہ، کو عرش پر بٹھا رکھا ہے اور جنت کو صرف اگلے جہان سے متعلق کر رکھا ہے، اس وقت سے، قرآن کے دیگر محکمات و بینات کی طرح اس معاہدہ کا مفہوم و منطوق بھی چیستان بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن سلیم! غور کرو۔ اگر اللہ کو صرف ایک عقیدے کے طور پر مانا جائے اور اس سے زیادہ اس کے متعلق کچھ متعین نہ ہو سکے، اور جنت کے متعلق بھی اسی طرح صرف ایک عقیدہ ہی رکھا جائے تو ظاہر ہے کہ اس عظیم القدر معاہدہ میں ایک فریق (یعنی فروخت کرنے والا مومن) اور ایک شے (فروخت کردہ چیز — اموال و نفوس) تو محسوس و مشہود ہوں گے اور فریق ثانی (یعنی خریدار — اللہ) اور قیمت فروخت (جنت) محض تصوراتی۔ کیا دنیا میں کبھی ایسا معاہدہ یا بیع و شریٰ کا معاملہ بھی سننے میں آیا ہے؟ لہٰذا اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں تک مسئلہ زیرِ نظر کا تعلق ہے، پہلے آیت زیرِ بحث میں اللہ، اور جنت کا مفہوم متعین کر لیا جائے تاکہ بات واضح ہو جائے۔

اللہ کی ذات کے متعلق، سلیم! انسان کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ معاملہ انسانی شعور و ادراک کی حد سے ماوراء ہے۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ "اگر حقیقت یہ ہے تو پھر ہمارا اور اللہ کا تعلق کیا ہے؟" یہ بحث بہت تفصیل طلب ہے۔ اس کے لئے تمہیں کچھ عرصہ اور انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت اس وسیع و ہمہ گیر موضوع کے صرف ایک گوشہ کو سمجھ لینا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ جہاں تک ہماری موجودہ زندگی اور اس کے معاملات کا تعلق ہے، ہمارا واسطہ اللہ کے قانون سے ہے۔ اس ضمن میں اگر سلیم! تم ایک اہم نکتہ کو سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود نکل آئے گا۔ یعنی ان مقامات میں اللہ کی جگہ اگر تم "اللہ کا قانون" کہہ لیا کرو، تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ مثلاً "اللہ یحیی و یمیت" کا ترجمہ ہے "اللہ ہی مارتا ہے اور وہی جلاتا ہے"۔ اسے سمجھنے کے لئے تم یہ کہہ لیا کرو کہ "اللہ کا قانون مارتا ہے اور وہی زندہ رکھتا ہے"۔ یعنی زندگی اور موت قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل و متعین ہوتی ہے۔ یا "اللہ رزق دیتا ہے"، یعنی رزق اللہ کے قانون کے مطابق ملتا ہے۔ "اللہ

ہی بیمار کرتا ہے۔ اور وہی شفا دیتا ہے"۔ یعنی بیماری اور شفا اللہ کے قانون کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ "ہر کام کا اجر اللہ دیتا ہے"۔ یعنی ہر کام کا نتیجہ اللہ کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ "رنج و راحت سب خدا کی طرف سے ملتے ہیں"۔ یعنی مصیبت اور راحت سب قانون خداوندی کے مطابق ملتی ہے۔ یا ختم اللہ علیٰ قلوبھم "یعنی اللہ کا قانون اُن کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے"۔ وقس علیٰ ہذا۔

اب سلیم! ایک قدم اور آگے بڑھو۔ "اللہ کا قانون" ایک تو وہ ہے جو آفاقی کائنات میں ہر شے کو محیط ہے اور جس کے مطابق یہ تمام نگار خانۂ ہست و بود اس حسن و رعنائی سے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں سرگرم عمل ہے۔ اور اس قانون کا دوسرا حصہ وہ ہے جو قرآن کی دفتین میں نوع انسانی کی راہ نمائی کے لئے محفوظ ہے۔ آفاقی قانون خداوندی، از خود ہر جگہ نافذ العمل ہے کیونکہ کائنات میں کسی شے کو اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ لیکن دنیائے انسانیت میں خدا کا قانون انسانوں کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوگا۔ کیونکہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے۔ اس قانون کے نفاذ کے لئے ایک ہیئت اجتماعیہ کی ضرورت ہوگی۔ اس کا نام ہے ملتِ اسلامیہ جس کا فریضہ حیات، قانون خداوندی کا نفاذ ہے۔ لہٰذا جب انسانی دنیا سے متعلق قانون خداوندی کا ذکر ہوگا تو وہاں "اللہ" سے مراد ہوگا۔ ملت کا وہ اجتماعی نظام جو اللہ کے قانون کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس مفہوم کو سمجھ لینے کے بعد قرآن کے اور بہت سے گوشوں کا مفہوم بھی بآسانی سمجھ میں آجائے گا۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ کونوا انصار اللہ "تم اللہ کے مددگار بن جاؤ"۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تو انسانوں کی مدد کا محتاج نہیں۔ اس لئے اس کے معنی واضح ہیں کہ افرادِ جماعت کو چاہیئے کہ وہ اپنے نظام اجتماعیہ کی مدد کریں جو خدا کا قانون عملاً نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یا مثلاً واقرضوا اللہ قرضاً حسناً "اللہ کو قرضِ حسنہ دو"۔ سو اللہ تو کسی کے قرض کی احتیاج نہیں رکھتا۔ لہٰذا اس کا مفہوم واضح ہے کہ افرادِ جماعت پر لازم ہے کہ وہ اپنا مال نظام اجتماعیہ کے سپرد کریں تاکہ وہ ملت کے کمزور گوشوں کی کمی پوری کر کے اس میں توازن قائم رکھ سکے (حسناً سے یہی مفہوم ہے)

ان تصریحات سے سلیم! تم یہ سمجھ گئے ہو گے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ

بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ”کے معاہدہ میں فریقِ اول یعنی اللہ سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد ہے ملّت کا وہ نظامِ اجتماعیہ جو دنیا میں قانونِ خداوندی نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یعنی یہ آیتِ جلیلہ درحقیقت، ملّت اور افراد کے باہمی تعلق کا منشور ہے۔ اس معاہدہ میں فریقین کا تعین ہو گیا۔ اب بیع و شریٰ کی اشیاء کی طرف آئیے۔ اس معاہدہ کی رو سے افراد یہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ اپنا مال (یعنی ماحصل اکتساب) اور جان (یعنی عطایائے خداوندی) ملّت کے حوالے کرتے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں ملّت، ان کے لئے جنّت کی ذمہ دار بنتی ہے۔

جس طرح ہم نے اس معاہدہ میں اللہ کے صحیح مفہوم کا تعین کیا ہے۔ اسی طرح جنت کا مفہوم متعین کرنا بھی ضروری ہے۔

جس طرح مسلمانوں نے اللہ کو عرش پر بٹھا رکھا ہے اسی طرح انہوں نے جنت کو بھی دوسری دنیا کے ساتھ مختص کر رکھا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس خط میں، اس اہم موضوع کے متعلق بھی تفصیل سے کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔ جنّت، دوزخ قیامت، الساعت، بعثت، میزان سب اسی اہم موضوع کے غور طلب گوشے ہیں۔ جب سلیم! قرآن کی روشنی میں ان گوشوں سے پردے اٹھیں گے تو تمہارے سامنے ایک نئی دنیا آجائے گی۔ اور اس وقت تم قرآن کی عظمت اور رفعتِ حقائق پر وجد کرو گے۔ اس کے لئے معارف القرآن کی آخری جلد کا انتظار کرنا ہوگا۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ جب نظامِ زندگی، قانونِ خداوندی کے مطابق استوار ہو کر انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں توازن قائم کر دے تو اس سے انسانیت کا قیام ظہور میں آجاتا ہے اور اس سے صفحۂ ارض پر جنّت کی بساط بچھ جاتی ہے۔ یہ اس دنیا کی جنت ہے۔ اور چونکہ سلسلۂ حیات غیر منقطع طور پر آگے بڑھتا ہے اس لئے اس جنت کی وسعتیں طبعی موت کے بعد کی زندگی کو بھی محیط ہو جاتی ہیں۔ اس جنتِ ارضی کی تفاصیل قرآن کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے موضوع زیرِ نظر کے اعتبار سے اس کی اہم شقیں یہ ہیں کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى۔ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸) اس میں کسی کو بھوک، پیاس۔ لباس اور

مکان کی تکلیف نہ ہوگی۔ لَا یَمَسُّنَا فِیْھَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّنَا فِیْھَا لُغُوْبٌ (۳۵/۳۵)، نہ اس میں مشقت اور تکلیف ہوگی، نہ افسردگی اور پژمردگی۔ خوف اور حزن بھی نہیں۔ (۳۵/۳۴)، ہر طرح سے سلامتی ہی سلامتی ہوگی۔ (۵۶/۲۶) لہٰذا ارضی جنت اس اسلوبِ حیات کا نام ہے جس میں زندگی کی تمام ضروریات بغیر کسی ذہنی واماندگی اور کبیدگیٔ خاطر کے میسر آتی رہیں۔ اپنی حفاظت کی طرف سے کامل اطمینان ہو اور ہر شخص کے فطری جوہروں کی نمود و ارتقا کے سامان مہیا ہوں۔ یہ ہے جنت سے مفہوم۔

اب سلیم! تم اس قرآنی معاہدہ پر پھر غور کرو۔ افرادِ ملت، اپنی اکتسابی اور وہبی استعدادوں کے ماحصل کو نظامِ اجتماعیہ کے سپرد کر دیتے ہیں اور نظامِ اجتماعیہ ان کے خورد و نوش مکان، لباس، حفاظت اور نشو و ارتقا کے دیگر ضروری اسباب و ذرائع کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔ ان افراد کی اپنی ضروریات بھی اور ان کے بچوں کی بھی کیونکہ "جنت" میں ان کے ساتھ ان کی ذریت بھی شامل ہوتی ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْھُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ (۵۲/۲۱)، اب اس نظام کی ترتیب یوں ٹھہری کہ اس میں شامل ہونے والے تمام افراد کی جملہ ضروریاتِ زندگی اور اسبابِ نشو و ارتقا کی ذمہ داری اس نظام نے لے لی۔ اور مختلف افرادِ ملت کے سپرد ان کی استعداد کے مطابق، مختلف کام کر دیئے۔ کسی کے سپرد زمین کا ٹکڑا کر دیا کہ وہ ہل جوتے۔ کسی کو صنعت و حرفت کے کسی شعبہ میں لگا دیا۔ کسی کی تحویل میں مبادلۂ اشیائے ضروریہ دیدیا۔ کسی کو تعلیم و تربیت کا نگران مقرر کر دیا۔ کسی کے ذمہ نظم و نسق ہیئتِ اجتماعیہ (کاروبارِ حکومت) لگا دیا۔ اربابِ فکر و نظر کو مصالحِ ملی اور انسانیت کے مستقبل کی تدابیر سونپ دیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اب یوں سمجھو کہ مثلاً ایک شخص نے ایک دن میں پانچ روپے کا کام کیا ہے اور اس کی ضروریاتِ زندگی کے لئے دس روپے درکار ہیں، تو نظامِ اجتماعیہ، جس نے اس کی "جنت" کا ذمہ لے رکھا ہے، اسے پانچ روپے اور دے گا۔ اور اس امداد کے لئے یہ شخص کسی طرح بھی زیرِ بارِ منت نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ وہ اس معاہدہ کی رو سے جو اس نے اس نظام سے کر رکھا ہے اس کمی کے پورا کئے جانے کا حقدار ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص نے دن بھر میں دس روپے کا کام کیا ہے اور اس کی ضروریات کے لئے پانچ ہی روپے

کفایت کرتے ہیں تو بقایا پانچ روپے (جسے قرآن نے العفو کہا ہے) نظام اجتماعیہ کی ملکیت ہیں۔ کیونکہ اس فرد کاسب نے اپنا تمام مال اس نظام کے ہاتھوں بیچ رکھا ہے۔ اب اگر ضروریاتِ اجتماعی کا تقاضا ہے کہ اس فاضلہ رقم کو نظام اجتماعیہ اُسی وقت اپنی تحویل میں لے لے، تو وہ رقم فوراً اُن کی طرف منتقل ہو جائے گی لیکن اگر اس کی فوری ضرورت نہیں تو یہ بطور امانت اس شخص کی تحویل میں رہے گی۔ اب ظاہر ہے کہ امانت کو کسی صورت میں بھی ملکیت نہیں کہا جا سکتا۔

کہو سلیم! اس نظام میں ذاتی ملکیت کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ العفو (ضروریات سے فاضل) بطورِ امانت فردِ متعلقہ کی تحویل میں رہ سکتا ہے۔ اب یہ چیز اس نظام کے اختیار میں ہے کہ اس تحویل کے لئے جس قسم کے قواعد و ضوابط چاہے متعین کر دے۔

اس کے لئے یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ جب ہم کہتے ہیں کہ قرآنی نظام میں انفرادی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ عام روزمرہ کے استعمال کی اشیاء بھی انفرادی ملکیت میں نہیں رہتیں۔ یہ ظاہر ہے کہ گھر کے اندر بہت سے استعمال کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ان اشیاء کے انتخاب میں انفرادی ذوق کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ لباس، برتن، فرنیچر۔ مویشی اور سواری کے جانور۔ دیگر اشیائے ضروریہ، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب انفرادی ملکیت میں رہیں گی لیکن اس ملکیت اور نظام سرمایہ داری کی ملکیت میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قرآن میں اس عبوری دور سے متعلق احکام بھی آئے ہیں جس میں ہنوز قرآنی نظام متشکل نہ ہوا ہو۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن میں انفاق فی سبیل اللہ (خیرات وغیرہ) کے لئے ترغیب و تحریص دلائی گئی ہے۔ اگر افراد ملت، اپنے معاہدہ کی رو سے، اپنے اموال کو نظام اجتماعیہ کے پاس فروخت کر چکے ہوں اور ان کی ضرورت سے زائد مال، ان کی تحویل میں بطور امانت رکھا جاتا

مقصود ہو تو اس امانت کی بازیابی کے لیئے ترغیب و تحریص کی کیا ضرورت ہے۔ نظامِ اجتماعیہ جب جی چاہے اس امانت کو واپس لے لے۔ ترغیب و تحریص سے تو ظاہر ہے کہ یہاں افراد متعلقہ کی ملکیت ہے۔ اور نظام اجتماعیہ اسے، ان کی مرضی کے خلاف ان سے نہیں لے سکتا۔

یہ اعتراض واقعی ایک شبہ پیدا کرتا ہے جس کا ازالہ ضروری ہے۔ پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس معاہدہ کی رو سے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، افرادِ ملت صرف اپنا مال ہی ملت کے ہاتھوں نہیں بیچتے بلکہ اپنی جانیں بھی بیچ دیتے ہیں۔ جس سے لامحالہ یہی مفہوم ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے وقت، یہ تمام افراد سپاہیانہ حیثیت سے فوج کی صفوں میں آجائیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ اسلامی نظامِ اجتماعیہ میں تمام مسلمان (اپنے اس معاہدہ کی رو سے) فوج کے سپاہی ہوتے ہیں۔ اس میں انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں جہاد فی سبیل اللہ میں شمولیت کے لیئے بھی آیات ترغیب و تحریص کی کمی نہیں۔ جس طرح انفاق فی سبیل اللہ کے لیئے ترغیب دلائی گئی ہے، اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ کے لیئے بھی تحریص و تشویق کی صورت اختیار کی گئی ہے۔ لہذا اگر ترغیب و تحریص کی آیات سے یہ مفہوم لیا جائے کہ یہ معاملہ افرادِ ملت کے اختیار پر چھوڑا گیا ہے تو مومنین کے لیئے فوجی خدمت بھی اختیاری رہ جائے گی۔ حالانکہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ فوجی خدمت ہر مردِ مومن پر لازم ہوتی ہے۔ ہر مومن خدا کا سپاہی ہوتا ہے اور ہر وقت جہاد کے لیئے تیار۔ لہذا اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ محض آیات ترغیب و تحریص کی موجودگی اس پر مستلزم نہیں کہ نظامِ اجتماعیہ مومنین کے جان و مال میں تصرف کا حق نہیں رکھتا کیونکہ یہ افراد کی ملکیت ہوتے ہیں۔

آیاتِ ترغیب و تحریص سے، سلیم! دو باتیں مقصود ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن اُن حالات کو بھی سامنے رکھتا ہے جن میں ہنوز نظامِ اجتماعیہ اپنی مکمل شکل میں قائم نہ ہوا ہو۔ ان حالات میں، جب وہ ابھی اس قابل نہ ہو کہ افرادِ ملت کو "الجنتہ" دے سکے۔ یعنی ان کی تمام ضروریاتِ زندگی اور سامانِ نشو و ارتقا کی کفالت کر سکے تو وہ افرادِ ملت کا مال اور جان خریدتا نہیں۔ کیونکہ جب وہ ان کی قیمت ہی ادا

نہیں کرسکتا تو انہیں خریدے گا کیسے؟ جب وہ معاہدہ کی وہ شق جو اس سے متعلق ہے پوری کرنے کی ہنوز استطاعت نہیں رکھتا تو وہ معاہدہ کرے گا ہی نہیں۔ ان حالات میں اموال و نفوس، افراد کی ملک میں رہیں گے۔ اور انہیں اجتماعی مسائل کے حل کے لئے ان کی مرضی کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکے گا۔ اس کے لئے ترغیب و تحریص کی ضرورت ہوگی۔ یعنی انہیں یہ بتانے کی کہ اگرچہ سردست انہیں اُن کے اموال و نفوس کی قربانی کے بدلے میں کوئی مشہود معاوضہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اگر وہ اَن دیکھے نتائج پر یقین رکھیں (جسے ایمان بالغیب کہتے ہیں) تو ان کا انفاق و جہاد فی سبیل اللہ، اس نظامِ اجتماعیہ کے قیام کا ذریعہ بن جائے گا۔ جس کا فطری نتیجہ "الجنہ" ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ جنّتِ ارضی ان کی اپنی زندگی میں سامنے آجائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ درخت اُن کے بعد ثمر بار ہو اور اُن کی آنے والی نسلیں (یعنی آنے والی انسانیت) اس جنت کی زندگی سے متمتع ہوسکیں۔ لہٰذا ترغیب و تحریص کی آیات، اسی عبوری دور سے متعلق ہیں، ورنہ جب افراد ملت اور نظامِ اجتماعیہ میں بیع و شریٰ کا وہ معاہدہ مکمل ہوجائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے تو جب تک وہ معاہدہ قائم رہے گا فریقین پر اس کی پابندی لازم آئے گی۔

یہ تو رہا سلیم! اس مسئلہ کا خارجی پہلو۔ لیکن اگر اس کے نفسیاتی پہلو کو دیکھا جائے تو معاہدہ کے باوجود اس ترغیب و تحریص کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس ضرورت کو سمجھنے کے لئے، اس کے چند ایک مبادیات کو سامنے لانا ضروری ہے۔ میں سلیم! جانتا ہوں کہ تم خشک موضوعات سے جلد گھبرا جایا کرتے ہو۔ اور نفسیات تمہارے لئے ہمیشہ "عبوسًا قمطریرًا" کا حکم رکھتا ہے (خدا کرے کہ تم اس کے "تر و تازہ" گوشے سے بہرہ یاب ہونے کی صلاحیت پاسکو)۔ اس لئے میں کوشش کروں گا کہ اس کے اصطلاحی پہلوؤں سے درگزر کرتے ہوئے تمہاری زبان میں ہی بات سمجھا سکوں اگرچہ اس اسلوب کا نباہنا مشکل ہوا کرتا ہے۔ بہرحال ذرا غور سے سمجھنے کی کوشش کرو۔

حیوانات میں کسی ایک نوع کو لو۔ تم دیکھو گے کہ اس نوع کے افراد میں "کمانے" کی استعداد میں بہت کم فرق ہوگا۔ (حیوانات میں "کمانے" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اس سے مقصود اُن کی اپنی طبعی ضروریات

کے پورا کرنے کی صلاحیت ہے، مثلاً جنگل کے ہرنوں کو دیکھو (بیمار وغیرہ کو چھوڑ کر) تمام ہرن پیٹ بھرنے کے لئے گھاس چرنے کی صلاحیت یکساں طور پر رکھیں گے۔ لیکن اس کے برعکس انسانوں کو دیکھو۔ مختلف افراد کی اکتسابی صلاحیتوں کا تفاوت ایک حقیقت باہرہ ہے۔ قرآن اسی استعدادی فرق کو "فضلنا بعضھم علیٰ بعض" کے جامع الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی قانون خداوندی نے بعض افراد کو دوسرے افراد کے مقابلہ میں، کسب معاش کی استعداد زیادہ ...... عطا کر رکھی ہے۔ لہٰذا جب کسب معاش کی استعداد میں تفاوت ہے تو اس استعداد کے ماحصل یعنی کمائی میں بھی فرق ہوگا۔ یعنی ایک زیادہ کما سکے گا دوسرا کم۔ اور یہ واقعہ ہے۔

اب آگے بڑھو۔ جب ایک ہرن اپنا پیٹ بھر لے گا تو وہ درخت کے سائے تلے اطمینان سے بیٹھ جائے گا اور سُکھ کی نیند سوئے گا۔ اسے اس کی قطعاً فکر نہ ہوگی کہ جنگل کی گھاس کو دوسرے ہرن کھائے جا رہے ہیں اگر انہوں نے اسے ختم کر دیا تو وہ شام کو بھوکا رہ جائے گا۔ تم نے سلیم! اپنی گاے کو نہیں دیکھا؟ جب وہ پیٹ بھر کر جگالی کرنے بیٹھ جاتی ہے تو وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی کہ باقی ماندہ چارہ کون لئے جا رہا ہے! اسے چارہ کا خیال پھر اس وقت آتا ہے جب اسے دوبارہ بھوک لگتی ہے۔ یعنی سیر ہو جانے کی صورت میں وہ سیر چشم بھی ہو جاتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں انسان کو دیکھو اس کا پیٹ بھر جاتا ہے لیکن نیت نہیں بھرتی۔ صبح کھانے سے ہنوز فارغ نہیں ہوتا کہ شام کی فکر ستانے لگ جاتی ہے۔ اور پھر کل کی۔ اور پرسوں کی۔ اور بڑھاپے کی اور پھر اپنے بعد اپنی اولاد کی۔ اور اولاد در اولاد کی۔ یہ سلسلہ دراز اسے عمر بھر ستاتا رہتا ہے۔ یعنی اس کا پیٹ بھر جاتا ہے نیت نہیں بھرتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان مآل اندیش واقع ہوا ہے اور مآل اندیشی کا تقاضا ہے کہ انسان دوراندیشی اور کل کی فکر بھی کرے۔ لیکن یہ کل کی فکر وہ پیٹ کی بھوک کے لئے ہی نہیں کرتا۔ بلکہ بیشتر نیت کی بھوک کی خاطر کرتا ہے سلیم! تم نے ایسے لوگ دیکھے ہوں گے کہ اُن کے پاس اتنا روپیہ جمع ہے کہ اُن کی پشت ہا پشت کو بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں۔ بایں ہمہ ہر وقت ھل من مزید کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ اس "نیت کی بھوک"

یعنی بے صبری کی تعبیر کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اِنَّ الْاِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا (۷۰/۱۹) یعنی انسان بہت بے صبرا پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اپنی پسندیدہ چیزوں کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے بڑا شدید جذبہ رکھتا ہے۔ اسی کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ انه لحب الخير لشديد۔ (۱۰۰/۸) یہ سب کچھ سمیٹ لینے کی ہوس بھوک کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ ایک اور جذبہ کے ماتحت ہوتی ہے جسے قرآن نے تکاثر اور تفاخر، کی جامع اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ۔ منافست اور مسابقت کی خواہش تفاخر بينكم و تكاثر فی الاموال والاولاد (۵۷/۲۰) اور یہ جذبہ قبر تک انسان کے ساتھ جاتا ہے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُر حتی زرتم المقابر (۱۰۲/۱-۲)، وہ جذبہ جس کے ماتحت اس کا مقصودِ حیات "جمع مالًا وعددہٗ (۱۰۴/۲)، مال جمع کر کے اسے گنتے رہنے کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ تم دیکھو گے سلیم! کہ حیوانات میں باہمی مسابقت ومنافست کا جذبہ کہیں کارفرما نہیں ہوتا۔ کوئی بکری یہ دیکھ کر نہیں کڑھتی کہ ہرن اس برق رفتاری سے کیوں دوڑ رہا ہے۔ یہ انسان ہی کی "خصوصیت" ہے اور اس کی وجہ ہی "بے صبراپن"

اب سلیم! دو باتیں ہمارے سامنے آگئیں۔

اول یہ کہ مختلف انسانوں میں کمانے کی استعداد وصلاحیت مختلف ہوتی ہے۔
اس لئے ایک فرد دوسرے فرد سے زیادہ کمائی کر سکتا ہے۔

اور دوسرے یہ کہ انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہو جانے کے باوجود، وہ
سب کچھ سمیٹ کر اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہے۔

لہذا جس کی کمائی اس کی ضروریات سے زائد ہوگی وہ اس فاضلہ مال کو سمیٹ کر رکھنے
کی فکر کرے گا کسی دوسرے کو نہیں دے گا۔ اور پھر ہر وقت اس میں مزید اضافہ
کی فکر کرتا رہے گا۔

یہ ہیں سلیم! وہ حقائق نفس الامری جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی موجودگی میں دنیائے انسانیت میں فساد رونما ہونا یقینی ہے۔ نہ آپ اکتسابی استعداد کے تفاوت کو مٹا کر تمام انسانوں کو اس پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ایک

جیسا کمائیں۔ اور نہ ہی اُن کے اس جذبہ سے چشم پوشی کر سکتے ہیں کہ ہر شخص سمیٹنے کی فکر نہ کرے۔ انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے اس "فتنہ" کا علاج یہ سوچا کہ انسانوں کو دنیا ترک کر دینے کی تعلیم دیجئے۔ نہ دنیا کی آرزو رہے اور نہ ان آرزوؤں سے پیدا شدہ فساد کا امکان۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ترکِ لذات۔ ترکِ خواہشات۔ ترکِ مقاصد ترکِ دنیا (حتیٰ کہ صوفیاء کی اصطلاح میں "ترکِ ترک") یہ سوچا گیا اس کا علاج۔ نفس کُشی یا فنائے ذاتِ انسانی "روحانیت" کا کمال تصور کر لیا گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ طریق علاج ہمارا بتایا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ انسان کا اپنا وضع کردہ تھا اور چونکہ قانونِ کائنات کے خلاف تھا اس لئے اس کا نباہ بھی ممکن نہ تھا (ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ماکتبنھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا ۵۷/۲۷) اس طریق علاج (رہبانیت) کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ دنیا طلبی کا جذبہ "شر" (Evil) کی حیثیت رکھتا ہے اور شر کا استیصال روحانیت کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے اس جذبہ کے فنا کر دینے ہی میں نجات پوشیدہ ہے۔ یہ مفروضہ یکسر باطل اور ایک بہت بڑے فساد کا باعث ہے۔ اگر سلیم! اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ "انسانی فطرت" میں بعض جذبات "شر" Evil کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں تو اس سے خالقِ فطرت کے متعلق جو تصور پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے اس تصور کا سرچشمہ رہا کم از کم قریبی چشمہ عیسائیت کا۔ عقیدہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی گنہ گار ہوتا ہے۔ ہم اپنے موضوع زیرِ نظر سے دور نکل جائیں گے ورنہ میں تمہیں سلیم! بتاتا کہ کائنات میں فی ذاتہ شر کا وجود ہی نہیں۔ منبعِ کائنات (رحمانی توانائی (Divine Energy) یکسر خیر ہے لہذا اس کے مظاہر شر کیسے ہو سکتے ہیں؟ شر تو اس صورتِ حالات سے پیدا ہوتا ہے جس میں انسان اپنی قوتوں کے غلط استعمال سے اپنے نظام کا توازن بگاڑ دیتا ہے (اسی کو فساد کہتے ہیں) یہی قوتیں جب توازن قائم کرنے میں صرف کی جائیں تو ان کا ماحصل خیر ہی خیر ہوتا ہے۔ لہذا یہ اصول یکسر غلط نگہی پر مبنی ہے کہ انسانی قویٰ اور جذبات میں سے بعض شر انگیز ہوتے ہیں اس لئے ان کی فنا ہی میں انسان کی بقا کا طرز پوشیدہ ہے۔ ان ہی دو چیزوں کو لیجئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے یعنی اکتسابی صلاحیتوں میں تفاوت اور باہمی تکاثر و تفاخر۔ اگر ان خصوصیات، جذبات کو مٹا دیا جائے تو

سوچو کہ انسانوں کی دنیا کیا بن کر رہ جائے۔ یہ دنیا پتھروں کی دنیا بن جائے۔ یا جنگل کے حیوانات کی دنیا۔ جو لوگ ترکِ آرزو سے دنیا چھوڑ کر زاویوں اور خانقاہوں میں جا چھپتے ہیں، جہاں تک دنیائے انسانیت کا تعلق ہے۔ ان میں اور پتھروں میں فرق کیا رہ جاتا ہے؟ بجز اس کے کہ پتھر زمین کی چھاتی پر بوجھ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ زندہ پتھر دوسرے انسانوں کی چھاتی پر بوجھ۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن اس باب میں کیا کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان قوٰی و جذبات کو بے محابا چھوڑ دیا جائے تو اس کا نتیجہ فساد ہی فساد ہوتا ہے اور انہیں فنا کر دیا جائے تو دنیائے انسانیت کی تمام ترقیاں یک قلم رُک جاتی ہیں! قرآن اس باب میں ایک عجیب راہ اختیار کرتا ہے۔ (اور وہ کونسا باب ہے سلیم! جس میں وہ عجیب راہ اختیار نہیں کرتا!) قرآن ان جذبات کو نہ بے زمام چھوڑتا ہے اور نہ ہی انہیں فنا کرتا ہے۔ وہ اُن کا رُخ بدل دیتا ہے اور رُخ کے بدل جانے سے ساری دنیا بدل جاتی ہے۔

سلیم! یہ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ جہاں تک انسان اس اندیشہ کی وجہ سے مال جمع کرتا ہے کہ وہ وقت بے وقت اس کے کام آئے، یا اگر اس کی موت بے وقت ہو جائے تو اس کی اولاد کس مپرسی کی حالت میں نہ رہ جائے تو یہ اندیشہ اس نظام کے ماتحت خود بخود رفع ہو جاتا ہے جو اس کی اور اس کی اولاد کی تمام ضروریات کو اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔ کیونکہ اس نظام کی عطا کردہ جنت میں خوف و حزن کا نام نہیں۔ اب رہا ایک دوسرے سے مسابقت کا جذبہ۔ یعنی عزت کا خیال اور فخر کا جذبہ۔ قرآن اس باب میں فخر اور عزت کا معیار بدل دیتا ہے اور اس طرح مسابقت اور منافست کے لئے نئے میدان عطا کر دیتا ہے۔ ذرا سورۂ حدید کی ان آیات کی طرف غور کرو سلیم! جن کا ایک ٹکڑہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ فرمایا۔ اعلموا انما الحیٰوۃ الدنیا لعب ولھو وزینۃ وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد "یہ حقیقت کو سمجھو کہ دنیوی مفاد کی زندگی کھیل تماشا اور ظاہری زیبائش، باہمی تفاخر اور مال اور اولاد کے لئے تکاثر (ایک دوسرے پر کثرت رکھنے) کی زندگی ہے۔ کمثل غیث اعجب الکفار نباتہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما بارش کی طرح جس کا کھیتی کو اگانا

کسانوں کو خوش آتا ہے۔ پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو وہ اسے ریزہ ریزہ شدہ دیکھتا ہے۔ وفی الآخرۃ عذاب شدید اور ان کے لئے مستقبل میں شدید سزا ہے۔ ومغفرۃ من اللہ ورضوان اس کے برعکس اللہ کے ہاں مغفرت اور رضوان ہے، وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ مفاد عاجلہ کی زندگی دھوکے کا سامان ہے۔ یعنی مفاد عاجلہ کے پیش نظر، باہمی تکاثر و تفاخر کا جذبہ، اپنے اندر بظاہر بڑی کشش و جاذبیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ خوشگواری محض وقتی ہوتی ہے، انسانی زندگی جو ابدیت در کنار ہے۔ اس سے اپنے اندر نمود و ارتقا کا سامان نہیں پاتی۔

اب اس کے بعد قرآن یہ نہیں کہتا کہ یہ جذباتِ مسابقت و مفاخرت اس قابل ہیں کہ انہیں فنا کر دیا جائے بلکہ وہ کہتا ہے کہ مسابقت کے جذبات کی تسکین کے لئے ایک اور میدان ہے۔ آؤ اور اس میدان میں ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنا حوصلہ نکال لو۔ یہ میدان کونسا ہے۔ فرمایا۔ سابقوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضہا کعرض السماء والارض اُعدت للذین اٰمنوا باللہ ورسلہٖ ایک دوسرے پر سبقت لیجانا چاہتے ہو تو اپنے نشوونما دینے والے سے۔ مانعِ نشوونما اسباب وعلل سے پناہ جوئی اور حفاظت طلب کرنے میں اور اس جنّت کے حصول میں جو پستیوں اور بلندیوں پر چھائی ہوئی ہے اور ان لوگوں کے لئے تیار کی جاتی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ سبقت لیجانے کی کوشش کرو ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم (۵۷/۲۱) حقیقی فضیلت تو یہ ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق ملتی ہے اور اللہ بہت بڑی فضیلتیں عطا کرنے والا ہے۔

غور کیا سلیم! تم نے کہ قرآن نے کس طرح جذباتِ مسابقت کا رخ ایک بلند و بالا سمت کی طرف پھیر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم ایک دوسرے پر مسابقت عزت کے حصول کے لئے چاہتے ہو۔ یہ تمہاری بھول ہے کہ عزت مال اور دیگر اضافات کی کثرت کا نام ہے۔ حقیقی عزت یہ ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم تم میں سے جو شخص سب سے زیادہ اپنی معاشی زندگی کو سماوی قانون سے ہم آہنگ کر کے رکھے گا۔ وہی سب سے زیادہ قابلِ عزت ہوگا۔ آؤ اور اس میدانِ عزت و تکریم میں ایک دوسرے سے بڑھو۔ اُس میدان میں بڑھنے سے

وہ نظام قائم ہو جائے گا۔ جس کا عملی نتیجہ جنتِ ارضی کا قیام ہو گا۔

سورۂ فاطر میں دیکھو جہاں وارثینِ کتابِ خداوندی کے تین طبقات کا ذکر ہے۔ ایک وہ جو ظالم لنفسہ (اپنے آپ پر زیادتی کرنے والے ہیں)، دوسرے وہ جو مقتصد (بین بین چلنے والے ہیں)، اور تیسرے وہ جو سابق بالخیرات (خوشگوار حالات پیدا کرنے میں آگے بڑھنے والے) ہیں۔ (۳۵/۳۲) یہ وہ سابقت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ ذالک ھو الفضل الکبیر۔ یہ وہ برتری ہے جس میں کبریائی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی وہ السابقون السابقون ہیں جن کے متعلق سورۂ واقعہ میں فرمایا کہ اولٰئک المقربون فی جنّٰت النعیم (۵۶/۱۱-۱۲)

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ انسان، ذخائر و انبار بالآخر چاہتا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کی عقل کا تقاضا تحفظِ ذات (Preservation of Self) ہے۔ ہر فرد کی عقل اس کی اپنی ہوتی ہے اس لئے ہر فرد اپنی عقل کی رو سے اپنے آپ کا تحفظ چاہتا ہے۔ اگر غور کرو تو تکاثر و تفاخر بھی سب اسی تحفظِ ذات ہی کی شق میں آجاتے ہیں۔ عقل کا یہ تقاضا کوئی مذموم تقاضا نہیں۔ یہ اس کا فریضہ ہے۔ وہ بنی ہی اس لئے ہے کہ انسان کی طبعی زندگی کی حفاظت کرے۔ لیکن، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، چونکہ ہر فرد کی عقل الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لئے عقل صرف اپنے فرد کی حفاظت ہی کی فکر کر سکتی ہے۔ وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتی۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ اس کی تمام کوششوں کے باوجود، انسان کا طبعی جسم فنا آمادہ ہو رہا ہے تو وہ اسے یہ کہہ کر تسلی دیدیتی ہے کہ اب تیری بقا تیری اولاد کے ذریعے ہو گی۔ وہ بیٹے کو باپ کا عکس بنا کر دکھاتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ تیرے گھر کا چراغ اور تیرا نام روشن کرنے کا ذریعہ ہے اس سے تیرا ذکر آگے بڑھے گا اور تیرا سلسلہ آگے چلے گا۔ تم نے معارف القرآن جلد دوم میں پڑھا ہو گا کہ "ابلیس" نے آدم کو جس "ملک لا یبلی" (ایسی مملکت جو پہلو نہ بدلے) کی طرف دعوت دی تھی وہ اولاد کے ذریعے حصول بقا ہی کا تصور تھا۔ لیکن اس سے نہ تحفظِ ذات ہوتا ہے نہ حیاتِ جاوید ملتی ہے۔ قرآن اسی عقل کو ایک بلند سطح پر لیجاتا ہے اور اس کے سامنے ایک ایسی حقیقت لے آتا ہے جس سے فی الواقعہ حیاتِ جاوید نصیب ہو جائے۔ وہ کہتا ہے کہ

الگ الگ رہنے سے افراد کی ربوبیت نہیں ہو سکتی حیات ایک غیر منقسم وحدت ہے جس کی رو سے تمام انسانیت ایک فرد واحد کی طرح ہے۔ اصل تحفظ انسانیت کا ہونا چاہیئے۔ درخت کی سلامتی میں اس کی شاخوں اور پتوں کی سلامتی ہے۔ جسم کی صحت میں جسم کے خلیات (CELLS) کی صحت کا راز مضمر ہے اس لئے وہ ... عقل کو یہ سمجھاتا ہے کہ وہ فرد کے تحفظ کے لئے انسانیت کے تحفظ کی فکر کرے۔ اور انسانیت کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ایک متوازن نظامِ زندگی قائم ہو جائے جس میں کم اکتسابی صلاحیتیں رکھنے والے افراد کی کمیوں کو زیادہ استعداد رکھنے والوں کے نتائج سعی و عمل سے پورا کر دیا جائے ان کمیوں کے پورا کر دینے سے نظام اجتماعیہ میں حسن (توازن) پیدا ہو جائے گا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس نظام سے وابستہ ہر فرد اپنی جان و مال کو اس نظام کے سپرد کر دے۔ ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم واموالہم اور وہ نظام ان تمام افراد کی ضروریات زندگی اور سامان نشو و نما کا کفیل ہو جائے۔ بان لہم الجنۃ

سلیم! انسان کے بے صبرا (ھلوعا) ہونے کی کیفیت کے ساتھ یہ بھی دیکھو کہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹ لینے کا جذبہ اپنے خاندان (اولاد) میں ماند پڑ جاتا ہے۔ یعنی ایک خاندان کا سرپرست اپنے اموال و مقبوضات کو اپنی ذات تک مخصوص نہیں رکھتا بلکہ افرادِ خاندان کو بھی ان میں شریک کر لیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن افراد سے انسان اپنا تعلق سمجھے انہیں وہ اپنے مال میں شریک کر لیتا ہے اور اس باب میں اس کا جذبۂ ہلوعیت یا حب الخیر مانع نہیں ہوتا۔ قرآن، انسان کی نگاہوں میں کشادگی پیدا کرتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ حقیقی رشتہ سلسلۂ تولید سے منسلک نہیں بلکہ انسانیت کا رشتہ اصلی اور حقیقی رشتہ ہے۔ یعنی وہ رشتہ داری کی حدود کو عالمگیر بنا دیتا ہے اور خون کے رشتہ کو انسانیت کے رشتہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جذبات وہی ہیں۔ بس ان کی تسکین کے لئے میدان دوسرا دیدیا جاتا ہے۔ ترغیب و تحریص کی آیات میں یہ مقصد بھی پوشیدہ ہے۔ یعنی ایک شخص اس لئے مال جمع کرتا ہے کہ اس کی اولاد کس مپرسی کی حالت میں نہ رہ جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ تیری نگاہ کی بھول ہے جو فقط اپنی اولاد ہی کو اولاد سمجھ لیا ہے۔ وہ یتیم بچہ جو کس مپرسی کی حالت میں رہ گیا ہے

فردِ نوعِ انسان ہونے کی وجہ سے تمہاری ہی اولاد ہے اس لیے تمہاری کمائی میں اس کا بھی حصہ ہے۔ ان آیاتِ ترغیب وتحریص کے متعلق عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ انفرادی صدقات وخیرات کی طرف مائل کرنے کے لیے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اسلامی نظام میں تمام ضرورتمندوں کی ضروریات کی کفالت تو نظام کے ذمہ ہوتی ہے۔ جب وہ صدقات وخیرات کی تلقین کرتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ مختلف افراد، اپنی فاضلہ کمائی بطیبِ خاطر نظام کے سپرد کر دیں تاکہ وہ اس سے ان تمام ضروریات کو پورا کرتا رہے۔ بالفاظِ دیگر یہ ترغیبات وتحریصات، درحقیقت اس معاہدہ کی استواری کی غرض سے ہوتی ہیں جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ قرآن ان لوگوں سے جنہیں زیادہ استعداد ملی ہوتی ہے' یہ کہتا ہے کہ تم اپنی محنت کے معاوضہ ہی کے حقدار ہو۔ استعداد کی زیادتی تمہارے علم وہنر کی پیداوار نہیں۔ یہ تو تمہیں وہبی طور پر بطور بخشش ملی ہے۔ لہٰذا استعداد کی زیادتی کی وجہ سے جتنا کچھ تمہیں ملتا ہے' اگر تم گہرائی میں جا کر دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ درحقیقت اس پر تمہارا کوئی حق نہیں بلکہ ان کا حق ہے جنہیں کم استعداد ملی ہے یا جن کی استعداد کسی ہنگامی حادثہ کی وجہ سے سلب ہو چکی ہے۔

یہ ہے وہ دعوت علیٰ وجہ البصیرت جس سے قرآن اپنا نظام معاشی قائم کرتا ہے۔ اس لئے جہاں اُس نے کہا ہے کہ ان الانسان خلق ھلوعًا (انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے) اس سے آگے وہ کہتا ہے کہ الا المصلّین الذین ھم عن صلوٰتھم دائمون - والذین فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم (۷۰/۲۲-۲۵) یعنی انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے لیکن جو لوگ صلوٰۃ کا نظام قائم کرتے ہیں ان پر "بے صبراپن" کا یہ جذبہ اثر انداز نہیں ہوتا۔ یعنی اس جذبہ کی تسکین "نظامِ صلوٰۃ" میں ہوتی ہے جو حقیقی مساوات سکھاتا ہے اور افراد کو انسانیت کا جزو بنا کر دکھاتا ہے۔ اس نظامِ صلوٰۃ کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے قائم کرنے والے اس حقیقت کو واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی کمائی میں ضرورتمند اور محروم الوسائل افرادِ انسانیت کا معلوم و مشہود حق ہے۔

پھر یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس نظام کو ان افراد پر مسلط نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کے جوہرِ انسانیت کی بالیدگی (تزکیہ نفس) کا فطری نتیجہ اس نظام کا قیام ہوتا ہے۔ یعنی جب ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جاتی ہے تو وہ

خود محسوس کر لیتے ہیں کہ یہی نظام، حقیقی زندگی کا نظام ہے۔

دیکھا سلیم! تم نے کہ قرآن، انسان کو کہاں سے کہاں لیجاتا ہے؟ اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ قرآن کے معاشی نظام کی بنیاد کس اصول پر قائم ہے اور اس نظام میں ذاتی ملکیت کا کہیں سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے؟ یہ تو انسان کے خود ساختہ مذہب کی دنیا ہے جو یہ آواز بلند کرتی رہتی ہے کہ مال ہر ایک کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ یہ اس لئے کہ غریب و نادار کہیں یہ مطالبہ نہ کر بیٹھیں کہ انبار و ذخائر کے ان مالکوں سے فاضلہ مال لے کر ہماری بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کی جائیں۔ لیکن رسولوں کی طرف سے لایا ہوا نظام، مذہب کا عنکبوتی جال نہیں ہوتا۔ دین کا نظام ہوتا ہے جو اس معاہدہ کی رو سے جس کا ذکر اوپر ہوتا چلا آرہا ہے افراد کی اموال میں صرف تصرف ہی نہیں جائز قرار دیتا بلکہ ہر ایک کے اموال کو نظامِ اجتماعیہ کی ملک قرار دیتا ہے تاکہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ میں توازن قائم رہ سکے۔ تم نے سلیم، معارف القرآن کی تیسری جلد میں حضرت شعیبؑ کے تذکارِ جلیلہ میں پڑھا ہوگا کہ آپ کی اسی دعوتِ انقلابِ معاشی کو دیکھ کر مفادِ عاجلہ کے علمبردار پکار اٹھے تھے کہ یٰشعیب اصلوٰتک تامرک...... ان نفعل فی اموالنا ما نشٰؤ (۱۱/۸۷) اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے اس کا حکم دے رہی ہے کہ ہم اپنے اموال کو جس طرح ہمارا جی چاہے صرف میں نہ لائیں؟ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب کا معاملہ پوجا پاٹ کا معاملہ ہے۔ اسے بھلا ہماری جاگیرداریوں اور زمینداریوں سے کیا تعلق؟ ہم اپنے مال کے خود مالک ہیں۔ جس طرح جی چاہے خرچ کریں۔ یہ "مذہب کا نیا نظام" (یعنی دین کا نظام) ہے جو یہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ افراد کو سامنے رکھنے کے بجائے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کو سامنے رکھو جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اموال کو نظامِ اجتماعیہ کے قانون و ضوابط کے مطابق صرف کرو کیونکہ یہ مال تمہاری ملکیت نہیں۔ تمہارے پاس بطور امانت رکھا ہے! سلیم! انسانی طبائع کی اس بوالعجبی پر غور کرو۔ جس طرح حضرت شعیب کے زمانہ کے لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ دین میں ذاتی ملکیت کیوں جائز نہیں ہو سکتی اور اس قسم کی آواز بلند کرنے والے کو وہ گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتے تھے، آج بھی جو شخص یہ کہے

کہ قرآنی نظامِ اجتماعیہ میں ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، قوم شعیبؑ کی اسی پرانی آواز کی صدائے بازگشت ہر گوشے سے اٹھتی چلی آتی ہے۔

اگرچہ پیر ہے آدم۔ جواں ہیں لات و منات

یہ اس لئے کہ ہمارا آج کا اسلام ہمارے دورِ ملوکیت کی پیداوار اور نظامِ سرمایہ داری کی یادگار ہے۔ کیا تم نے سلیم! قرآن میں نہیں دیکھا کہ حضرات انبیائے کرامؑ کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت ہمیشہ مترفینؔ کی طرف سے ہوتی تھی؟ یہ گروہ دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والوں کا گروہ ہوتا ہے۔ جسے آج کی اصطلاح میں (Vested Interests) والوں کی جماعت کہا جاتا ہے۔

وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون (۳۴/۳۴)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہم نے جس بستی میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا تو وہاں کے سرمایہ دار گروہ نے ہمیشہ یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی کہ ہم تمہاری دعوت کو ماننے سے انکار کرتے ہیں

وقالوا نحن اکثر اموالا واولادا وما نحن بمعذبین (۳۴/۳۵)

وہ یہ کہتے کہ ہمارے پاس مال اور اولاد کی کثرت ہے اور اس وجہ سے ہمارا اقتدار اتنا بڑا ہے کہ ہمیں کوئی پوچھ تک نہیں سکتا۔ ہم دیکھیں گے کہ کون ہمارا بال بھی بیکا کرے گا؟ قرآن میں سلیم! نویں پارہ کی ابتدا قال الملاء سے ہوتی ہے۔ سورۂ اعراف میں یہ ٹکڑا ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کے ضمن میں آتا ہے۔ یعنی ان کی دعوت کی مخالفت ہمیشہ سردارانِ قوم کی طرف سے ہوتی تھی۔ اب ظاہر ہے سلیم! کہ اگر خدائی دعوتِ انقلاب سرمایہ دارانہ نظام کی مؤید ہوتی تو ان سرمایہ داروں کی طرف سے اس کی مخالفت کیوں ہوا کرتی! ان مترفین کی مخالفت کے علی الرغم رسول اپنا انقلابی نظام قائم کر جاتا۔ لیکن اس کے بعد مترفین پھر قوت پکڑ کر اسے الٹ دیتے (دیکھو ۱۱/۱۶) یہی سابقہ انبیائے کرامؑ کے قائم کردہ نظام کے ساتھ ہوا۔ اور یہی نبی اکرمؐ کے متمکن فرمودہ دین (نظامِ خداوندی) کے ساتھ۔ کچھ وقت کے لئے یہ نظام قائم رہا اور پھر مترفین نے اسے ملوکیت اور سرمایہ داری میں بدل دیا۔ ہمارا موجودہ مذہب

دین کی اسی تبدیل شدہ صورت کا نام ہے۔

سلیم! اب یہ حقیقت تمہارے سامنے آ چکی ہو گی کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؛ اور شاید یہ بھی تم سمجھ گئے ہو گے کہ کسی معاشی نظام کو اس فلسفۂ زندگی سے کیوں الگ نہیں کیا جا سکتا جس پر وہ نظام متفرع ہوتا ہے۔ ذرا سوچو سلیم! ایک شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی بس یہی زندگی ہے۔ موت کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور یہ کہ ہر فرد اپنی طبیعی زندگی الگ الگ رکھتا ہے۔ اس عقیدہ کے بعد سلیم تم اس سے کہتے ہو کہ تم محنت اور مشقت سے جو کچھ کماؤ اس میں سے صرف اتنا اپنے پاس رکھو جو تمہاری ضروریات کیلئے کافی ہو، باقی دوسروں کو دیدو۔ سلیم! ذرا غور کر کے بتاؤ کہ وہ کس دلیل یا کون سے جذبۂ محرکہ کے ماتحت ایسا کرنے پر راضی ہو جائے گا؟ زیادہ سے زیادہ تم اس کے جذبۂ ہمدردی کو ابھارنے کی کوشش کرو گے۔ لیکن اس طرح کے جذبۂ ہمدردی کا نفسیاتی تجزیہ کرو تو وہ اعصابی کمزوری پر مبنی ہوتا ہے۔ کمزور اعصاب والا انسان دوسروں کی داستانِ مصائب سے متاثر ہو جائے گا اور بھیک کا ٹکڑا ان کی طرف پھینک دے گا۔ یا اس سے آگے بڑھو تو تم اس سے کہو گے کہ دیکھو بھائی آج تم بہت خوشحال ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ کل ہی تم کسی حادثہ کے شکار ہو جاؤ اور تمہاری بھی یہی حالت ہو جائے جو اس بیکس و نادار کی ہے۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ کل تمہاری بھی کوئی مدد کرے تو تم آج اس کی مدد کرو۔ سلیم! دنیا کا ضابطۂ اخلاق اسی دلیل پر قائم ہے۔ یعنی۔ انتقام کا خوف۔ "اگر تم ایسا نہ کرو گے تو کل تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا"۔ کہو کہ یہ بنیاد بھی کوئی ایسی محکم بنیاد ہے جس پر کوئی پایندہ نظام قائم کیا جا سکے؟ اب تیسری شکل یہی باقی ہے کہ تم قانون کے زور سے کوئی ایسا نظام قائم کر دو۔ لیکن سلیم! استبداد سے قائم کردہ نظام انسانوں سے میکانکی طور پر تو کچھ کرا سکتا ہے۔ بطیب خاطر نہیں کرا سکتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ استبداد استبداد ہی ہے خواہ اس کے ذریعے آپ کتنا ہی عمدہ نظام قائم کرنا چاہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کچھ لوگ (مفسدین) ایسے ہوں گے جن سے یہ نظام جبراً منوایا جائے گا اور مترفین کا جو طبقہ اس نظام کے قیام میں مزاحم ہو گا ان سے انسانیت کے

غصب کردہ حقوق بجبر واپس لئے جائیں گے۔ لیکن اس نظام کے قائم کرنے والے اپنے دل کی گہرائیوں سے اس کی صداقت پر ایمان رکھیں گے۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ نہ وحدتِ انسانیت کے قائل ہوں نہ تسلسلِ حیات کے، ان سے معاشی توازن کا نظام قائم کرانا یا تو ہنگامی جذبات کے ماتحت ہو سکتا ہے یا استبداداً۔ دونوں صورتوں میں ارتقائے انسانیت ممکن نہیں۔

اسکے دوسری طرف، سلیم! قرآن کو دیکھو۔ وہ سب سے پہلے یہ اصول بطور فلسفۂ زندگی پیش کرتا ہے کہ حیات اپنے طول اور عرض دونوں میں غیر منقسم ہے۔ نہ تو زندگی کا خاتمہ موت سے ہو سکتا ہے اور نہ ہی مختلف افراد الگ الگ زندگی رکھتے ہیں۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو مسلسل چلے جارہی ہے اور موت کے بعد بھی چلے جائے گی۔ حیات ایک شجرِ محکم ہے جس میں ہر ذرہ ایک دوسرے سے پیوست بلکہ ایک دوسرے میں مدغم ہے۔ بہار پورے کے پورے درخت پر آنی چاہیئے۔ زندگی اپنا نشو و نما اسی طور پر چاہتی ہے اب دیکھو سلیم! کہ جو جماعت ان اصولی عقائد کی بنیادوں پر معاشی نظام کو استوار کرے اس میں ہر شخص یہ یقین محکم رکھے گا کہ جسے "دوسرے کو دینا" کہتے ہیں وہ درحقیقت "اپنے آپ کو دینا" ہے۔ جو کچھ میرے پاس فاضلہ ہے وہ میرا ہے ہی نہیں۔ وہ ان کا ہے جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ میں تو صرف اس کا امین ہوں جس وقت انہیں ضرورت ہو، ان کا مال انہیں لوٹا دیا جائے گا۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس عظیم الشان حقیقت کو کیسے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے! ارشاد ہے واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق۔ اللہ نے تمہیں معاشی اکتساب کی استعداد میں ایک دوسرے پر برتری عطا کی ہے۔ یہ تفاوتِ استعداد تمہارے کسب و ہنر کا نتیجہ نہیں۔ یہ تمہیں بلا محنت و مشقت اور بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے

فما الذین فضلوا برادی رزقہم علیٰ ما ملکت ایمانہم فہم فیہ سواء افبنعمۃ اللہ یجحدون (۱۶/۷۱)

سو جب یہ استعدادی فضیلت عطائے خداوندی ہے تو اس کا ماحصل بھی عطائے خداوندی سمجھنا چاہیئے لیکن

جنہیں یہ استعدادی فضیلت مل جاتی ہے، ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس استعداد کے ماحصل میں سے فاضلہ رزق کو اپنے زیر دستوں کی طرف لوٹاتے نہیں، بایں خوف کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں گے۔ جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ اللہ کی عطا فرمودہ نعمت سے عملاً انکار کرتے ہیں۔

سلیم! اس آیتِ جلیلہ میں علاوہ اور نکاتِ مہمہ کے، رَادّ کے لفظ پر غور کرو۔ اس کے معنی ہیں واپس کر دینا۔ یعنی جس کی چیز ہے اسے واپس دیدینا۔ غور کیجئے! معاشی توازن کے قیام کے لئے اس کی گہرائی تک پہنچنا قرآن کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے؟ یہ ہے وہ اصولی فلسفۂ زندگی جس پر قرآن اپنے معاشی نظام کی عمارت استوار کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، معاشی نظام، قرآن کے ہمہ گیر نظامِ حیات کی ایک شاخ ہے۔ اس سے الگ نظام نہیں۔ فلہٰذا جب تک قرآن کا نظامِ حیات نہ سمجھ لیا جائے اس کے معاشی نظام کی کنہ وماہیت اور اصل وغایت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اگر انسان یہ سمجھ لے (جیسا کہ مادی نظریۂ حیات نے اسے سمجھا رکھا ہے) کہ زندگی مادی اجزار کی ترتیب کا نام ہے اور جب ان اجزار میں انتشار واقع ہو جاتا ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے، تو اس کے سامنے زندگی کا سارا مسئلہ ہی معاشی رہ جاتا ہے۔ اس سے آگے اس کا تصور جا ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ سلیم! محض معاشی مسئلہ حیوانیت کی سطح (Animal Level) کا مسئلہ ہے۔ یعنی سلسلہ ارتقا میں جو کڑیاں پیچھے رہ گئی ہیں اور جنہیں جس سطح پر پیدا ہونا ہے اسی سطح پر مرجانا ہے، ان کا مسئلہ نسبت فقط معاشی ہے۔ مثلاً ایک گائے جس قدر کوئی استعداد لیکر پیدا ہوتی ہے مرتے وقت تک اس استعداد میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کی زندگی کا سوال فقط زندہ رہنا ہے جس کا حل معاش میں مل جاتا ہے۔ یعنی اگر اسے کھانے پینے کو ملتا جائے تو اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اس نے انسان کو سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی اور فلہٰذا اپنی ذات میں مکمل سمجھ لیا ہے۔ وہ اس کی مزید ارتقائی منازل کا قائل ہی نہیں۔ اس لئے اس کے نزدیک اس کی زندگی کا مسئلہ بھی محض معاشی ہے جس طرح اور حیوانات کا مسئلہ معاشی ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ اگر ایک فرد کی دنیاوی زندگی ہی کو دیکھے تو وہ جس ذہنی سطح پر بچپن

میں ہوتا ہے۔ عمر کے اگلے حصہ میں وہ سطح کہیں بلند ہو چکی ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ سلسلۂ ارتقاء اسی زندگی تک نہیں رہتا بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان اپنی ذات میں مکمل نہیں ہو چکا۔ اسے ابھی کچھ اور بننا ہے۔ وہ (Being) نہیں بلکہ ہنوز (Becoming) ہے۔ اس کا مسئلہ فقط معاشی مسئلہ نہیں۔ معاشی مسئلہ تو اس کی طبیعی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن معاشی مسئلہ کو بھی خاص اہمیت دیتا ہے، کیونکہ اگرچہ طبیعی زندگی مقصود بالذات نہیں لیکن ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تو ہے۔ اس لئے حصولِ مقصد کے لئے ذریعہ کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر ذریعہ ہی مقصد بن کر رہ جائے تو انسان حیوانیت کی سطح پر چلا جاتا ہے۔ قرآن کریم انسان کو مادیت کی اس حیوانی سطح سے بہت اوپر لیجانا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم اقطار السمٰوٰت والارض (زمین و آسمان یعنی مادی کائنات کی حدود) سے بھی اوپر جا سکتے ہو بشرطیکہ تمہیں سلطان (غلبہ و تسلط) حاصل ہو جائے ؟؟؟

مادیت پر یہ غلبہ، اپنے آپ کو مادہ کے محبسِ آب و گِل سے اوپر لیجانے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یعنی اپنی معاشی زندگی کو سماوی اقدار مستقلہ کے تابع رکھنے اور اس طرح اپنی اجتماعی زندگی کو کائناتی قانون سے ہم آہنگ کرنے سے۔ اس طرح انسان، اپنے رب ذی المعارج (نشو و نما کے ذریعے بلندیوں کی طرف لیجانے والے خدا) کے ہمرنگ ہو کر طبقاً عن طبقٍ (منزل بہ منزل) بلند ہوتا چلا جائے گا (لترکبن طبقاً عن طبق) کیونکہ اس کا منتہیٰ اس کے رب کی طرف ہے (الیٰ ربک منتھٰھا)

کیا سلیم! اب بھی بات سمجھ میں آئی یا نہیں؟ اچھا۔ خدا حافظ

والسلام

مارچ ؁۱۹۵۰

سلیم کے نام بارھواں خط

قرآنی نظامِ ربوبیت

غنیمت ہے سلیم! تمہاری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ قرآنی نظامِ ربوبیت، اشتراکی نظام سے بہتر ہی نہیں بلکہ انسان کو کہیں آگے لیجاتا ہے۔ لیکن اس کی دلیل صرف وہی نہیں جو تم نے لکھی ہے کہ

> اشتراکی نظام صرف روٹی کے مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے اور قرآنی نظام ربوبیت روٹی کے مسئلہ کے حل کے بعد ہر ابن آدم کی مضمر صلاحیتوں کے کامل طور پر نشو و نما پانے کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عملی نتیجہ کے لحاظ سے ان دونوں نظاموں میں یہ فرق بھی اہم ہے یعنی قرآنی نظام ربوبیت وہ سب کچھ بھی دیتا ہے جس کا دعویٰ اشتراکی نظام کرتا ہے اور اس کے بعد انسانی معاشرہ کو اس سے کہیں آگے لے جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں نظاموں میں ایک اور اہم فرق یہ ہے کہ اشتراکی نظام کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں اور قرآنی نظام ربوبیت ایسی محکم بنیادوں پر قائم ہے کہ لا انفصام لھا جو کبھی منہدم نہیں ہو سکتیں۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اُسے آج پھر دہراتا ہوں کہ مارکس یا مارکسٹ اس کا جواب دے ہی نہیں سکتا کہ غریبوں کی مدد کیوں کی جائے؟ کیوں تمام انسانوں میں مساوات پیدا کی جائے؟ وہ شخص جو

بہت زیادہ کماتا ہے اپنی محنت کا ماحصل اس شخص کو کیوں دیدے جو کمانے کے قابل نہیں؟ اس کا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا تھا کہ "کمزوروں کی مدد کرنا انسان کا اخلاقی فریضہ" ہے۔ لیکن جس نظریہ زندگی میں اخلاق، (Morals) کا تصور ہی نہ ہو اس میں ان امور کا جواب کیا مل سکتا ہے؟

میں اس سے پہلے ایک خط میں لکھ چکا ہوں کہ "کیوں" کا جواب صرف وہی شخص دے سکتا ہے جو قانون مکافاتِ عمل پر یقین رکھتا ہو اور یہ مانتا ہو کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اخلاقیات کی ساری عمارت ان ہی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور جو فلسفہ ان بنیادوں ہی سے انکار کر دے اس میں اس سوال کا جواب کیسے مل سکتا ہے؟

یہ اس سوال کا ایک پہلو تھا۔ اب دوسرا پہلو دیکھو۔

پہلے یہ سمجھ لو سلیم! کہ اخلاق کہتے کسے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ "سچ بولنا ہر حال اچھا ہے"۔ یعنی حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں، سچ بولنا بہرحیث وبہرکیف اچھا ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ سچ کی قیمت حالات کے اعتبار سے اضافی (Relative) نہیں۔ بلکہ اس کی قیمت اس کی ذات کے اندر (Intrinsic) ہے جو ہر حالت میں قائم رہتی ہے۔ اسے مستقل قدر (Permanent Value) کہتے ہیں اس تصور کا نام اخلاقیات ہے۔ اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ سچ اور جھوٹ اپنی ذاتی قیمت کچھ نہیں رکھتے۔ ہر شے حالات کے تحت بدلتی رہتی ہے۔ اگر حالات ایسے ہیں کہ ان میں سچ بولنا فائدہ مند ہے تو سچ بولنا چاہیئے۔ اگر حالات بدل جائیں اور سچ بولنے میں نقصان ہو تو جھوٹ بولنا چاہیئے۔ یہ دوسرا تصورِ حیات ہے جس میں کوئی شے مستقل قدر نہیں رکھتی۔

مارکس (Marx) کے نزدیک دنیا میں کوئی نظریہ کوئی تصورِ حیات، مستقل قدر نہیں رکھتا وہ بھی افلاطون اور ہیگل کے تتبع میں یہی مانتا ہے کہ کائنات کی ہر شے تغیر پذیر ہے لیکن یہ تغیر ایک خاص تسلسل کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک نظام قائم ہوتا ہے اُس کے بعد زمانے کی رو اس نظام کو الٹ کر

اس کی جگہ ایک دوسرا نظام مسلط کر دیتی ہے جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اس کی اصطلاح میں زمانے کی اس رو کا نام تاریخی وجوب (Historical Necessity) یعنی تاریخ کی اندھی قوت جو ہمیشہ اس نظام کو الٹ دیتی ہے جو موجود (Present) ہو اور اس کی جگہ اس کی ضد دوسرا نظام لے آتی ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت، مارکس نے کہا کہ یورپ کا موجودہ سرمایہ دارانہ نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ تاریخی وجوب اس نظام کو الٹ کر اس کی جگہ ایک ایسا نظام مسلط کرے گی جو اس کی ضد ہوگا۔ یعنی محنت کشوں کا اشتراکی نظام۔ اس میں نہ کسی جذبے کا دخل ہے نہ عقیدے کا۔ نہ ہی اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت ہے نہ وجہ جواز تلاش کرنے کی حاجت۔ تاریخی وجوب کا تقاضا ہے کہ ایسا ہو کر رہے۔ انسان کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مارکس کے نظریہ کے ماتحت یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اچھا ہے یا برا۔ اسے علیٰ حالہٖ رکھنا چاہیئے یا بدلنا چاہیئے۔ نہ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام کے برعکس محنت کشوں (مزدوروں اور کسانوں) کے اشتراکی نظام میں کیا خوبیاں ہیں۔ وہ نوع انسانی کے لئے اچھا ہے یا برا۔ اس کے نظریے کے ماتحت ہر موجودہ نظام الٹ کر رہے گا۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ اور اس کی جگہ دوسرا نظام آئے گا۔ (جو پہلے نظام کی ضد ہوگا) خواہ وہ نظام نوع انسانی کے لئے اچھا ہو یا برا۔ اس کے بعد یہ آنے والا نظام بھی ایک دن اسی طرح الٹ جائے گا، جس طرح موجودہ نظام الٹ رہا ہے، خواہ وہ نظام نوع انسانی کے لئے کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو۔ تاریخی وجوب کے نزدیک "اچھا اور برا" سب یکساں ہے۔ پھر جس طرح آج انسانوں کی کوئی قوت اس پر قادر نہیں کہ آنے والے انقلاب کو روک کر موجودہ نظام کو برقرار رکھ سکے، اسی طرح جب (اپنے وقت میں) اشتراکی نظام کے الٹنے کا وقت آئے گا تو انسان کی کوئی قوت اس انقلاب کو بھی نہیں روک سکے گی۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق زمانے کی رو کے مقابلے میں انسان بے بس و مجبور ہے۔ اس نظریہ کو "تاریخی جبر" (Historical Determinism) کہتے ہیں۔

تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ مارکس کے نظریہ کے مطابق، کسی نظام کے اچھے یا بُرے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی اخلاقی قدر کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کائنات کے اسٹیج پر تاریخی وجوب ایک ڈرامہ کھیل رہی ہے جسے انسان، ایک مجبور تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہا ہے۔ اس ڈرامے کا موجودہ سین یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کی بساط اُلٹ کر (اس کی ضد) اشتراکی نظام کو مسلط کر دیا جائے۔ "مجبور تماشائی" اس سین کو بھی چپ چاپ بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اس کے بعد دوسرا سین آئے گا۔ جس میں تاریخی وجوب کا عفریت اشتراکی نظام کو اُلٹ کر، اس کی جگہ (اس کا ضد) سرمایہ دارانہ نظام، پھر سے لے آئے گا۔ "مجبور تماشائی" اس سین کو دیکھنے پر بھی مجبور ہوگا۔ اس لئے مارکس کے نظریئے کے مطابق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام سے بہتر ہے یا نہیں۔ جب صورت حال یہ ہے تو پھر اشتراکی نظام کے حق میں اخلاقی جواز تلاش کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے عصر حاضر کا مشہور اشتراکی (L. Laurat) اپنی کتاب (Marxism And Democrary) میں ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

> مارکس اور انجلز نے اشتراکی آرزوؤں کی بنیاد، تمدنی ترقی کے معاشی قانون پر رکھی۔ ایسا کرنے میں انہوں نے اپنی اشتراکی آرزوؤں کا جواز اخلاقی بنیادوں پر نہیں رکھا۔ بلکہ یہ کیا کہ اشتراکیت، تاریخی وجوب کا تقاضا ہے۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی کہ مارکس یا مارکسسٹ کیوں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام کیوں قائم کرنا چاہیئے؟ "کیوں" کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں انسان صاحب اختیار و ارادہ ہو۔ لیکن جس فلسفہ کی رو سے انسان مجبور محض ہو اور کوئی خارجی قوت (اسے تاریخی وجوب کہہ لیجئے یا کچھ اور) از خود ایک نظام کو مٹا دے۔ اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے آئے۔ اس میں "کیوں" کی گنجائش کہاں ہے؟

مسٹر (Laurat) کا جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے اس سے ایک تو یہ امر واضح ہو گیا کہ مارکس اور اینجلز نے اپنے معاشی نظریہ کی بنیاد اخلاقیات پر نہیں رکھی بلکہ اسے "تاریخی وجوب" کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے لیکن یہ اقتباس اس سے الگ ایک اور اہم حقیقت کی بھی غمازی کر رہا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے (اور یاد رکھو کہ کہنے والا ایک ممتاز اشتراکی ہے) کہ مارکس اور انجلز کے دل میں اشتراکی نظام کی آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ اشتراکی نظام قائم ہو جائے۔ لیکن انہیں اس نظام کے جواز (Justification) کے لئے اخلاقی بنیادیں نہیں ملتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اس کی بنیاد "تاریخی وجوب" کے نظریہ پر رکھ دی۔

میرا ابھی یہی خیال ہے سلیم! کہ مارکس اپنے سینہ میں ایک دردمند دل رکھتا تھا، جو غریبوں کی مصیبت پر کڑھتا اور کمزوروں کی حالت دیکھ کر دُکھتا تھا۔ اس کے زمانہ میں یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام نے مزدوروں اور غریبوں کی جو حالت کر رکھی تھی اس کے پیش نظر اس قسم کے دلِ دردمند میں جوشِ انتقام کا موجزن ہو جانا مستبعد نہیں تھا (Defoe) نے ۱۷۰۴ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر غریبوں کی مدد کی گئی تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے اور اگر انہیں سرکاری اداروں میں کام پر لگایا گیا تو اس کا اثر پرائیویٹ کارخانہ داروں پر پڑے گا۔ اس لئے انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں۱؎۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (Mandevillee) نے اپنی مشہور کتاب (Fable Of The Bees) شائع کی تھی جس کا ملخص یہ تھا کہ

> غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انہیں محتاج رکھا جائے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز

۱؎ دیکھو (E.H.Carr) کی کتاب (The New Society)

> کردینا حماقت ہے۔ سوسائٹی کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تباہ حال اور غریب رہے۔

اٹھارویں صدی کے اخیر میں، برطانیہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دیہاتی آبادی کو کس طرح مجبور کیا جائے کہ وہ شہروں میں آکر کارخانوں میں مزدوری کریں۔ اس باب میں (William Townsend) نے (۱۷۸۶ء میں) اپنی کتاب (Dissertation On The Poor Laws) میں لکھا کہ

> بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند سے تند جانور کو بھی رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش سے سرکش انسان مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ یعنی بھوک۔ بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

یہ تھی وہ فضا جس میں مارکس نے آنکھ کھولی۔ ایسے حالات میں غریبوں اور مزدوروں کی امداد کے لئے عام طور پر لوگوں کے اخلاقی جذبات ہی کو اپیل کیا جاتا ہے۔ لیکن جب مارکس نے صورت حال کا گہری نظر سے جائزہ لیا تو اس نے دیکھا کہ غریبوں اور کمزوروں کی اس حالت کا ذمہ دار ہی وہ ضابطۂ اخلاق ہے جو یورپ میں رائج تھا۔ اس ضابطۂ اخلاق کی عمارت عیسائیت کی ان بنیادوں پر استوار تھی جن کی رو سے دنیا کی بادشاہت امیروں کے لئے تھی اور غریبوں کے حصے میں "آسمان کی بادشاہت" آتی تھی۔ اس ضابطۂ اخلاق میں غریبوں کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ اگر کوئی زبردست ہاتھ ان کا کوٹ اتار لے، تو انہیں چاہیئے کہ اپنی واسکٹ خود اتار کر اسے دیدیں۔ اُن سے کہا جاتا تھا کہ اگرچہ اُن کا آقا زیادہ مال باندھ لے جو اُس سے اُٹھ نہ سکے تو چاہیئے کہ وہ خود گٹھڑی اٹھا کر اُس کے گھر چھوڑ آئیں۔ لہٰذا اس ضابطۂ اخلاق کی رُو سے امیروں اور بالادستوں سے کس طرح کہا جاتا کہ وہ غریبوں کو موقع دیں کہ وہ اُبھر کر امیروں کی سطح پر آجائیں! حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ BRIFFAULT نے لکھا ہے، گذشتہ دو ہزار سال میں غریبوں اور مظلوموں پر جس قدر

انسانیت سوز مظالم ہوئے ہیں، ان کی ذمہ دار عیسائیت کی تعلیم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نیٹشے کو اس عیسائیت کے "خون سے اپنے ہاتھ رنگنے پڑے اور اسے اصلی معنوں میں صلیب دینا پڑا"۔ یہی وہ تعلیم تھی جس نے یورپ میں مذہب کے خلاف جذبات منافرت و انتقام کو مشتعل کر دیا۔ اور پھر اس آگ کے شعلے ساری دنیا میں پھیل گئے۔ اگر مارکس ایسے مذہب کو "غریبوں کے لئے افیون" نہ کہتا تو کیا کرتا؟ (اور ایک عیسائیت ہی پر کیا موقوف ہے سلیم! ساری دنیا کے مذاہب (جو اپنی موجودہ شکل میں) انسانی ذہن کے وضع کردہ ہیں لیکن ان کی نسبت آسمانی کتابوں اور خدا کے فرستادوں کی طرف کر دی گئی ہے اسی ذہنیت کے علمبردار ہیں۔ اسی زمرے میں مسلمانوں کا موجودہ مذہب بھی شامل ہے جو ان کے دور ملوکیت کا پیدا کردہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کا حامل ہے۔ وہ دین نہیں جو قرآن میں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مروجہ مذہب!)

یہ تھے وہ حالات جن کے ماتحت، مارکس کے لئے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی "اشتراکی آرزوؤں" کو اخلاقی بنیادوں پر مشہود کرتا۔ اس مشکل کے پیش نظر اسے اخلاقیات کو چھوڑ کر، دوسرے سہارے تلاش کرنے پڑے۔ چونکہ اس کی ذہنی افتاد فلسفیانہ اور مورخانہ واقع ہوئی تھی اس لئے اس نے اس کے لئے فلسفہ اور تاریخ کو سہارا بنایا اور تاریخ کا ایک نیا فلسفہ وضع کیا اور اس کا نام "تاریخی وجوب" رکھا لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) یہ سہارا بڑا کمزور ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ یہ سہارا سہارا ہی نہیں۔

اشتراکیت کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ عائد کیا جاتا ہے کہ جب تمام افراد کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری معاشرہ اپنے سر پر لے لے۔ اور اس طرح افراد معاشرہ اپنی ضروریات کی طرف سے مطمئن ہو جائیں تو وہ کونسا جذبۂ محرکہ (Incentive) ہوگا جس کی رو سے یہ افراد کام کرنے پر آمادہ کئے جا سکیں گے۔ نہ صرف کام کرنے پر بلکہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور معاشرہ کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق کام کرنے پر آمادہ اور اس کے بعد اپنی محنت کے ماحصل کو دوسروں کی بہبود میں صرف کرنے کے لئے تیار (اور بطیب خاطر تیار) کئے جا سکیں۔ یہ ہے وہ بنیادی سوال جس کا جواب مارکس یا مارکسزم کے پاس کچھ نہیں۔ نہ ہی

ہوسکتا ہے اور یہی ہے وہ بنیادی فرق جو قرآنی نظامِ ربوبیت کو اشتراکی نظام سے بہت بلند لے جاتا ہے اس لئے کہ (Prof. Hawtrey) کے الفاظ میں

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ (Quoted by Carr)

* * *

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ مارکس کے نظریہ "تاریخی وجوب" کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ کائنات میں کوئی تصور، کوئی نظریہ، کوئی نظام باقی نہیں رہ سکتا۔ ہر نظریہ تغیر پذیر اور ہر نظام فنا آمادہ ہے اور یہ سلسلۂ تغیرات مسلسل چلا جا رہا ہے، اس کے برعکس، قرآن یہ تصور پیش کرتا ہے کہ بعض نظریاتِ زندگی ایسے ہیں جن میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اور بعض ایسے جو اپنی ذات میں باقی رہنے کی استعداد اور جوہر رکھتے ہیں (یمحوا اللہ مایشاء ویثبت) اور یہ تغیر و ثبات (فنا اور بقا) ایک خاص قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کی اصل و بنیاد اس تغیر پذیر مادی کائنات سے ماوراء ہے (وعندہٗ ام الکتاب (۱۳/۳۹) اس قانونِ محو و ثبات"، (فنا و بقا کی تفصیل تو طول وطویل ہے۔ لیکن قرآن نے ان تمام تفاصیل کو ایک بنیادی نقطہ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو

واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقا اس تصور یا نظام کے لئے ہے جو نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہو۔

یہ ہے وہ بنیادی قانون، جس کے مطابق، نظریاتِ زندگی اور نظامہائے حیات کی فنا اور بقا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ باقی وہ رہتا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے منفعت بخش ہو۔ جو ایسا نہ ہو مٹ جاتا ہے۔ "ما ینفع الناس" کے الفاظ پر غور کرو سلیم! بس اسی میں سارے مسئلہ کا حل پوشیدہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں ہر شخص اپنے نفع کے لئے کام کرتا ہے۔ یہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جو اُسے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

کوئی شخص ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس میں اسے اپنا فائدہ دکھائی نہ دے

ہر شخص کا اپنا فائدہ ــــــــــ یہ ہے عام اصول

لیکن قرآن نے کہا ہے کہ بقا اس نظریہ یا نظام کے لئے ہے جس میں "نوع انسانی کا فائدہ" ہو۔ اس لئے قرآنی قانون کی رو سے

(۱) وہ نظام جس میں ہر شخص کے پیش نظر اپنا ذاتی فائدہ ہو، باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس

(۲) وہ نظام جس میں ہر شخص کے پیش نظر "نوع انسانی کا فائدہ" ما ینفع الناس ہو، باقی رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ دوسری قسم کے نظام میں بھی "ہر فرد کا ذاتی فائدہ" موجود ہوتا ہے۔ لیکن یہ فائدہ فوراً براہ راست (Immediately) سامنے نہیں آتا بلکہ بالواسطہ (Indirectly) ذرا آگے چل کر (In the long run) سامنے آتا ہے۔ اس کے برعکس پہلی قسم کے نظام میں ہر شخص اپنا ذاتی فائدہ فوراً سامنے دیکھ لیتا ہے۔ اسے مفاد عاجلہ (فوراً سامنے آجانے والا نفع) کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ نفع پیش پا افتادہ (قریب تر) ہوتا ہے، اس لئے اس کے لئے قرآن نے متاع الدنیا (قریبی منافع) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس کے برعکس جو فائدہ پوری نوع انسانی کے اندر گردش کرتا ہوا افراد تک پہنچتا ہے اسے مآل کار، آخر الامر یا مستقبل کا فائدہ کہا گیا ہے جس کے لئے قرآن میں آخرۃ (مستقبل) کی اصطلاح آئی ہے۔ بالفاظ دیگر، ذاتی منفعت، سود، خو بیق یا انفرادی زندگی کو "حیٰوۃ الدنیا" اور کلی منفعت، سود ہمہ یا نوع انسانی کی اجتماعی زندگی کے لئے (جس میں موت کے بعد زندگی کا تصور بھی شامل ہے) حیٰوۃ الآخرۃ کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔

قرآن کے نزدیک ذاتی منفعت کی انفرادی زندگی کا نظریہ غلط ہے اور کلی مفاد کی اجتماعی زندگی کا نظریہ صحیح اس حقیقت کو قرآن ایک "اندھے عقیدے" کے طور پر نہیں منواتا وہ کسی دعوے

کو بھی اندھے عقیدے کے طور پر پیش نہیں کرتا۔ ہر دعوے کے لئے دلیل لاتا ہے) وہ کہتا ہے کہ اگر تمہاری زندگی حیوانی سطح (Animal Level) پر ہوتی تو پھر یہ تصور درست تھا کہ ہر فرد اپنا اپنا منافع دیکھتا۔ کسی کو کسی دوسرے سے کچھ واسطہ نہ ہوتا جس طرح ایک حیوان کو کسی دوسرے حیوان سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ان الذین کفروا یتمتعون و یاکلون کما تاکل الانعام، لیکن زندگی کی انسانی سطح (Human Level) میں زندگی کے تقاضے حیوانی سطح سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس میں زندگی صرف طبیعی زندگی (Physical Life) نہیں ہوتی بلکہ اس سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ طبیعی زندگی کا تعلق انسانی جسم سے ہے جو قوانین طبیعی (Physical Laws) کے مطابق ہر آن تغیر پذیر ہوتا رہتا ہے۔ برعکس اس کے انسان میں "کچھ اور" بھی ہے جو ان تمام تغیرات میں غیر متغیر رہتا ہے اس کا نام انسانی ذات Personality یا خودی (Self) یا آنا (I-am-ness) یا ایگو (Ego) ہے۔ قرآن میں اس کے لئے "روح خداوندی" کی اصطلاح آئی ہے۔ یعنی انائے مطلق (Absolute Ego) کی قوت۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے لئے جسمانی پرورش کے ساتھ ساتھ، اس ذات یا آنا کی تربیت (Development) نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ زندگی طبعی زندگی کا نام نہیں۔ طبعی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی کا سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ انسانی جسم کی پرورش تو مفاد عاجلہ (متاع الدنیا) کی انفرادی زندگی سے ہو جاتی ہے لیکن انسانی ذات کی نشوونما کا رشتہ نوع انسانی کی نشوونما کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے اس کے لئے پوری نوع انسانی کے مفاد کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جسمانی پرورش (حیوانی سطح زندگی) "لینے" سے ہوتی ہے (کوئی حیوان کسی دوسرے حیوان کو کچھ نہیں دیتا) اس کے برعکس انسانی زندگی کی پرورش "دینے" To Give سے ہوتی ہے۔ جس خلاق فطرت نے جسمانی زندگی کے لئے وہ قاعدہ مقرر کیا ہے اسی نے انسانی زندگی کے لئے یہ آئین مقرر کر رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں زندگیاں بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے متمیز ہیں۔ اور ان کے نتائج بالکل واضح۔ دیکھو، سورۂ واللیل میں اس حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

جب فرمایا کہ ان سعیکم لشتّٰی۔ تمہاری کوششیں مختلف سمتوں میں جاتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو یاد رکھو کہ فاما من اعطٰی واتقٰی۔ جس نے "دینا" سیکھا اور اس طرح اپنی زندگی کو قانون خداوندی سے ہم آہنگ کر لیا وصدّق بالحسنٰی اور معاشرے میں توازن پیدا کر کے اس حقیقت کو سچ کر دکھایا فسنیسرہٗ للیسرٰی تو اس کے لئے نشو و نما کی راہیں آسان ہو گئیں۔ اس کے برعکس واما من بخل جس نے صرف "لینا" سیکھا اور سب کچھ خود اپنے ذاتی مفاد کے لئے سمیٹ لیا۔ واستغنٰی اور سمجھ لیا کہ یہی کچھ میری پرورش کے لئے کافی ہے۔ مجھے اس کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ معاشرہ کی نہ دیگر افراد انسانیہ کی۔ وکذب بالحسنٰی اور اس طرح معاشرے کے توازن کو بگاڑ دیا۔ فسنیسرہٗ للعسرٰی۔ سو اس کے لئے نشو و نما کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ لیکن یہ اس کی بھول ہے اس نے سمجھا ہی نہیں کہ انسانی زندگی کیا ہے اور اس کی نشو و نما کے لئے کیا قانون مقرر ہے۔ اس کے سامنے یہ حقیقت اس وقت نمایاں ہو گی جب اس کی یہ روش معاشرہ میں انقلاب پیدا کر دے گی۔ اور اس وقت وہ دیکھے گا کہ اس کا جمع کردہ مال اس کے کسی کام نہیں آیا۔ وما یغنی عنہ مالہٗ اذا تردّٰی۔ اس نے یہ روش اس لئے اختیار کی تھی کہ اس نے سمجھا تھا کہ وہ زندگی کی نشو و نما کے لئے خود ہی قاعدے مقرر کر سکتا ہے لیکن اس نے اس حقیقت کو بھلا دیا کہ انسانی زندگی کی نشو و نما کے لئے خود ہی قاعدے مقرر نہیں کئے جا سکتے۔ ان قواعد و قوانین کا سرچشمہ وہی ہے جو خود زندگی کا سرچشمہ ہے۔ ان علینا للھدٰی اس لئے کہ عقل انسانی کے پیش نظر فقط فرد متعلقہ کے مفاد (یعنی مفاد عاجلہ) کی نگہداشت ہوتی ہے اور قانون خداوندی کے سامنے مفاد عاجلہ اور مستقبل کے مفاد دونوں ہوتے ہیں وان للاٰخرۃ والاولٰی۔ خدا کا قانون، انسان کو اس انداز زندگی کی ہلاکت سامانیوں سے متنبہ کرتا ہے جو انسانی زندگی کی برومندیوں کو جھلسا دیتی ہے فانذرتکم نارًا تلظّٰی اس تباہی اور ہلاکت کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو انفرادی زندگی (الگ رہنے اور ذاتی مفاد پیش نظر رکھنے کی زندگی) کو نصب العین حیات بنا لیتے (لا یصلٰھا الا الاشقی) یعنی وہ لوگ جو معاشرہ کے توازن کو بگاڑ کر اپنے دعوے انسانیت کی

عملی تکذیب کرتے ہیں اور اس طرح صحیح راہِ حیات سے گریز کی راہیں تلاش کرتے ہیں الذی کذب وتولّٰی۔ اس ہلاکت سے وہ لوگ بچ سکتے ہیں جو اپنی زندگی کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھتے ہیں وسیجنبہا الاتقی یعنی وہ لوگ جو "دینا" سیکھتے ہیں اور اس طرح اپنی اور تمام نوع انسانی کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں الذی یؤتی مالہٗ ویتزکّٰی

ان آیاتِ کُبریٰ سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی سلیم! کہ قرآن کی رو سے، انسانی زندگی کی نشو و نما کا راز "دینے" میں ہے (Einstein) کے الفاظ میں

> انسان کی قدر و قیمت کا معیار یہ ہے کہ وہ کس قدر "دیتا" ہے۔ نہ یہ کہ اس میں "لینے" کی استعداد کس قدر ہے۔

(Out Of My Later Days)

"دنیا" اور "آخرت" کا یہ مفہوم اس سے پہلے بھی تمہارے سامنے آچکا ہے۔ میں نے اسے دہرایا اس لئے ہے کہ یہ حقیقت بڑی لطیف لیکن اس کے ساتھ ہی بڑی اہم ہے۔ اور جب تک اسے اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لیا جائے قرآن کے متعلقہ مباحث سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس مفہوم کو سامنے رکھو اور پھر سورۂ حدید کی ان آیات کو دیکھو جن کے سمجھنے میں تمہیں دشواری پیش آرہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اعلموا انما الحیوٰۃ الدنیا لعب ولھو یہ نظریۂ حیات کہ زندگی فقط مفادِ عاجلہ حاصل کرنے کا نام ہے، کیا ہے؟ یہ لعب ہے۔ لعب کے عام معنی تو کھیل تماشے کے ہیں۔ لیکن اس کا اطلاق ایسی کوشش پر ہوتا ہے جس میں حرکت (Movement) تو ہو لیکن وہ حرکت انسان کو منزلِ مقصود تک نہ پہنچائے۔ اسی لئے کہتے ہیں لعب بنا الموج دریا کی لہریں ہم سے کھیلتی رہیں یعنی انہوں نے ہماری کشتی کو حرکت میں تو رکھا لیکن ساحلِ مقصود کی طرف بڑھنے نہ دیا۔ اور لھو کہتے ہیں ہر اس جاذبیت کو جو انسان کو اپنی طرف متوجہ کرلے اور اس طرح اسے اس کام سے

غافل کردے جو اس کے پیش نظر تھا (جس طرح تمہارے چھوٹے نوکر عبدو کی حالت ہے۔ اسے دہی لینے کے لئے بھیجو تو راستے میں بندریا کا تماشا دیکھنے میں ایسا محو ہوتا ہے کہ دہی لانا تو ایک طرف کٹورہ بھی گم کر دیتا ہے) لہٰذا صرف ذاتی مفاد کا نظریۂ زندگی ایسا ہے جس میں حرکت اور کوشش تو ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اسے منزلِ مقصود کی طرف نہیں جانے دیتی۔ کیونکہ منزلِ مقصود تھی انسانی زندگی کی نشو و نما اور یہ صرف جسمانی پرورش میں الجھ کر رہ گیا۔ مفادِ عاجلہ (یعنی منفعت خویش کا نظریہ) اپنے اندر ایسی کشش و جذب (لھو و زینۃ) رکھتا ہے کہ انسان کی نگاہوں سے اس کی زندگی کا نصب العین اوجھل ہو جاتا ہے۔ (لعب و لھو) اس منفعت خویش کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ وتفاخر بینکم۔ باہمی تفاخر۔ فخر، گلئے یا بکری کے ایسے باکھ (Udder) کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں بڑا نظر آئے لیکن اس میں دودھ بہت کم ہو۔ لہٰذا محض جسمانی زندگی میں باہمی تفاخر کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی حیاتِ خارجی (جسمانی پرورش کے ساز و سامان) تو بہت بڑے دکھائی دیں لیکن حیاتِ داخلی (جوہر انسانیت) بہت کم ہو۔ وتکاثر فی الاموال والاولاد اس زندگی کا مقصد فقط اس قدر رہتا ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ دولت اور قوت میں دوسروں سے بڑھ جائے۔

یہ ہے مفادِ عاجلہ کی زندگی کی حقیقت۔ اس کی مثال اس بارش کی سی ہے کمثل غیث جو اس قسم کی سبزی پیدا کرے جو ایک ہی چھینٹے سے اُگ آتی ہے۔ اس قسم کی سبزی کی جڑیں، اوپر ہی اوپر ہوتی ہیں، نیچے نہیں جاتیں۔ اس سے کسان خوش تو ہو جاتا ہے اعجب الکفار نباتہٗ لیکن ذرا دھوپ پڑی اور وہ خشک ہوئی اور زرد پڑ گئی اور دو ہی دن میں چور چور ہو کر بکھر گئی ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما اس قسم کی کھیتی کی زندگی دو چار دن کی ہوتی ہے اور اس لئے اس کی خوشی بھی ایسی ہی ناپائیدار۔ آخر کار اس کا نتیجہ افسردگی اور پژمردگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا وفی الاخرۃ عذاب شدید اس مایوسی اور افسردگی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی کوششوں کو قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ کرے

اور اس طرح اس نظام کی محافظت میں آجائے جو اس قانون کی رو سے متشکل ہوتا ہے ومغفرة من الله ورضوان

مذکورہ بالا امثال سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ مفاد عاجلہ کی زندگی متاعِ فریب کے سوا کچھ نہیں وما الحیٰوة الدنیا الا متاع الغرور (غرور اس باکھ کو کہتے ہیں جو دکھائی تو بڑا دے لیکن دودھ سے خالی ہو)

اس کے بعد ارشاد ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ باہمی منافست کا جذبہ انسان کے اندر موجود ہے۔ ہم اس جذبہ کو کچلنا نہیں چاہتے البتہ اس کے لئے میدان دوسرا تجویز کرتے ہیں۔ تم مسابقت کرنا چاہتے ہو تو مسابقت کرو۔ اس نظام کے قیام میں جو خدا کے قانون ربوبیت کی رو سے عمل میں آتا ہے اور جس میں انسانی زندگی ان تمام ہلاکتوں اور تباہیوں سے محفوظ رہتی ہے جو مفاد عاجلہ کی ذہنیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ (سابقوا الی مغفرة من ربکم) اس نظام کا نتیجہ خوشگواریوں کی ایسی جنت ہوتا ہے جو زمان و مکان کی حدود سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے۔ اور ساری کائنات کو محیط ہوتی ہے وجنة عرضها کعرض السماء والارض اور یہ نتیجہ ہوتا ہے اس نصب العین حیات کا جسے انسان وحی خداوندی کے مطابق متعین کرتا ہے اعدت للذین امنوا باللہ ورسلہ اس قسم کی خوشگواریاں اور کامرانیاں کسی خاص گروہ یا افراد تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ ہر اس جماعت کے حصہ میں آسکتی ہیں جو انہیں حاصل کرنا چاہے۔ یعنی اپنے اندر ان کے حصول کی صلاحیت پیدا کرلے۔ ذالک فضل اللہ یوتیه من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم

اوپر کہا گیا ہے کہ یہ معاشی خوش حالیاں اسے مل سکتی ہیں جس میں اُن کے حاصل کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص میں کسی داخلی یا خارجی حادثہ کی وجہ سے اس استعداد میں کمی واقع ہو جائے یا وہ بالکل ہی سلب ہو جائے (مثلاً بعض پیدائشی کمزوریاں یا بعض بیماریوں کے عواقب یا باہر کی دنیا کے حادثات)، تو کیا ایسی صورت میں وہ شخص ان خوشحالیوں سے محروم رہ جائے گا؟ بالکل نہیں۔ خدا کے قانون ربوبیت میں اس قسم کے حوادث کے لئے پہلے ہی سے (Provision) کر دی گئی ہے۔ اس لئے کہ ایسے معاشرہ میں جس میں ہر فرد کا نصب العین حیات دوسروں کی ربوبیت (نشوونما)

ہو اس قسم کی (Provision) از خود موجود ہوتی ہے ما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبرأھا۔ ان ذٰلک علی اللہ یسیر)

اس معاشرہ میں اس قسم کے حوادث، انسان کو سامانِ نشو و نما سے محروم نہیں رکھتے اس لئے کہ اس میں جن افراد کو زیادہ استعداد میسر ہوتی ہے وہ اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اس کے ماحصل کو اپنے ہی تک محدود نہیں رکھتے لکیلا تأسوا علیٰ ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتاکم اس قسم کی دشواریاں تو اس معاشرہ میں پیش آتی ہیں جہاں ہر شخص دوسرے کی گھات میں اس طرح رہتا ہے جس طرح شکاری چپکے چپکے دبے پاؤں شکار کی طرف جاتا ہے اور اسے پکڑ کر بہت خوش ہوتا ہے واللہ لا یحب کل مختال فخور اس قسم کے شکاری معاشرہ میں ارباب حل و عقد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر کرتے رہتے ہیں اور اس خیال سے کہ لوگ ان کی اس روش پر گرفت نہ کر سکیں ایسے قوانین وضع کر دیتے ہیں جن سے اس قسم کی مفاد پرستیاں "قانوناً" جائز قرار پا جائیں الذین یبخلون ویأمرون الناس بالبخل یہ لوگ قانون ربوبیت سے علانیہ سرکشی کی جرأت تو نہیں کر پاتے البتہ اس قسم کی قانون سازیوں سے اپنے لئے گریز کی راہیں نکالتے رہتے ہیں۔ ان گریز کی راہیں نکالنے والوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس سے خدا کا قانون ذرا بھی اثر پذیر نہیں ہوتا۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز ہے اور یہی اس کے قابل ستائش ہونے کی دلیل ہے۔ ومن یتول فان اللہ ھو الغنی الحمید

اس قسم کے معاشرہ کے قیام کے لئے انتظام یہ کیا گیا تھا کہ خدا کے فرستادہ اس نظام کے اصول و ضوابط لے کر آئیں جن کے ذریعہ انسانی معاشرہ میں توازن قائم رہے۔ لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت و انزلنا معھم الکتاب والمیزان لیکون الناس بالقسط

لیکن اللہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ انفرادی مفاد کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہنے والے گروہ محض وعظ و نصیحت سے ایسا معاشرہ قائم نہیں ہونے دیں گے اس لئے اس نے نوع انسانی کی نفع بخشی کے لئے

ضوابطِ قانون کے ساتھ شمشیرِ خارا شگاف بھی نازل کی (وانزلنا الحدید فیہ باس شدید و منافع للناس)

لیکن اس نظام کے قیام کے لئے سب سے مقدم ضرورت اس جماعت کی ہے جو مفادِ عاجلہ کی جاذبیتوں سے صرفِ نظر کر کے اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان رکھے اور اسے اس کا یقین محکم ہو کہ یہ نظام اپنے اندر اتنی قوت رکھتا ہے جس سے یہ مخالفتوں کی تمام قوتوں پر غالب آ کر رہے گا۔ (ولیعلم اللہ من ینصرہٗ و رسلہ بالغیب ان اللہ قوی عزیز (۵۷/۲۵)

تم نے دیکھا سلیم! کہ یہ دونوں معاشرے کس طرح نکھر کر الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ ایک معاشرہ وہ جو اس نظریہ پر قائم کیا گیا ہو کہ اس کا وجود نوعِ انسانی کی منفعت (ربوبیتِ عامہ) کے لئے ہے اور دوسرا معاشرہ وہ جو "بخل" کے تصور پر قائم ہوتا ہے۔ بخل کے معنی یہ ہیں کہ کوئی فرد یا گروہ یا قوم سب کچھ اپنے مفاد کے لئے سمیٹ لے اور دوسروں کی منفعت کے لئے عام نہ ہونے دے۔ اسے (Arrested Interests) کا معاشرہ کہئے۔ اس سے بخل کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے مختلف مقامات پر واضح الفاظ میں بتا دیا کہ جو نظام اس نظریہ پر قائم ہو گا وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ اس کی جگہ ایسا نظام لے لیگا جو اس کے مخالف نظریہ پر قائم ہو گا۔ یعنی نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے۔ اس کے لئے بخل کے مقابلہ میں انفاق کی اصطلاح آتی ہے جسے (Open Interests) کا معاشرہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سے انفاق کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ میانی جس کے دونوں سرے کھلے ہوں۔ سورۂ محمد میں ہے کہ تمہارا نصب العین حیات یہ ہونا چاہیئے کہ تم اپنی محنتوں کا ماحصل نوعِ انسانی کی منفعت کے لئے صرف کرو (ھا انتم ھٰؤلاء تدعون لتنفقوا فی سبیل اللہ) لیکن تمہاری یہ کیفیت ہے کہ تم اس کے برعکس سب کچھ اپنی ذات کے لئے سمیٹنے لگ جاتے ہو (فمنکم من یبخل) تم بزعمِ خویش یہ سمجھتے ہو کہ تم اس طرح دوسرے انسانوں کو سامانِ نشو و نما سے محروم کر دو گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تم اس سے خود ہی محروم رہ جاؤ گے (ومن یبخل فانما یبخل عن نفسہ) جو معاشرہ قانونِ خداوندی کے مطابق قائم ہوتا ہے وہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تم سے کچھ

نہیں مانگتا۔ البتہ تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے محتاج ہوتے ہو۔ واللہ الغنی وانتم الفقراء اب یہ دونوں راہیں تمہارے سامنے ہیں اگر تم بخل والا معاشرہ قائم کروگے تو اسے بقا نصیب نہیں ہوسکتی۔ اس لئے تم اجتماعی حیثیت سے مٹ جاؤگے تمہاری جگہ ایک ایسی قوم آجائے گی جو تمہارے جیسی ذہنیت نہیں رکھے گی اور اس کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوجائیگا جو نوع انسانی کی ربوبیت کا ذمہ دار ہوگا۔ وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (۴۷/۳۸) یعنی خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ بقاء اسی نظام کے حصہ میں آسکتی ہے جس کا مطمح نگاہ نوعِ انسانی کی منفعت ہو۔ واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷)

* * *

میں نے تمہیں اپنے سابقہ خط میں بتایا تھا کہ خدا پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جو معاشرہ اس کے قوانین کے مطابق قائم ہو اسے صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونا چاہیئے۔ قرآن اس ضابطہ کا نام ہے جس کے مطابق یہ معاشرہ قائم ہوتا ہے اس ضابطہ کی ابتدا ہی اس محکم اصول سے ہوتی ہے جس پر اس معاشرہ کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ بنیادی اصول ہے الحمد للہ رب العالمین جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہی معاشرہ مستحق تعریف وستائش ہوگا جو رب العالمین (تمام نوع انسانی کی ربوبیت) کے محکم اصول پر قائم کیا جائے گا۔ اس نظام کو قائم کرنے والوں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اس سے ان پر کچھ تنگی ہی کیوں نہ آجائے یؤثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ انسانی ذات کی نشوو ارتقا کا راز ہی اس میں پوشیدہ ہے ومن یوق شح نفسہ فاولئک ہم المفلحون (۵۹/۹) شح کے لفظ پر غور کرو، انفرادی مفاد پر مبنی معاشرہ کی پوری تصویر سامنے آجائے گی۔

ذرا سامنے لاؤ اس منظر کو کہ گرمی کی شدت ہے۔ کسی ایک جگہ تھوڑا سا پانی ہے اور اس کے ارد گرد پیاسوں کا ہجوم۔ ایسے میں ہر پیاسے کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو دھکیل کر پیچھے ہٹا دے اور خود آگے بڑھ کر پانی پی لے۔ اس قسم کے منظر کو کہتے ہیں تشاحا الماء شح نفس اسی قسم کی ذہنیت کا نام ہے۔ تم نے غور کیا سلیم!

کہ قرآن نے کس طرح ایک لفظ میں اس معاشرے کی پوری ذہنیت کا نقشہ کھینچ دیا ہے جس میں ہر فرد اپنے مفاد کو سامنے رکھتا ہے، یہ ہے وہ معاشرہ جو بخل (مفاد خویش) کی ذہنیت پر استوار ہوتا ہے اور اس کے برعکس دوسرا معاشرہ وہ ہے جو انفاق (مفاد کلی) کے تصور پر قائم ہوتا ہے جس میں ہر پیاسے کی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی پہلے پانی پی لے۔ تم نے پروفیسر (Hawtrey) کا یہ قول اوپر دیکھا ہے کہ معاشی نظاموں میں وجۂ تفریق صرف یہ ہوتی ہے کہ ان میں لوگوں کے کام کرنے کے لئے جذبۂ محرکہ کیا ہوتا ہے۔ تم غور کرو سلیم! کہ جس معاشرہ میں، افراد کی ذہنیت میں اس انداز کی تبدیلی پیدا کر دی جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اس کی محکمیت اور افضلیت میں کسے انکار ہو سکتا ہے؟

قرآن اس ذہنیت کو بھی یوں ہی اندھے عقیدے کی بنا پر پیدا نہیں کرتا۔ وہ اس کے لئے بھی دلائل پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مختلف افراد معاشرہ میں اکتسابی صلاحیتیں (Earning Capacities) مختلف ہوتی ہیں جس شخص میں اکتسابی استعداد زیادہ ہوتی ہے (اور وہ اس استعداد کو کام میں بھی لاتا ہے) وہ زیادہ کماتا ہے۔ یہ شخص کہتا ہے کہ میں نے جو کچھ کمایا ہے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے۔ اس لئے میں اس کمائی کا مالک ہوں۔ میں اس کو کسی دوسرے کو کیوں دیدوں؟

قرآن میں قارون کو مفاد پرستانہ ذہنیت کے نمایندہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ قصص میں ہے کہ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر جس سے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں وہ روش کیوں نہیں اختیار کرتا جس سے انسانی مساوات کا نظام قائم ہو جائے (ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لا یحب المفسدین (۲۸/۷۷) تو وہ اس کے جواب میں کہتا کہ جو کچھ میں نے اپنی ہنرمندی سے کمایا ہے اسے دوسروں کو کیوں دیدوں قال انما اوتیتہ علیٰ علم عندی یہ ذہنیت کسی خاص "قارون" کی نہیں۔ ہر دور کا "قارون" (سرمایہ دار) اپنی روش کے جواز میں یہی دلیل پیش کرتا ہے (۳۹/۴۹)۔

قرآن کہتا ہے کہ ذرا سوچو کہ جس چیز کو تم اپنی "ہنرمندی" (علم عندی) قرار دیتے ہو اس میں

خود تمہارا حصّہ کتنا ہے اور کتنا حصّہ تمہیں "مفت" ملا ہے۔ استعداد کا اختلاف پیدائش سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس پر بچے کا ابتدائی ماحول، تربیت اور تعلیم اثر انداز ہوتی ہے۔ پھر مواقع (Opportunities) کا سوال سامنے آتا ہے۔ اب سوچو کہ ان تمام مراحل میں خود تمہاری ذاتی "ہنرمندی" کا کس قدر دخل ہوتا ہے اور معاشرے کا کتنا حصّہ ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سامنے آجائے گی کہ تمہاری استعداد و صلاحیت کی بنیادیں ان عوامل (Factors) پر قائم ہوتی ہیں جن میں یا تو تمہارا دخل ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو بہت کم۔

اس کے بعد اس مرحلے میں آجاؤ جس میں تم اپنی استعداد کو عمل میں لا کر (یعنی محنت کر کے) دولت کماتے ہو۔ اس میں بھی دیکھو کہ تمہاری ہنرمندی کا حصّہ کس قدر ہوتا ہے اور کتنا حصّہ آفاقی قوتوں (Natural Forces) کا ہوتا ہے۔ قرآن کا انداز یہ ہے سلیم! کہ وہ مجرد حقائق (Abstract Realities) کو محسوس مثالوں (Concrete Examples) کے ذریعے ذہن نشین کراتا ہے۔ چنانچہ وہ اس حقیقت کو اجاگر کرنے کے لئے (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) کھیتی کی مثال پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان عوامل و عناصر کو بھی سامنے لاتا ہے جن پر ہماری روزمرہ کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ غور کرو کہ اس غلّے کی پیدائش میں جسے تم آخر الامر اپنی ملکیت سمجھ کر سمیٹ بیٹھتے ہو، تمہاری "ہنرمندی" کا کتنا حصّہ ہے اور کتنا حصّہ "ہمارا" ہے۔ وہ کہتا ہے کہ افرئیتم ما تحرثون (۵۶/۶۳) کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ غلّہ پیدا کس طرح ہوتا ہے؟ یہ چیز ہر روز تمہارے سامنے آتی ہے؛ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس کا تمہیں علم نہ ہو یا جس کا علم حاصل کرنے کے لئے تمہیں کہیں دور دراز جانا پڑے۔ یہ تو تمہارے ہر روز کے مشاہدے کی چیز ہے (افرئیتم) دیکھو کہ غلّے کی پیداوار میں تمہارا کس قدر حصّہ ہوتا ہے؟ پہلے تو یہ دیکھو کہ خود زمین، جس سے کھیتی اگتی ہے وہ تمہاری پیدا کردہ نہیں۔ لہٰذا اس کاروبار میں راس المال (Principal Investment) بھی تمہارا نہیں۔ اب آگے بڑھو۔ اس زمین میں تم اتنا ہی کرتے ہو کہ ہل جوت کر بیج ڈال دیتے ہو۔ (ما تحرثون) اب سوچو کہ مٹی میں ملے ہوئے بیج سے کونپل کون پیدا کرتا ہے؟ "حرث" کو "زراعت" میں کون تبدیل کرتا ہے۔ کیا یہ کچھ تم کرتے ہو یا خدا کا آفاقی

قانون کرتا ہے (ءانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون)، اگر اس میں ہمارا (یعنی خدا کا) قانون کارفرما نہ ہو تو کھیتی کا اُگنا تو ایک طرف، تمہارے بیج کے دانے بھی مٹی کے ساتھ مٹی ہو جائیں اور اس طرح تمہاری محنت بھی رائیگاں جائے اور ساتھ مفت کی چٹی بھی پڑ جائے (لو نشاء لجعلنہ حطاما فظلتم تفکھون۔ انا لمغرمون۔ بل نحن محرومون) اور تم سر پیٹ کر رہ جاؤ۔

اور آگے بڑھو اور سوچو کہ یہ **صاف اور شفاف پانی** جس پر تمام کھیتی کا دار و مدار اور خود تمہاری زندگی کا انحصار ہے، تمہاری "ہنرمندی" سے پیدا ہوتا ہے؟ (افرءیتم الماء الذی تشربون) وہ کون ہے جو پانی کو سمندر سے اٹھا کر بادلوں کے مشکیزے میں بھرتا ہے اور اسے تمہاری ضرورتوں کے مطابق جگہ جگہ تقسیم کرتا ہے۔ زائد پانی کو پہاڑوں کی چوٹیوں کے حوضوں (Reservoirs) میں جمع کر دیتا ہے اور اسے آہستہ آہستہ، ندی نالوں میں بہاتا ہوا تمہارے کھیتوں اور مکانوں میں لے آتا ہے (ءانتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون) اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچو کہ یہ کس کا انتظام ہے کہ سمندر کے پانی کے تمام نمک (جس سے وہ پانی نہ پینے کے قابل رہتا ہے نہ زراعت کے کام آسکتا ہے) وہیں رہ جاتے ہیں اور کشید کردہ مقطر پانی، تمہاری صراحیوں اور کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے (لو نشاء جعلنہ اجاجا فلولا تشکرون)۔

اور آگے بڑھو اور سوچو کہ **تمازت اور حرارت** جس پر نشو و نما اور ہست و بود کا انحصار ہے کس کے قانون سے تپش آمادہ رہتی ہے؟ کیا اس کی حرارت تمہاری پیدا کردہ ہے؟ (افرءیتم النار التی تورون۔ ءانتم انشاتم شجرتھا ام نحن المنشئون) غور کرو اور بتاؤ کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون   کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار   خاک یہ کس کی ہے۔ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب   موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب

اب سوچو کہ تمہارا اور ہمارا یہ مشترکہ کاروبار تھا۔ اس میں دیکھو کہ تمہارا حصّہ کس قدر ہے اور ہمارا حصّہ کس قدر۔ جس

نسبت سے تمہارا اور ہمارا حصّہ ہے اسی نسبت سے اس کاروبار کا منافعہ (یعنی پیداوار) تقسیم کر لو۔ تم اپنا حصّہ آپ لے لو اور ہمارا حصّہ وہاں پہنچا دو جہاں ہم کہتے ہیں۔ یہ حصّہ ان ضرورتمندوں کا ہے جن میں اکتسابی استعداد بہت کم ہے یا وہ معاشرے کے دوسرے کاموں میں لگے ہوئے ہیں یا جن کی استعداد کسی وجہ سے سلب ہو چکی ہے۔ ہم نے اس حصّہ کو ان ہی کے لئے مختص کر رکھا ہے (نحن جعلنٰها تذکرۃ ومتاعاً للمقوین، مقوین کے معنی ہیں بھوکے۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے ربوبیت اعلیٰ کا انتظام ہو سکے گا۔ پس تمہیں چاہیئے کہ اس نظام ربوبیت کے قیام کے لئے کوشاں رہو (فسبح بحمد ربك العظیم (۵۶/۶۳—۷۴)

سلیم! تم نے دیکھا کہ قرآن کس بلیغ انداز سے اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ جس ماحصل کو انسان اپنی ہنرمندی اور کاری گری کا نتیجہ قرار دیتا ہے اس میں خود انسان کا کتنا حصّہ ہوتا ہے اور کس قدر حصّہ ان عناصر و عوامل کا ہوتا ہے جن کے پیدا کرنے یا بروئے کار لانے میں اس کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ عناصر یا تو اس معاشرہ کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جس میں وہ فرد پرورش پاتا ہے (مثلاً صحت اور غذا کا انتظام۔ تعلیم و تربیت کے ادارے۔ سازگار ماحول اور مساعد فضا وغیرہ وغیرہ) یا کائنات میں بکھری ہوئی نعمتیں جو بلا محنت و مشقت حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، ہوا روشنی، گرمی، وغیرہ۔ اسی لئے قرآن دوسری جگہ کہتا ہے کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ جو چیز تمہاری استعداد اور صلاحیت کی زیادتی کا نتیجہ ہے اس پر تمہیں حق ملکیت حاصل ہے۔ سورۂ نحل میں ہے کہ تم میں سے بعض افراد کو دوسرے افراد کے مقابلہ میں زیادہ اکتسابی قوتیں حاصل ہیں لیکن یہ استعداد تمہاری اپنی پیدا کردہ نہیں۔ قانون خداوندی کی عطا فرمودہ ہے واللہ فضل بعضکم علیٰ بعض فی الرزق (۱۶/۷۱) لہٰذا جب حقیقت یہ ہے تو پھر اس استعداد کا ماحصل تمہاری ذاتی ملکیت کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس ماحصل کی تقسیم اس طرح ہونی چاہیئے کہ کم استعداد کے لوگ جو چھوٹے چھوٹے کاموں پر مامور ہیں اس سے ان کی ضروریات زندگی کا سامان مہیا کیا جائے فما الذین فضلوا برادی رزقھم علیٰ ما ملکت ایمانھم قرآن کہتا ہے کہ تم اس تقسیم کو اس لئے اختیار نہیں کرنا چاہتے کہ تم سمجھتے ہو کہ اس سے زیادہ اور کم استعداد والے لوگ سب

برابر ہو جائیں گے (فھم فیہ سواء)، وہ کہتا ہے کہ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ تمہیں جو قوت اور استعداد خدا کی طرف سے بطور بخشائش ملی ہے تم اسے اپنی ملکیت تصور کرتے ہو اور اس کے عطیۂ خداوندی ہونے سے انکار کرتے ہو (افبنعمۃ اللہ یجحدون) وہ کہتا ہے کہ یہ انداز نگاہ بالکل غلط ہے کہ تم عطایائے خداوندی کو سمیٹ کر اپنی ہی ذات کے لئے مختص کر لو۔ جب ہم نے اپنے عطیات (سامان پرورش) میں حد بندیاں نہیں کیں تو کسی انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ انہیں محدود اور مقید کر کے رکھ لے وما کان عطاء ربک محظورا (۱۷/۲۰)

تم نے دیکھا سلیم! قرآن کریم کس طرح اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ مفاد پرستانہ گروہ (یعنی سرمایہ دارانہ ذہنیت) کی یہ دلیل کہ جس دولت کو ہم اپنی ہنرمندیوں سے پیدا کرتے ہیں اسے دوسروں کو کیوں دیدیا جائے کس قدر نگاہ کا فریب اور حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان جس چیز کو اپنی ہنرمندی قرار دیتا ہے اس میں اس کا اپنا حصہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ باقی سب کچھ فطرت کے عطایا ہوتے ہیں اور فطرت نے ان قوتوں اور نعمتوں کو عطا اس لئے کیا ہے کہ اس طریق سے نوع انسانی کی ربوبیت کا سامان بہم پہنچ سکے۔ قرآن اس حقیقت کو ایمان کی حیثیت سے تسلیم کرانا چاہتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ یہ دونوں راستے تمہارے سامنے کھلے ہیں۔ تم سوچو کہ ان میں سے کون سی راہ علم و بصیرت اور دلیل و برہان کی راہ ہے۔ اگر تم اس دعوے سے متفق ہو جاؤ کہ صحیح علم و بصیرت کی راہ وہی ہے جس کا نتیجہ نوع انسانی کی منفعت ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے اس راستے کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ اب سوچو کہ جو قوم اس حقیقت کو اپنی زندگی کا نصب العین اور اپنے سفر حیات کی منزل مقصود قرار دے لے۔ کیا اُن کے دل میں کبھی یہ خیال تک بھی آئے گا کہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم دن رات محنت کرتے رہیں اور اس محنت کا ماحصل دوسروں کی پرورش اور تربیت کے لئے صرف کر دیا جائے؟ ان کا تو دعویٰ یہ ہو گا کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم خدا کی صفت رب العلمین کا مظہر بنیں اس لئے ہماری ہر حرکت اسی محور کے گرد گردش کرے گی انا للہ وانا الیہ راجعون قرآن نے اس جماعت کا نام ربانیون کی جماعت

رکھا ہے۔ اس کی تعلیم کا مقصد ہی اس قسم کی جماعت پیدا کرنا تھا۔

اب تم خود سوچو سلیم! کہ قرآن کی تعلیم کا ماحصل کیا ہے۔ اس تعلیم کی رو سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ زرِ فاضلہ کس کے پاس رہے اور ذرائع پیداوار کس کی ملکیت میں۔ اس کی تعلیم کا ماحصل یہ ہے کہ قدرتی پیداوار اور انسانوں کی محنت کا ماحصل سب کے سب نوعِ انسانی کی پرورش (ربوبیت) کے لئے صرف ہوں۔ اور ہر فرد اپنی زندگی کا یہی نصب العین قرار دے۔ لہذا جب منتہائے نگاہ پوری انسانیت کی پرورش و تربیت ٹھہرے تو اس ذاتی ملکیت کا سوال ہی کیسے پیدا ہو سکتا ہے جس میں ماحصل پیدائش و محنت، کسی ایک فرد یا چند افراد کی ذات کے لئے محدود و مختص ہو کر رہ جائیں

میرے فہم قرآن کی رو سے سلیم! قرآن کی غایت اس قسم کا نظام قائم کرنا ہے جس میں پوری کی پوری انسانیت کی پرورش (ربوبیت) ہو سکے اور تمام افرادِ انسانیہ خدا کی معاشی سہولتوں سے یکساں طور پر متمتع ہو سکیں۔ یہی اسلام کا منتہیٰ ہے

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

مجھے تمہاری تجویز سے پورا اتفاق ہے، سلیم! کہ قرآنی نظام ربوبیت (Quranic Social Order) کے متعلق اس طرح منتشر طور پر، متفرق مضامین اور خطوط میں لکھنے کی بجائے، ایک مختصر سی کتاب[1] میں، جامع طور پر، سب کچھ ایک جگہ لکھ دیا جائے تاکہ اس کے سمجھنے میں آسانی رہے۔ تمہارے خط ملنے پر میں نے اسے کتابی شکل میں ترتیب دینا شروع کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب جلدی تم تک پہنچ جائے گی۔ تمہارا تقاضا ٹالا نہیں جا سکتا۔

اچھا۔ خدا حافظ

دسمبر ۱۹۵۲ء

---

[1] یہ کتاب "نظام ربوبیت" کے نام سے شائع ہو رہی ہے۔

سلیم کے نام تیرھواں۱۳ خط

(صلوٰۃ و زکوٰۃ کا مفہوم)

سلیم! میری بیماری کے دوران میں تمہارے کئی ایک خطوط جمع ہو گئے۔ تم اپنی جگہ پریشان ہو گے کہ خط کا جواب کیوں نہیں ملتا۔ میں اپنی جگہ پریشان تھا کہ میری خاموشی تمہارے لئے وجہ تشویش ہو گی اور اس لئے بھی کہ تمہارے استفسارات کا جواب جلدی ملنا چاہیئے، تاکہ تمہاری کاوش و تحقیق، تذبذب میں نہ بدل جائے، کہ پھانس کا زیادہ دیر تک چبھے رہنا بعض اوقات ناسور کا باعث بن جایا کرتا ہے۔ لیکن میں معذور تھا۔ اب بھی اگرچہ نسبتاً بہتر ہوں، لیکن پوری طرح کام کرنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ یہ خط بھی اِملا کرا رہا ہوں، خود نہیں لکھ رہا۔

تمہاری حیرت بجا ہے کہ جو باتیں بظاہر مسلّمات سی دکھائی دیتی ہیں جب انہیں ذرا کُریدا جائے تو وہ بھی حقیقت سے بعید نظر آتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اُن چیزوں کو بھی جو بظاہر مسلمات کی حیثیت سے اُن تک وراثتاً پہنچی ہوں، فکری تنقید سے نہ پرکھے۔ وائٹ ہیڈ کو تم جانتے ہو اس نے ایک جگہ لکھا ہے

It requires a very unusual mind to

undertake analysis of what is obvious

(اس بات کے لئے ایک بڑے غیر معمولی دماغ کی ضرورت ہے کہ جو باتیں عام طور پر مسلمات میں سے مانی جاتی ہیں

ان کا تجزیہ کرے)

اس حقیقت پر غور کرو سلیم! بظاہر یہ چیز بڑی سطحی سی نظر آئے گی۔ لیکن جوں جوں اس پر غور کرو گے یہ تمہیں ایک بات بلند معیار کی طرف لے جائے گی۔ کتنی باتیں ہیں جنہیں ہم بطور مسلمات مانتے چلے جاتے ہیں اور اس کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ کہیں رک کر یہ دیکھیں تو سہی کہ وہ فی الواقعہ ایسی ہیں کہ انہیں بطور مسلمات مانا جائے۔ کتنے فریب ہیں جو محض اسی طرح رفتہ رفتہ حقائق بن جاتے ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں ایک خط میں لکھا تھا کہ ذرا اس مسلمہ کا تجزیہ تو کرو کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" اور تجزیہ کرنے کے بعد تم نے خود دیکھا تھا کہ یہ مسلمہ کسی حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ بات میں نے مثالاً دہرائی ہے۔ ورنہ تم اگر غور کرو تو دیکھو گے کہ کتنی باتیں ہیں جو ہم صبح سے شام تک بطور مسلمات دہرائے چلے جاتے ہیں اور اس پر غور کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ وہ مسلمات ہیں بھی یا نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر وہ بات جسے ہم بطور مسلمہ مانتے ہیں تجزیہ کے بعد ضرور غیر حقیقی ثابت ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مبنی علی الحقیقت ہی ہو۔ لیکن جو چیز اس طرح فکری تنقید کے بعد بطور مسلمہ مانی جائیگی وہی ایمان محکم کا درجہ رکھے گی۔ فکری تنقید میں یہ بھی شامل ہے کہ تمہارے پاس اس کے مبنی علی الحقیقت ہونے کے لئے خدا کی طرف سے سند مل جائے، اور یہ سند ایک مسلمان کے لئے قرآن کے اندر ہے۔ اس لئے سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ ہم ان تمام باتوں کو جنہیں ہم بطور مسلمات مانتے چلے آرہے ہیں، اس فکری تنقید کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں اور اس کے بعد صرف ان ہی کو مسلمات میں سے تسلیم کریں جو قرآن کی کسوٹی پر پوری اتریں۔ قرآن نے تقلیدی روش کی جو اس قدر مخالفت کی ہے تو اس لئے کہ جن چیزوں کو ہم تقلیداً مانتے ہیں اُن کا ہم کبھی فکری تجزیہ نہیں کرتے، نہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تائید میں خدا کی طرف سے بھی کوئی سند ہے یا نہیں۔ تقلیدی روش کے مسلمات ہی کو وائٹ ہیڈ نے (What is obvious) کہہ کر پکارا ہے۔ قرآن ہر مسلمان (بلکہ ہر انسان) کو تاکید کرتا ہے کہ لاتقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا۔ کہ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو سماعت، بصارت اور فؤاد ہر ایک سے

پوچھا جائے گا کہ تم نے فلاں بات کی تائید کی تھی۔ میں اس خط میں اس عظیم الشان حقیقت کی وضاحت کی گنجائش نہیں پاتا جو اس آیت میں قرآن کریم نے علم کی تعریف (Definition) کے طور پر بیان کی ہے۔ یہ بحث بڑی طویل ہو جائیگی اور اس میں افلاطون کے نظریۂ علم سے لیکر آجتک کے نظریات کو سامنے لانا ضروری ہوگا۔ اور اس کے بعد بتایا جائے گا کہ قرآن نے علم کی جو تعریف کی ہے اسمیں کس طرح اس ثنویت (Dualism) کو مٹایا ہے جو تصوراتی (Idealism) اور حواسی (Perceptualism) کے فلسفیانہ نظریات نے پیدا کر دی ہے اسوقت مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ ہم تمام مسلمات کو اس علم کی کسوٹی پر پرکھیں جس میں سمع بصر اور فواد (Mind) سب کی شہادات موجود ہوں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی کہ میں (یعنی رسول) اور اسکی روش پر چلنے والے خدا کیطرف جو دعوت دیتے ہیں تو وہ دعوت بصیرت پر مبنی ہوتی ہے۔

ممکن ہے یہاں پہنچ کر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ایک طرف قرآن ایمان بالغیب کا مطالبہ کرتا ہے ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب اور دوسری طرف وہ ایمان کو علیٰ وجہ البصیرت قرار دیتا ہے تو اس کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اور باتوں کی طرح ایمان بالغیب کا مسئلہ بھی محتاج تجزیہ ہے۔ اسے یوں سمجھو کہ دنیا میں ایک نظام قائم ہے وہ اپنے نتائج پیدا کر رہا ہے (مفید یا مضر) اس کے خلاف ایک پکار اٹھتی ہے کہ یہ نظام انسانیت کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ پکارنے والا ایک دوسرا نظام پیش کرتا ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ یہ نظام، انسانیت کی نشو ونما اور فلاح و بہبود کا کفیل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دوسرا نظام ابھی محض لفظوں میں ہے اور اپنے نتائج پیدا کر نہیں سکتا تاوقتیکہ اسے عملاً نافذ نہ کر دیا جائے۔ اور اس کا عملی نفاذ ناممکن ہے تاوقتیکہ کچھ ایسے انسان موجود نہ ہوں جو اسے نافذ کریں۔ اور نافذ وہی انسان کر سکتے ہیں جو اس کی صداقت پر ایمان رکھتے ہوں، یعنی انہیں یقین ہو کہ یہ نیا نظام وہ نتائج پیدا کر کے رہے گا جو اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ مطالبہ کریں کہ ہم اس نظام کی صداقت کے قائل اسی صورت میں ہوں گے کہ اس کے نتائج ہمارے سامنے آجائیں تو یہ ایسا ہی مطالبہ ہوگا جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں پانی میں اس وقت اتروں گا کہ جب مجھے پہلے تیرنا آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ تیرنے کے لئے پہلے پانی میں اترنا ضروری ہے۔ اسی طرح

اس نئے نظام کے نتائج دیکھنے کے لئے اس نظام کو عملاً نافذ کرنا ضروری ہے۔ اس جماعت کے لئے جو اس نظام کی تنفیذ میں پہل کرے گی (جسے قرآن نے السابقون الاولون کہہ کر پکارا ہے) یہ ضروری ہے کہ اس نظام کے نتائج کو بغیر دیکھے صحیح مانے (اس "بن دیکھے ایمان" کو ایمان بالغیب کہتے ہیں) یہی جماعت جب بن دیکھے نتائج پر ایمان لا کر اس نظام کو عملاً نافذ کر دے گی تو وہی بن دیکھے نتائج محسوس شکل میں سامنے آجائیں گے اور بعد کے لوگ ان نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس نظام کی صداقت پر ایمان لائیں گے۔ ان کا ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہو گا۔ پہل کرنے والی جماعت کے ایمان کے محرک، نظام کے نتائج کی جگہ اور شواہد ہوتے ہیں۔ بعض کے لئے خود اس نظام کی معقولیت اور بعض کے لئے اس نظام کی طرف دعوت دینے والے کی سیرت کی عظمت۔ اور بعض کے لئے وہ تاریخی شواہد جو یہ بتائیں کہ جب اس قسم کا نظام کبھی پہلے قائم ہوا تھا تو اس نے کیا نتائج مرتب کئے تھے۔ اس کا نام ہے "پہلی کتابوں پر ایمان"۔ جب اس طرح سے نظام کی ابتدا کر دی جائے تو پھر ہر قدم پر ابھر کر سامنے آنے والے نتائج خود اس کی صداقت کی دلیل بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ استنتاجی دلائل (Pragmatic Test) آنے والوں کے لئے آیات اللہ یعنی نظام خداوندی کی کھلی کھلی نشانیاں بن جاتی ہیں اور وہ "دین میں فوج در فوج" داخل ہو جاتے ہیں۔

اس سے سلیم! تم نے سمجھ لیا ہو گا کہ ایمان بالغیب سے صحیح مفہوم کیا ہے اور ایمان علیٰ وجہ البصیرت کسے کہتے ہیں۔ قرآن کا علمی معیار بہر حال ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ فقط اس کے دلائل اور شواہد میں ذرا سا فرق ہوتا ہے۔ آج ہمارے پاس خدا کی کتاب بطور محکم سند کے موجود ہے۔ ہمارے لئے کوئی شے مسلمہ کی حیثیت نہیں رکھ سکتی جب تک ہم اسے علمی معیار پر پرکھ کر نہ دیکھیں۔ قرآن علم اور عقل کے لئے اسی طرح راہنمائی کا کام دیتا ہے جس طرح انسانی آنکھ کے لئے سورج کی روشنی۔ ہم ہر اس شے کو جو ہمارے سامنے بطور مسلمہ کے پیش کی جاتی ہے، قرآن کی روشنی میں علم اور عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن تقلیدی روش پر چلنے والوں کے لئے یہ منزل بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر رسول کی دعوت کی تکذیب ان کی طرف سے

ہوئی جوان مزعومات کو جو انہیں وراثتاً ملے تھے، مسلمات مانتے چلے آرہے تھے، اور اس کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے کہ اُن مسلمات کو رجو اُن کے نزدیک (Obvious) تھے علم وعقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں ہمارے ہاں جن چیزوں کو مسلمات کی حیثیت حاصل ہے ان میں سے بھی بیشتر کی یہی کیفیت ہے۔ تم اگر ان مسلمات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ کر دیکھو تو تم حیران رہ جاؤ گے کہ کس قدر غیر حقیقی نظریات ہیں جو یکسر حقیقت بن کر ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ یہود ونصاریٰ اور مجوسی قوتیں جب کھلے بندوں اسلام کے دین کی حریف نہ ہوسکیں تو انہوں نے اس دین کے خلاف ایک منظم سازش کی۔ جس طرح سینٹ پال جب دورِ اوّل کے عیسائیوں کو اذیتوں اور تکلیفوں کی بنا پر شکست نہ دے سکا تو اس نے خود عیسائیت کا نقاب اوڑھ لیا اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے آوردہ دین کی جگہ اپنا بنایا ہوا مذہب ہر طرف پھیلا دیا۔ چنانچہ آج دین عیسوی کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ ہر عیسائی مذہبِ پولوس کا پرستار ہے۔ اسی طرح اسلام سے شکست خوردہ یہودی نصرانی اور مجوسی قوتوں نے مسلمانوں کا نقاب اوڑھا اور دینِ خداوندی کی جگہ آہستہ آہستہ اپنے نظریات ومعتقدات کو مذہب اسلام کی شکل میں پھیلا دیا۔ آج ہمارے مروجہ مذہب میں بہت کم حصہ ایسا ہے جو اس دین پر مشتمل ہے جسے خدا نے ہمارے لئے تجویز کیا تھا باقی سب ان ہی اقنوم ثلاثہ کی اختراعات پر مبنی ہے۔ نصاریٰ کی خانقاہیت (Other-worldliness) یہودیوں کی رسوم پرستی . . . . (Ritualism) اور پیشوائیت (Priesthood) اور ایرانی مجوسیوں کی اسلاف پرستی (Ancestoral Worship) یہ ہیں عناصر موجودہ مذہب اسلام کے ہیں اسی کو "مذہب" کہتا ہوں اور قرآن کے نظام زندگی کو دین، کہ قرآن نے دین ہی کو پیش کیا ہے مذہب کو نہیں۔ مذہب کا تو لفظ بھی غیر قرآنی ہے۔

آج جس چیز کا نام احیائے دین اور شریعت کا نفاذ رکھا جاتا ہے اور ہر طرف سے مسلمانوں کو اس کی طرف آنے کی دعوت دی جاتی ہے وہ درحقیقت ان ہی عناصر ثلاثہ کی طرف مراجعت کی دعوت ہے۔ یہی وہ عناصر ہیں

جن کے مرتب کردہ نظریات بطور مسلمات (Obvious) ہمارے ہاں متوارث چلے آرہے ہیں۔ اور یہی وہ مسلمات ہیں جن کے تنقیدی تجزیہ کے بغیر ہم اصلِ دین تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ عیسائیت اگر آج چاہے بھی تو مذہب پولوس سے چھٹکارا حاصل کر کے دین عیسوی تک نہیں پہنچ سکتی کہ اُن کے پاس اللہ کی کتاب اپنی اصل شکل میں موجود نہیں۔ لیکن ہمیں یہ خصوصیت (Privelege) حاصل ہے کہ ہمارے پاس ضابطۂ خداوندی، (قرآن) محفوظ شکل میں موجود ہے۔ یہ دور سلیم! ہماری تاریخ میں (ہماری تاریخ ہی نہیں بلکہ انسانیت کی تاریخ میں) بڑا نازک دور ہے۔ پاکستان کی سرزمین دے کر قدرت نے ہمیں ایک امکانی قوت عطا کی ہے کہ ہم اس نظام کو قائم کر سکیں جو انسانی فلاح و بہبود کے لئے تجویز کیا گیا تھا۔ اگر ہم نے اسے اس کی اصلی شکل میں قائم کر دیا تو نہ صرف یہ کہ ہم اپنے آپ ہی کو اونچلے جا سکیں گے بلکہ فکر و نظر کی پریشانی میں الجھی ہوئی انسانیت کی امامت بھی کر سکیں گے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور عجمی اثرات کا پیدا کردہ مذہب قانونی قوت کی حیثیت سے مسلط ہو گیا تو تم دیکھو گے کہ چند دنوں کے بعد ہم بھی اسی سطح پر آ جائیں گے جس سطح پر مسلمانوں کے دیگر ممالک ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جسے غلط عقیدتمندی کی ہزار مقدس آرزوئیں بھی جھٹلا نہ سکیں گی کہ خدا کا قانون مقدس آرزوؤں کی رعایت سے اپنے نتائج روک نہیں لیا کرتا۔

میرا جرم یہی ہے کہ میں اپنے ہاں کے بدیہی مسلمات (Obvious) کو جن پر ہم تقلیداً چلے آرہے ہیں قرآن کی روشنی میں تجزیہ کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

* * *

تمہارے دوسرے سوال کا جواب ذرا زیادہ تشریح طلب ہے۔ میں نے اپنے گزشتہ سفر بلوچستان میں ایک جگہ دیکھا کہ ایک ویران سی بستی کے قریب کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارات ہیں۔ ایک طرف ریلوے سگنل کا ٹوٹا ہوا کھمبا استادہ ہے، دوسری طرف ریل کا کانٹا موڑنے کا چکر ہے۔ ذرا فاصلے پر ریل کی پٹڑی کے دو چار ٹکڑے بکھرے پڑے ہیں۔ گاؤں کے ایک بوڑھے نے بتایا کہ پہلے یہاں ریل کا اسٹیشن تھا۔ ہماری

بستی اناج اور پھلوں سے بھری رہتی تھی۔ آنے جانے والے مسافروں کی وجہ سے بڑی رونق رہتی تھی اور بستی کے لوگ خوش حال تھے۔ اب یہاں سے ریل اٹھا دی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ بستی نہیں ویرانہ ہے۔ نہ معلوم ہمارے کون سے گناہوں کی مار ہم پر پڑی۔ اب بڑی مشکل سے دن گزرتے ہیں۔ اس بڈھے نے ریل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ لیکن ذرا سوچو سلیم! کہ اس کی ایک دو پشتوں کے بعد جو بچے پیدا ہوں گے وہ اپنے ماں باپ سے ریل کی کہانیاں سنیں گے۔ اس کی برکات کے قصے سن کر وہ ریل کے متعلق عجیب سا تصور قائم کریں گے۔ ریل کے مقام پر وہ ان ہی ٹوٹتے ہوئے کھمبوں اور بکھری ہوئی پٹڑیوں کے نشانات دیکھیں گے۔ چونکہ انہوں نے ریل دیکھی نہ ہوگی اس لئے وہ یہی سمجھ بیٹھیں گے کہ وہ برکتیں ان ہی کھمبوں اور پٹڑی کے ٹکڑوں سے وابستہ تھیں۔ انہیں اگر کوئی سمجھانا چاہے کہ یہ کھمبے اور پٹڑیاں درحقیقت ریلوے کے عظیم القدر نظام کے اجزاء تھے اور اس نظام کے اندر یہ اجزا لاینفک تھے۔ لیکن ریلوے کا نظام منتشر ہو جانے سے اب ان سے وہ نتائج نہیں برآمد ہو سکتے جن کے لئے یہ وضع کئے گئے تھے، تو یہ بات ان بچوں کی سمجھ میں کبھی نہیں آسکے گی۔ ریل کو دیکھے بغیر وہ ریل کے متعلق کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اور نہ ہی یہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کھمبے اور پٹریاں اب کیوں بے نتیجہ قرار دیئے جا رہے ہیں اور اس وقت ان میں کون سی نئی قوت پیدا ہو جائے گی کہ اُن کے ایک اشارے پر ریل مع اپنی تمام برکات کے اِدھر سے اُدھر چلتی پھرتی رہے گی۔

دین ایک نظام کا نام ہے۔ اس نظام سے مقصود یہ تھا کہ دنیا کے انسان اس انداز سے مل جل کر رہیں کہ ہر فردِ انسانی کیلئے اس کی مضمر صلاحیتوں کے مکمل طور پر نشوونما پانے کے اسباب و مواقع یکساں طور پر موجود ہوں۔ وہ نظام جس میں ہر فرد دوسرے فرد کی ربوبیت (انسانی صلاحیتوں کی نشوونما) کا ذریعہ بنے اور اس طرح دوسروں کی ربوبیت کی فکر اور انصرام میں خود اپنی انسانیت کی ربوبیت کا سامان پائے۔ طبعی زندگی کی ضروریات تو اس نظام میں قدم اول سے بھی پیچھے کی بات رہ جاتی ہے۔ جو ربانی نظام ہر فرد کی تمام فطری صلاحیتوں کے مکمل نشوو ارتقا کا ذمہ دار ہو وہ انسان کی طبعی ضروریات کو کب فراموش کر سکتا ہے۔ ظاہر

ہے کہ ایسے عظیم القدر نظام کے اجزاء کثیر التعداد اور مختلف النوع ہوں گے۔ نظام کے اندر ان اجزا میں سے چھوٹے سے چھوٹا جزء بھی اپنا مقام، اپنی خصوصیت اور اپنی اہمیت رکھے گا اور اس نظام کلی کے نتائج مرتب کرنے میں اس کا بھی پورا پورا حصہ ہوگا اور اس جزء کے صحیح طور پر کام نہ کرنے سے پورا نظام معطل ہو جائے گا۔ جس طرح ریل کی پٹڑی کے کسی ایک پیچ کے ڈھیلے ہو جانے سے تمام گاڑیاں اپنی اپنی جگہ رک جاتی ہیں۔ اسلامی نظام میں مختلف احکامات کی یہی حیثیت تھی۔ جب وہ نظام قائم تھا تو اس میں ہر نقل و حرکت جو نظام کے اصول کے مطابق ہوتی تھی، اس نظام کے نتائج مرتب کرنے کا ذریعہ بنتی تھی۔ لیکن جب نظام منتشر ہو گیا تو اس نظام کے یہی اجزاء سگنل کے کھمبوں، کانٹے کے چکروں اور پٹڑی کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی طرح باقی رہ گئے۔ ہم نے اس نظام اور اس کی برکات کی باتیں سنی ہیں اسے مشہود پیکر میں دیکھا نہیں۔ اب ہم ان ہی سگنل کے کھمبوں، کانٹے کے چکروں اور پٹڑی کے ٹکڑوں کو اس نظام کی برکتوں اور سعادتوں کا ذریعہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ ان ہی پر ہم اپنی عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں اور ان ہی سے توقع کرتے ہیں کہ ہماری اُجڑی ہوئی بستیاں پھر سے آباد ہو جائیں گی۔ ان میں پھر سے ملک ملک کے اناج اور قسم قسم کے پھل آئیں گے۔ ہمارا کارواں پھر پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مصروفِ جادہ پیمائی ہو جائے گا۔ سلیم! سوچو کہ ان حسین اور مقدس آرزوؤں سے یہ توقعات کبھی بھی پوری ہو سکتی ہیں؟ ریل کے نظام کے اندر یہی کھمبے اور پٹڑیاں ان برکتوں اور سعادتوں کے ذریعے تھے۔ اس نظام کے باہر از خود کسی برکت اور سعادت کا موجب نہیں بن سکتے۔ نظام کے اندر یہ دین کے اجزاء تھے۔ نظام سے باہر یہ رسومات ہیں۔ مذہب، رسومات کے مجموعے اور اُن سے وابستہ مقدس آرزوؤں کا نام ہے۔ دین کی صداقت کی دلیل اس کے زندہ نتائج ہوتے ہیں۔ مذہب کی صداقت اس کے ماننے والوں کی خوش عقیدگی سے باہر کہیں نہیں ہوتی۔ دین ایک چلتے پھرتے جسم نامی کی مثل ہوتا ہے، مذہب میں جسم مردہ کے الگ الگ ٹکڑے متبرک مقامات پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔

اسلام نے زندگی کا جو نظام دیا تھا اور جسے اس نے الدین کی جامع اصطلاح سے پکارا تھا، اگرچہ اس کے

الگ الگ حصے نہیں کئے جا سکتے لیکن سمجھنے کے لئے یوں سمجھو کہ اس کا ایک حصہ وہ تھا جس سے افراد کی زندگی میں انقلابات پیدا ہوتے تھے اور دوسرا حصہ وہ تھا جو انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بنتا تھا۔ اسے پھر سمجھ لو کہ یہ دو الگ الگ حصے نہیں تھے۔ (داخلی انقلابات یعنی تغیرِ نفس کا لازمی نتیجہ ربوبیت عامہ اور ربوبیت عامہ کا فطری نتیجہ نفسِ انسانی کی نشو و ارتقا تھا۔ میں نے یہ دو حصے تمہیں سمجھانے کے لئے الگ الگ کئے ہیں تاکہ تمہارے مزید استفسا سے بچ سکوں۔) ان دو حصوں کو قرآن نے اقیموا الصلوٰۃ اور اٰتوا الزکوٰۃ سے تعبیر کیا۔ الصلوٰۃ کی اصطلاح میں نفسیاتی تغیرات کا پورا نظام اپنی سمٹی ہوئی شکل (Miniature Form) میں منعکس ہو جاتا ہے۔

اور الزکوٰۃ میں نشو و نما دینے (ربوبیت) کے تمام اسباب و ذرائع سمو جاتے ہیں۔ الزکوٰۃ کے معنی ہی نشو و نما (Growth) کے ہیں۔ الصلوٰۃ ایک مسلم کی زندگی کے ہر سانس کو محیط ہوتی ہے۔ اس کی ہر نقل و حرکت، اس کی فکر، اس کے ارادے، ان ارادوں کے مظاہر تمام کے تمام الصلوٰۃ ہی کے مظہر ہوتے ہیں۔ الصلوٰۃ صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے۔ وہ صراط جس کے متعلق فرمایا کہ ان ربی علیٰ صراط مستقیم "تیسرے نشو و نما دینے والے کا قانون ربوبیت خود متوازن راہ پر چل رہا ہے"، اسی کے پیچھے پیچھے تم بھی چلتے جاؤ۔ مصلی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ میں پہلے نمبر کے گھوڑے کے بالکل پیچھے پیچھے ہو۔ جو ادھر اُدھر کی راہوں میں نکل جائے وہ مصلی نہیں۔ اسی لئے سورۂ القیامہ میں نظامِ اسلامی سے منہ موڑنے والے کے متعلق فرمایا فلا صدق و لا صلّٰی ولکن کذب و تولّٰی (۷۵/۳۱-۳۲) کہ وہ تصدیق نہیں کرتا اور نہ ہی صلوٰۃ کا پابند ہے بلکہ تکذیب کرتا ہے اور گریز کی راہیں اختیار کرتا ہے۔ دیکھو سلیم! یہاں تصدیق کے مقابلہ میں تکذیب ہے اور صلّٰی کے مقابلہ میں تولّٰی یعنی گریز کی راہیں نکالنا۔ اس لئے مصلی وہی ہوگا جو متوازن راہ (صراط مستقیم) پر اپنے نشو و نما دینے والے کے قانون ربوبیت کے عین پیچھے چلتا جائے اور ادھر اُدھر دیکھے تک نہیں۔ سجدہ سے مُراد ہی قانونِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ سورۂ علق میں دیکھو۔ حضور سے فرمایا گیا کہ نظامِ خداوندی سے منہ موڑنے والے کی اطاعت مت کرو (لا تطعہ) بلکہ واسجد واقترب (۹۶/۱۹) بلکہ سجدہ کرو اور قریب ہو جا۔

یعنی سجدہ ہر غیر خداوندی قانون کی اطاعت سے انکار، اور قانونِ خداوندی کی اطاعت کا مظہر ہے۔ اسی طرح سورۂ مُرسلات میں مجرمین اور مکذبین کے متعلق کہا گیا ہے کہ واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون (۷۷/۴۸) کہ جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ رکوع کرو تو یہ رکوع نہیں کرتے۔ یعنی قانونِ خداوندی کی تکذیب اور اس سے سرکشی رکوع سے مانع ہوتی ہے۔ لہذا رکوع کے معنی قانون خداوندی کی عملی تصدیق اور اس کے سامنے جھک جانا ہے۔ سورۂ اعراف میں دیکھو، قانون خداوندی کے ساتھ کامل تمسک کا دوسرا نام اقامت صلوٰۃ رکھا گیا ہے۔

والذین یمسکون بالکتٰب واقاموا الصلوٰۃ ؕ انا لا نضیع اجر المصلحین ○ (۷/۱۷۰)

(متقی وہ ہیں جو) قانونِ خداوندی کے ساتھ پورا پورا تمسک رکھتے ہیں یعنی صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں۔

یہی وہ ہمواریاں پیدا کرنے والے (مصلحین) ہیں جن کے اعمال ضرور نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔

تمسک بالکتاب یعنی قانون خداوندی کا عملاً اتباع ناممکن ہے جب تک کہ دین کا نظام عملاً جاری و ساری نہ ہو اور چونکہ اقامتِ صلوٰۃ بھی اسی نظام ہی سے وابستہ ہے، اس لئے اقامتِ صلوٰۃ بغیر تمکن فی الارض (یعنی کسی خطۂ زمین میں قرآنی حکومت قائم کئے بغیر) ناممکن ہے۔ سورۂ حج میں دیکھو، کس قدر واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جب ہم ان لوگوں کو جو قرآنی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ الصلوٰۃ کو قائم کریں گے اور الزکوٰۃ کا انتظام کریں گے (۲۲/۴۱) دوسری طرف سورۂ نور میں دیکھو، استخلاف فی الارض اور تمکن دین کو "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" سے مشروط ٹھہرایا گیا ہے (۲۴/۵۵-۵۶) اور آگے چلو۔ سورۂ شوریٰ میں جہاں یہ فرمایا کہ وامرھم شوریٰ بینھم (کہ ان کی حکومت باہمی مشاورت سے طے پائے گی) اس سے پہلے اقامتِ صلوٰۃ اور اس کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کے الفاظ آئے ہیں (۴۲/۳۸) سورۂ حج میں جہاں قرآنی نظام قائم کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ ان کا فریضۂ زندگی یہ ہوگا کہ وہ نوعِ انسانی کے اعمال کے نگراں ہوں گے اس کے ساتھ ہی فرمایا فاقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ (۲۲/۷۸) اور اس کے بعد کہا واعتصموا باللہ یعنی قانون خداوندی سے اعتصام، اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ ہی سے ممکن ہے۔ سورۂ اعراف میں

دیکھو۔ پہلے فرمایا قل امر ربی بالقسط کہ میرے نشوونما دینے والے کے قانون نے یہ کہا ہے کہ نظامِ ربوبیت کے لئے توازن اور تناسب قائم کرنا ضروری ہے (قرآن میں عدل اور قسط اور وسطیٰ کی اصطلاحات بڑی غور طلب ہیں اور ان ہی پر پورے نظام ربوبیت کا مدار ہے۔ لیکن ان کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔ انہیں یا تو کسی دوسرے خط میں لکھوں گا اور یا پھر تمہیں معارف القرآن کی اگلی جلد کا انتظار کرنا ہوگا۔ جس میں اسلام کا معاشی نظام یعنی ربوبیت، شرح و بسط سے آجائے گا) اس کے بعد فرمایا کہ واقیموا وجوھکم عند کل مسجد یعنی ربوبیت میں توازن قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تم اپنے اعمال اور افکار کے رخ میں صحیح سمت اختیار کرو اور یہ سمت خدائی قانون کے ساتھ اپنا رخ متوازی رکھنے سے حاصل ہوگی۔ اور اس کے بعد فرمایا وادعوہ مخلصین لہ الدین اور خالص نظامِ زندگی اسی قانون کے ذریعہ سے قائم ہوسکے گا۔ غور کرو سلیم! اگر قیامِ صلوٰۃ سے مقصود یہ ہماری رسمی نمازیں ہی ہوں تو ان کے لئے تمکن فی الارض یعنی ملک میں قرآنی حکومت قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ نمازیں تو ہم انگریزوں کی غلامی میں بھی پڑھا کرتے تھے۔ اور آج بھی ہندوستان کے مسلمان اسی طرح پڑھ رہے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچو کہ قرآن نے اقامتِ صلوٰۃ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض بتایا ہے۔ ہماری ان نمازوں سے ہمیں کب استخلاف ملا؟ سورۂ بقرہ میں دیکھو۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا لازمی نتیجہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون (۲/۲۷۷) کہ ان لوگوں پر جو نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کریں گے "کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا۔" ذرا غور کرو کہ کیا ہماری نمازیں اور اڑھائی فی صدی والی زکوٰۃ یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہے کہ ہمیں کسی قسم کا خوف اور حزن نہ ہو۔ صلوٰۃ کے متعلق سورۂ عنکبوت میں بین الفاظ میں ہے کہ ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر (۲۹/۴۵) یقیناً بلاشک و شبہ صلوٰۃ فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے۔ سلیم! اس حتم اور یقین کو سامنے رکھو جس کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ صلوٰۃ فحشا اور منکر سے روک دیتی ہے اور پھر اس کے بعد دیکھو کہ کیا ہماری موجودہ نمازیں یہ نتیجہ پیدا کر رہی ہیں۔ سورۂ روم میں دیکھو کیسے حسین اور بلیغ انداز میں اقامتِ صلوٰۃ کے دونوں گوشوں کے فطری نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا واتقوہ یعنی قانون خداوندی

سے پوری ہم آہنگی پیدا کرو۔ اس کے بعد کہا واقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم یعنی اس قانون سے ہم آہنگی کا عملی نتیجہ نظام قرآنی کی تشکیل ہوگی اور اس نظام کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان جو اس نظام کے بغیر گروہوں اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں، ایک مرکز پر جمع ہو جائیں گے اور اس طرح وحدتِ قانون سے وحدتِ نظام اور وحدتِ نظام سے وحدتِ انسانیت مشہود ہو جائے گی (۳۰/۳۱-۳۲)

یہاں پہنچ کر سلیم! تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ نماز کے نام سے جو کچھ آج مسجدوں میں کیا جاتا ہے کیا اس کی بھی کچھ اصلیت ہے؟ اس کا جواب "ہاں" میں بھی ہے اور "نہیں" میں بھی، تمہیں معلوم ہے کہ فوج کے ایک سپاہی کی ساری کی ساری زندگی سپاہیانہ ہوتی ہے۔ لیکن بایں ہمہ کچھ وقت کے لئے ہر روز ہر سپاہی کو ان فرائض کی یاد دہانی اور مشق کے لئے ایک میدان میں بلا لیا جاتا ہے جو فرائض انہیں میدان جنگ میں ادا کرنے ہوتے ہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ایک نفسیاتی کیفیت (Psychology) افراد کی ہوتی ہے اور ایک اجتماع کی جسے (Mass Psychology) کہا جاتا ہے۔ اجتماع اگرچہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے لیکن اجتماعی نفسیات افراد کی نفسیات سے ایک الگ خصوصیت رکھتی ہے۔ اجتماعی نفسیاتی کیفیت افراد کی نفسیاتی کیفیتوں کا حاصل جمع (Sum total) نہیں ہوتی، اس سے کہیں زیادہ اور منفرد نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ اسلام نے دین کے نظام کی یاد دہانی کے لئے صلوٰۃ کے وقتی اجتماعات کو تجویز کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اجتماعات اس نظام کے لاینفک پرزے ہیں۔ لیکن اگر نظام مفقود ہو اور ہم رسمی طور پر الگ الگ یا مساجد میں جمع ہو کر رکوع اور سجود کر لیا کریں تو اس کی مثال اسی سگنل کے کھمبے یا ریل کی پٹڑی کے ٹکڑے کی سی ہوگی جو ریل بند ہو جانے کے بعد اس بستی میں پڑے ہوئے تھے۔ ذرا سوچو سلیم! ایک سپاہی کے لئے وردی کی چھوٹی چھوٹی جزئیات بھی اہمیت رکھتی ہیں لیکن اگر کوئی سپاہی فوج سے برطرف ہو جانے کے بعد اپنے گاؤں میں ہر روز صبح اُٹھ کر نہایت احتیاط اور انتظام سے اپنے بوٹ کے تسموں سے لے کر سر کی ٹوپی تک ہر شے نہایت باقاعدگی سے پہنے اور بندوق کی جگہ ڈنڈا اٹھا کر چپ راست بھی کرتا رہے تو اس کا

یہ عمل فی ذاتہٖ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کرے گا۔ حالانکہ فوج کے اندر ان میں سے ہر شے مجموعی نتائج مرتب کرنے کے لئے لاینفک تھی۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی بنا پر میں نے کہا ہے کہ نماز کی یہ ظاہری شکل و صورت اپنی اہمیت بھی رکھتی ہے اور نہیں بھی۔ جب یہ نظامِ دین کا جزو بنتی ہے تو اس کی ہر حرکت خاص اہمیت رکھتی ہے اور جب اسے اس نظام سے الگ نکال لیا جاتا ہے تو ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے۔ دین میں یہی اجزاء نظامِ دین کے نتائج مرتب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ لیکن انسانوں کا خودساختہ مذہب انہیں مقصود بالذات قرار دیتا ہے۔

دیکھو سلیم! قرآن نے اس فرق کو کس خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے کہ لیس البرّ ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب یعنی کشادگی یہ راہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ یہ جماعتی نظم پیدا کرنے کا طریقہ ہے جو فی ذاتہٖ کوئی نتیجہ اپنے اندر نہیں رکھتا اس کے بعد فرمایا ولٰکن البرّ" لیکن اصل کشادگی راہ یہ ہے کہ ـــــ اس کے بعد قرآنی نظام کے مختلف اجزاء کو گنایا گیا ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ واقاموالصلوٰۃ واٰتوالزکوٰۃ یعنی یہ ہیں نظامِ دین کے بنیادی عمود یعنی قانون خداوندی سے ہم آہنگی کے ذریعے نفسیاتی تغیر اور ربوبیت عامہ (انسانیت کے نشوونما) کے اسباب و ذرائع کی فراہمی، یہ ہے اصل کشادگی راہ۔ اسکے ساتھ ہی اس اقامتِ صلوٰۃ میں ہر فرد کے رُخ کا ایک خاص سمت کی طرف رکھنا بھی نہایت ضروری قرار دیا گیا (وحیث ما کنتم فولّوا وجوھکم شطرہٗ ۲/۱۴۴) یعنی دین کے پورے نظام میں اپنے افکار و اعمال کا رُخ قانونِ خداوندی کے ساتھ متوازی رکھنا انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰتِ والارض حنیفا اور اس کی ظاہرا شکل میں تمام افرادِ جماعت کا رُخ نظامِ دین کے مرکزِ محسوس کی طرف رکھنا۔ غور کرو سلیم! وہی چیز (یعنی کسی خاص طرف رُخ کرنا) جس کے متعلق ایک جگہ کہا تھا کہ وہ کشادگی راہ نہیں، دوسری جگہ کتنا ضروری قرار پا گیا۔ وہ "مذہب" کی رسم تھی اور یہ دین کا جزو۔ اسی نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قرآن نے دین القیم کہہ کر پکارا ہے جہاں فرمایا وما امروا ـــــ تمہیں اس کے سوا اور کوئی حکم نہیں دیا گیا الا لیعبدوا اللہ بجز اس کے کہ تم صرف قانونِ خداوندی کی محکومی اختیار کرو مخلصین لہ الدین اور اپنا نظامِ زندگی

خالصتہً اس کے قانون کے مطابق متشکل کرو۔ حنفاء ٹھیک ٹھیک اسی کی سیدھ میں اپنا رخ قایم کرو۔ و یقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ یعنی نظام صلوٰۃ کو قائم کرو اور انسانیت کی نشوونما کے اسباب و ذرائع فراہم کرو۔ ذٰلک الدین القیم یہ ہے وہ نظام جو اپنے اندر خود بھی توازن رکھتا ہے اور انسانیت میں توازن قائم کرنے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔

یہ ہے فرق سلیم! "مذہب" کی نماز اور دین کی صلوٰۃ میں۔ "مذہب" کی نماز محض ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے اور دین کی صلوٰۃ انسانیت کے ارتقا کا موجب ہوتی ہے۔

* * *

اب سلیم تمہارا تیسرا سوال سامنے آتا ہے کہ موجودہ حالات میں کیا کیا جائے۔ اس کا جواب بھی مشکل نہیں۔ ہم قرآنی دین سے جس قدر دور ہٹ چکے ہیں اور اس کی جگہ جس طرح انسانی ذہن کے پیدا کردہ اعمال اور افکار نے لے رکھی ہے، اگر ہم میں قرآن اپنی محفوظ شکل میں موجود نہ ہوتا تو یہ تحریف اور فساد کی وہی صورت تھی جس میں ازمنۂ سابقہ میں نبی آیا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں کیونکہ خدا کی کتاب اپنی اصلی صورت میں ہمارے ہاں موجود ہے۔ خالص دین ملنے کے بعد دین کے نظام کو کس طرح متشکل کیا جائے اس چیز کو بھی قرآن کریم نے خود بیان کر دیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب حرا کی تنہائیوں میں حقیقت بے نقاب کر دی گئی اور یہ بتا دیا گیا کہ نوع انسانی کو اپنی نشوونما و ارتقا کے لئے کس قسم کے نظام زندگی کو قائم کرنا ہوگا تو اس کے بعد آپ کو تزمیل کا حکم دیا گیا۔ تم نے سورۂ مزمل کو پڑھا ہے (کسی زمانہ میں تو تم اس کا ورد بھی کیا کرتے تھے) یا ایھا المزمل (کہ جس کے معنی آج کل "اے چادر اوڑھنے والے" کیا جاتا ہے اور کسی کے پلے نہیں پڑتا کہ اس سے بات کیا بنی) اس سے مراد عمل تزمیل میں شدت اختیار کرنے والا ہے۔ اونٹ کے کجاوے میں جو دو سواریاں بیٹھتی ہیں اور جن کے انتخاب میں اس امر کو خصوصیت سے ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ ان سے کجاوے کا توازن قائم رہے انہیں ایک دوسرے کا زمیل کہا جاتا ہے۔ تزمیل کے معنی اسی قسم کے

رفقائے سفر پیدا کرنا ہے اور مزمل اسے کہتے ہیں جو ایسے رفقائے سفر پیدا کرنے میں نہایت شدت انہماک سے مصروفِ سعی و عمل ہو۔ لہٰذا موجودہ فکری انتشار اور قلبی پراگندگی میں پہلا کام تزمیل کا ہے۔ یعنی ایسے رفقائے کار کی تلاش جن میں فکری ہم آہنگی ہو اور وہ اس طرح صعوباتِ سفر میں توازن قائم رکھ سکیں۔ لیکن یہ عمل تزمیل کس قدر ہمت اور حوصلہ چاہتا ہے اسے بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ ذرا غور کرو حقیقت یہ ہے کہ کہنے کو تو آج ہر شخص بطور فیشن مراجعت الی القرآن (Back to the Quran) پکارتا رہتا ہے لیکن جو شخص عملاً قرآن کو سامنے لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اسے سب سے بڑا ملحد اور بے دین قرار دیدیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن موجودہ مذہب کے خلاف اعلانِ جنگ ہے؛ وہ مذہب جو یہود اور نصاریٰ اور مجوس وغیرہ کی سازشوں کا نتیجہ ہے۔ دین سے مقصود انسانی زندگی کی معاشرتی ناہمواریاں (فساد) کو دور کر کے ان کی جگہ ہمواریاں (اصلاح پیدا کرنا تھا۔ مذہب کا کام مفاد پرستی کی پیدا کردہ ناہمواریوں کو مضبوط طور پر قائم رکھنا ہے۔ دین، فکری صلاحیتوں کو ابھارتا ہے، مذہب، انسانی فکر کو معطل کر دیتا ہے۔ دین، زندگی کی مستقل اقدار سامنے لا کر انسانی فکر کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنے حالات اور اپنے زمانہ کے تقاضوں کے پیشِ نظر ان مستقل اقدار کی روشنی میں اپنے لئے آپ جزئیات قانون مرتب کرے۔ مذہب کا یہ دعویٰ ہے کہ جو کچھ ہم جیسے انسانوں نے کبھی سوچا تھا اُس سے ایک قدم اِدھر اُدھر ہٹنا جہنم میں گرنا ہے۔ دین، اپنے نتائج کو اسی دنیا میں سامنے لاتا ہے اور ان نتائج ہی کو اپنی صداقت کی دلیل قرار دیتا ہے۔ مذہب کی رسومات چونکہ کوئی زندہ نتیجہ پیدا کر نہیں سکتیں، اس لئے وہ ان اعمال کو مذہبی بنانے کے لئے یہ دھوکا دیتا ہے کہ اُن کے نتائج اس دنیا میں نہیں نکلیں گے۔ اگلی دنیا میں مرتب ہوں گے۔ دین، زندگی کو مسلسل قرار دیتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کو اپنے آغوش میں لئے رہتی ہے اور جس کی نشوونما کی ابتدا یہیں سے شروع ہو جاتی ہے اور آخرت تک برابر ساتھ چلتی ہے۔ مذہب دنیا سے نفرت سکھاتا ہے تاکہ مفاد پرست گروہ اس پر بے غل و غش قابض رہیں۔ اور عوام رزق کے سرچشموں کو ان مستبدین

کے ہاتھوں سے چھیننے کا تصور بھی نہ لاسکیں۔ دین، صرف خدا کے قانون کی اطاعت سکھاتا ہے، حتیٰ کہ خود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اسی قانون کی اطاعت کو اپنی زندگی کا فریضہ قرار دیتے ہیں۔ مذہب، اشخاص پرستی سکھاتا ہے، کہیں زندہ اشخاص کی اور کہیں مردہ کی۔ چونکہ عوام کی ذہنی سطح محسوسات کی خوگر ہوتی ہے اور تقلیدی اثرات سے اس چیز کو اور بھی پختہ کر دیا جاتا ہے، اس لئے مذہب اپنی مسندوں کو برقرار رکھنے کے لئے عوام کو ہر اس دعوت کے خلاف مشتعل کرتا رہتا ہے جو اشخاص پرستی کے بجائے قانون خداوندی کی اطاعت کی طرف بلائے۔ اس قسم کے حالات میں، جسے قرآن نے "خشکی اور تری میں فساد" سے تعبیر کیا ہے، خالص قانون خداوندی کی طرف دعوت بڑا صبر آزما مرحلہ ہے۔ لیکن سہل یا دشوار، راستہ بہرحال یہی ہے۔ اس سفر کے پروگرام میں پہلا مرحلہ تزمیل ہے۔

جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، یہ مرحلہ بڑا صبر طلب ہے (صبر کے معنی استقامت ہیں) عاجلہ مفاد پرستی کے پروگرام اپنے نتائج فوراً سامنے لے آتے ہیں اس لئے ایسے پروگراموں کی کامیابی بڑی آسان ہوتی ہے اگرچہ وہ رہتی بھی ہے چند ہی روز۔ لیکن مستقل اقدار کے تابع نظام زندگی کا قیام اپنے نتائج بہت دیر میں سامنے لاتا ہے۔ خود اس پروگرام کے دور اول پر غور کرو۔ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم جیسی اولوالعزم اور بلند سیرت شخصیت ہے جو اس نظام کی طرف دعوت دیتی ہے۔ نبوت کے بعد سے آپ کا عرصہ حیات .... (آپ کی طبعی زندگی کے اعتبار سے) کل ۲۳ سال ہے۔ اس ۲۳ سال کو قیامت تک کے زمانہ تک پھیلاؤ۔ ایک ایک سانس میں صدیاں سمٹی ہوئی ملیں گی۔ اس ۲۳ سال کی قلیل مدت میں سے ابتدائی ۱۳ برس کا عرصہ اسی تزمیل میں گزر گیا۔ آہستہ آہستہ، بتدریج، ایک، ایک دو دو کر کے تین چار سو کے قریب رفقائے سفر میسر آئے۔ اس مرحلے میں وقت اور کوشش تو بہت صرف ہوئی لیکن جو رفقائے سفر میسر آئے ان کی ایک ایک جست نے صدیوں کی مسافتیں آنکھ جھپکنے میں طے کر لیں۔ اس عمل تزمیل کے دوران میں نہ کسی سے ٹکراؤ ہوتا ہے نہ تصادم۔ نگاہ صرف اس مقصد پر مرکوز رہتی ہے کہ انسانوں کے اس انبوہ میں سے ہر وہ

فرد جس میں اس نظام کے قبول کرنے اور اسے قائم رکھنے کی صلاحیت موجود ہے، وہ ان ریت کے تودوں سے الگ ہو کر اپنی طرف آ جائے تاکہ (قرآن کے الفاظ میں) کوئی ایک فرد بھی نادانستہ ہلاک نہ ہونے پائے۔ دیکھو سلیم! کتنی بڑی ذمہ داری ہے اس نظام کی طرف دعوت دینے والے پر! اسے تمام تکالیف اور مصائب نہایت ہمت سے برداشت کرنے ہوں گے تاکہ کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ رہنے پائے جس میں اس نظام کے قبول و قیام کی صلاحیت ہو اور وہ اس وجہ سے ہلاک ہو جائے کہ اسے دوسرے انسانوں کے ہجوم سے الگ ہونے کا موقع نہ ملا تھا۔ ایسے صلاحیت رکھنے والے افراد کی تلاش کرنا، پھر اُن کے ذہنوں میں جو غلط نقوش مستولی ہوں انہیں صاف کر کے ان کی نکھری ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور اس میں کسی قسم کے جبر اور اکراہ کو کام میں نہ لانا، یہ ہے سب سے پہلا کام جس سے زمیں اکھٹے ہوتے ہیں۔ اس کا عملی طریقہ یہی ہے کہ خالص قرآنی فکر کو عام کیا جائے اور جو لوگ اس فکر کو اپنے اندر زندہ محسوس کریں وہ ایک مرکز پر آتے چلے جائیں۔ اس فکری ہم آہنگی کے بعد اگلا قدم ہوگا خود اس جماعت کے اندر عملی ربوبیت کا قیام، اور یہی ربوبیت پھر پھیلتی ہوئی آگے بڑھتی جائے گی۔ جو مفاد پرستانہ موانع اس کے آگے بڑھنے میں حائل ہوں گے انہیں راستہ سے ہٹانا ضروری ہوگا۔ اس ربوبیت سے جس میں ہر فرد کی انسانی صلاحیتوں کا نشوونما اس نظام کے ذمہ ہوگا" انسانیت کی سطح بلند ہوتی چلی جائے گی اور ہر آنے والی نسل اپنی سابقہ نسل سے کہیں آگے ہوگی۔ تاآنکہ انسانیت خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی اور "انسان کی معاشرتی زندگی اپنے نشوونما دینے والے کے قانون کی روشنی سے جگمگا اٹھے گی۔" جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، جسے آج روٹی کا مسئلہ کہا جاتا ہے اور جو ہماری موجودہ معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے اس قدر اہمیت اختیار کر چکا ہے، وہ تو اس نظام ربوبیت کی تمہیدی منزل ہے جس میں رزق کے سرچشمے افراد کی بجائے نظام کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس نظام کے ہاتھ میں جس کی بنیاد وحدتِ خالق (یعنی مبداء قانون ربوبیت) اور وحدتِ خلق (یعنی وحدتِ حیات) کے غیر متبدل قانون پر ہوتی ہے۔

سلیم! تمہارے ذمہ یہ کام ہے کہ قرآن کے جس جس گوشے کو تم سمجھ چکے ہو اسے آگے پھیلاتے چلے جاؤ اور باقی حصوں کے سمجھنے میں جو جو دشواریاں پیش آئیں اُن کا حل طلب کرتے رہو۔ اور اس سے مایوس مت ہو کہ مفاد پرست پارٹیاں کیا کچھ کر رہی ہیں۔

* * *

اب رہا تمہارا یہ سوال کہ خدا پر ایمان کے بغیر محض اخلاقی ضابطوں پر کسی نظام کی بنیاد کیوں نہیں رکھی جاسکتی۔ سو اس کے جواب کے لیئے دوسرے خط کا انتظار کرو۔ جس میں یہ بتاؤں گا کہ خدا پر ایمان کے بغیر اخلاق کا تصور ہی ناممکن ہے۔ لیکن خدا سے مراد قرآنی خدا ہے نہ کہ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ بت۔ وہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکے گی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ ہماری موجودہ پستی کی وجہ ہماری کمزوریٔ ایمان ہے تو اس کا صحیح مفہوم کیا ہوتا ہے؟

اب میں تھک گیا۔ خدا حافظ۔

والسلام
اگست ۱۹۵۰ء

سلیم کے نام چودھواں خط

(۱) کیریکٹر کیسے پیدا ہوا؟

(۲) ختمِ نبوت کا مفہوم

سلیم! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تمہارے ذہن پر غالبؔ چھا رہا ہے۔ تمہارے اس اندازِ نگارش نے مجھے بھی ان بھولی بسری وادیوں کی یاد پھر سے تازہ کرادی۔ ہر چند ہمارے شعرا کے ہاں حقائق سے زیادہ لطائف ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں غالبؔ اپنی شانِ انفرادیت سے بالکل الگ نظر آتا ہے۔ جس شعر کے متعلق تم نے پوچھا ہے، وہ یوں ہے:۔

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

غور کرو کہ میرزا کیا کہہ گیا ہے اور کس انداز سے کہہ گیا ہے؟ سچ کہا تھا اس نے کہ

گر عشق نہ بودے و غمِ عشق نہ بودے
ایں ہا سخنِ نغز کہ گفتے کہ شنودے

اس باب میں میری کیا پوچھتے ہو۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہ گذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

ہٹاؤ ان قصوں کو اور اپنے خط کا جواب سنو۔

⁂

سلیم! مجھے تمہاری بیتابیٔ تمنا کا احساس ہے۔ لیکن تم بھی ذرا صبر طلبیٔ عشق پر نگاہ رکھا کرو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری کیفیت اب یہ ہو چکی ہے کہ ـــ نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے۔ لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

جب تک افکار میں پختگی نہ آجائے، مقام دعوت و عزیمت کا قصد یا آرزو، خیالِ خام ہی نہیں بلکہ حیات نمائی اور ہلاکت فروشی ہے اور پختگیٔ افکار ناممکن ہے۔ جب تک فکر کی ہر افتاد اس سرچشمۂ علم و یقین سے ہم آہنگ و یک رنگ نہ ہو جائے جس میں شکوک و اضطراب کو کوئی دخل نہیں اور جس کا آغازِ سخن لاریب فیہ کے زلزلہ انگیز و کوہ تمثال دعویٰ حقیقت کشا سے ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا تم نے نام لیا ہے ان کی تحریروں کا مسلسل مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ ان میں کس قدر تضاد اور کیسا تخالف ہے، اس لئے کہ ان کا نقطۂ پرکار فکر، علم خداوندی نہیں بلکہ اپنے امیال و عواطف یا وراثتی نقوش و خطوط ہیں۔ ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو اپنی مصلحت کوشیوں کے پیش نظر دیدہ و دانستہ ساحرین کی رسیوں کو موسیٰ کا اژدہا بنا کر دکھاتے ہیں تاکہ ان شعبدہ بازیوں اور فسوں سازیوں سے عوام کی نگاہوں میں واجب التکریم بن جائیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جو اس موج سراب کو سچ مچ چشمۂ حیوان سمجھ کر خود بھی فریب نفس میں مبتلا ہیں اور دوسروں کو بھی اس داستاں گوئی سے آسودۂ خواب رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن طائفۂ اول ہو یا گروہ ثانی، ملت کے حق میں دونوں زہر ہلاہل ہیں۔

اسی فریب خوردگی کا نتیجہ ہے کہ وہی مسلمان جس کی محفلِ حیات کا کبھی یہ عالم تھا کہ ع

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب

اب اس کی ہر جگہ یہ کیفیت ہے کہ

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال

تمہارے استفسار کا تجزیہ کیا جائے تو وہ اُس سوال کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کی رو سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ مرغی پہلے تھی یا انڈا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اگر تم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو تو مرغی اور انڈے کے اس پریشان کن دائرے سے نکل جانا مشکل نہ ہوگا۔ تم کہتے ہو کہ اسلامی نظام ان لوگوں کے ہاتھوں چل سکتا ہے جن میں کیرکٹر ہو اور کیرکٹر والے لوگ آج موجود نہیں۔ انہیں اسلامی نظام ہی پیدا کرے گا۔ اس لئے آغازِ کار کس طرح کیا جائے!

پہلے یہ دیکھو کہ کیرکٹر سے مراد کیا ہے؟ کیرکٹر ایک وسیع المفہوم اصطلاح ہے جس کے متعدد گوشے ہیں۔ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ اسلامی نظامِ مملکت کے لئے جس کیرکٹر کی ضرورت ہے، آج وہ ناپید ہے تو اس سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں خود غرضی اور بددیانتی اس قدر عام ہے کہ متاعِ ملّت کسی کی امانت میں نہیں دی جا سکتی۔

اب سوچئے کہ خود غرضی سے مفہوم کیا ہے اور یہ کیوں پیدا ہوتی ہے؟ خود غرضی سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد دوسروں کے مفاد پر اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ مفادِ کُلی کو انفرادی مفاد پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ قومی زندگی میں اسی کا نام فقدانِ کیرکٹر (Characterlessness) ہے۔ پھر سنئے! عدمِ کیرکٹر سے مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کی فکر کرتا ہے اور مفادِ کُلّی کی قطعاً پروا نہیں کرتا۔ (اس فقرہ کے ایک ایک لفظ کو سلیم! الگ الگ دہراؤ۔ پھر بات ذہن نشین ہو سکے گی)

اب دیکھئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ تم جانتے ہو کہ حفاظتِ نفس (Preservation of Self

عقل کا تقاضا ہے۔ اس کا فریضہ ہی یہ ہے کہ یہ اس فرد کی ذات کا تحفظ کرے جس کی یہ عقل ہے، اور چونکہ عقل ہر فرد کی الگ الگ ہوتی ہے اس لئے ہر عقل کا فریضہ "اپنے فرد" کی ذات کا تحفظ ہے۔ اسی کا نام انفرادیت ہے اور اسی وجہ سے خود غرضی (Selfishness) ہر انفرادی عقل کا تقاضا ہے۔ عقل ہی نہیں بلکہ یہ تو جبلت (Instinct) کا تقاضا ہے۔ اس لئے انسان اور حیوان دونوں میں مشترک ہے۔ ہر حیوان اپنی ذات کے تحفظ کے لئے چارہ جوئی کرتا ہے۔ ایک خوردبینی جرثومے سے لے کر عظیم الجثہ ہاتھی تک، ہر ذی حیات بقائے ذات کی فکر میں مضطرب و بیتاب دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حیوانات اور انسان میں ایک نمایاں فرق ہے جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی لکھا تھا، تم نے اپنے ہاں گائے کو دیکھا ہوگا۔ جب وہ بھوکی ہو اور اس کے سامنے چارہ ڈال دیا جائے تو وہ دوسری گائے کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ لیکن جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکتی ہے تو نہایت اطمینان سے بیٹھ کر جگالی کرنے لگ جاتی ہے اور اس کی پروا تک نہیں کرتی کہ باقی ماندہ چارہ محفوظ رکھا ہے یا نہیں۔ یعنی اسے اپنی موجودہ بھوک کی فکر ہوتی ہے، مستقبل کی فکر نہیں ہوتی (اس میں شبہ نہیں کہ بعض حیوانات، چیونٹیاں، مکوڑے، وغیرہ مستقبل کے لئے بھی ذخیرہ جمع کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ عمل اجتماعی ہوتا ہے، انفرادی نہیں (یعنی ان کی اجتماعی جبلت اس قسم کی واقع ہوئی ہے، انفرادی عقل نہیں، لیکن انسانی عقل، حال کی حفاظت سے مطمئن نہیں ہوتی بلکہ مستقبل کی صیانت کے بھی درپے رہتی ہے۔

سلیم! ذرا سوچو کہ انسان کو "مستقبل کی فکر" کیوں پیدا ہوتی ہے؟ تم بادنیٰ تعمق اس نتیجہ تک پہنچ سکو گے کہ اس فکر اور پریشانی کا محرک جذبہ احتیاج کا خوف ہے۔ یعنی ہر فرد کو خوف دامنگیر رہتا ہے کہ اگر میرے پاس کل کے لئے کھانے کو نہ ہوا تو میں کیا کروں گا۔ اس خوف کی وجہ سے ہر فرد کی عقل اسے اکساتی ہے کہ وہ کل کی فکر بھی آج ہی کر لے۔ اور چونکہ انسانی زندگی کا کل (Future) غیر متعین ہے (کیونکہ کسی کو موت کے وقت کا علم نہیں)، اس لئے ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لے

تاکہ وہ کل کی احتیاج کے خوف سے مامون ہو جائے۔ یہ ہے وہ جذبہ جس کے ماتحت ہر فرد اپنے لئے زیادہ سے زیادہ اکٹھا کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ اسی کا نام خود غرضی ہے۔ جب ہر فرد اپنی اپنی فکر میں پریشان ہو تو سلیم! جانتے ہو کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب پولیس کسی مجمع پر لاٹھی چارج کرتی ہے تو ہر شخص اپنے آپ کو بچانے کے لئے بھاگ اٹھتا ہے اور اس افراتفری (نفسا نفسی) میں ہوتا یہ ہے کہ جو شخص کہیں گر گیا کچلا گیا۔ اسے بھاگڑ مچنا کہتے ہیں۔ مجھے یاد آ گیا۔ تم نے خود ہی تو سنایا تھا کہ جب میونسپل ہال کے جلسہ میں پٹاخے کی آواز آئی تھی تو لوگ کس طرح اپنی اپنی جان کی فکر میں بدحواس ہو کر بھاگ اٹھے تھے اور اس بھگدڑ میں کتنے لوگ پاؤں تلے روندے گئے تھے۔ خود لاہور کی شاہی مسجد میں کتنے لوگ عید کی نماز کے "ہجوم مومنین[1]" میں پس کر مر گئے تھے۔ جس طرح ایسے مجمعوں میں بھاگڑ مچتی ہے، اسی طرح جب کسی معاشرے میں ہر فرد اپنی اپنی حفاظت کی فکر میں مصروف تگ و تاز ہو جائے تو اس معاشرے کا توازن بگڑ جاتا ہے، اور اس میں اس طرح کھلبلی مچ جاتی ہے کہ جو کمزور نیچے گرتا ہے وہ کچلا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ معاشرہ جس میں کہا جاتا ہے کہ لوگوں میں کیرکٹر نہیں رہا، ہر شخص دوسرے کو لوٹنے کی فکر میں ہے۔

اب سمجھ لیا تم نے سلیم! کہ کیرکٹر کے فقدان کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کی علت کیا ہے؟ کیرکٹر کی کمزوری کے معنی ہیں خود غرضی اور خود غرضی کا محرک جذبہ ہوتا ہے احتیاج کا خوف۔ یعنی یہ اندیشہ کہ اگر میرے پاس کچھ نہ رہا تو کل میرا یا میری اولاد کا کیا حشر ہوگا؟ اس میں شبہ نہیں کہ کیرکٹر کی کمزوری کے بعض اور پہلو بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ہوسِ اقتدار وغیرہ۔ لیکن اگر تم غور سے دیکھو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ بنیادی چیز وہی "احتیاج کا خوف" ہے۔ ہوسِ اقتدار بھی غیر شعوری طور پر اسی خوف احتیاج کی بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ یعنی انسان احتیاج سے مامون ہونے کے لئے اِدھر اُدھر سے سمیٹنے کی فکر کرتا ہے اور پھر اس سمیٹے ہوئے کی حفاظت کے لئے اقتدار کے قلعے بناتا ہے۔ سو وہ علت اولیٰ جو انسانی معاشرے میں بھاگڑ مچا دیتی ہے

---

[1] عید آزاداں شکوہ ملک و دیں
عید محکوماں ہجومِ مومنیں

ہر فرد کے دل میں احتیاج کے خوف سے مصئونیت Security کی فکر ہے۔ اور جس طرح ہر بھاگڑ میں، ہر فرد اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوتا ہے اور اس فکر میں اس قدر بدحواس ہو جاتا ہے کہ اتنا بھی خیال نہیں کرتا کہ جو گر پڑا ہے اسے روند کر تو آگے نہ بڑھے، اسی طرح معاشرے کی اس توازن شکن بھاگڑ میں ہر فرد اپنے مفاد کے تحفظ میں مضطرب و پریشان رہتا ہے کسی دوسرے کے مفاد کا قطعاً خیال نہیں کرتا۔ یہی کچھ افراد سے آگے بڑھ کر مختلف اقوام میں ہو جاتا ہے۔ یعنی ہر فرد کی طرح ہر قوم اپنے مفاد کی فکر میں رہتی ہے۔ دوسری قوم کے مفاد کا کوئی خیال نہیں کرتی۔

لیجئے، سلیم! مرض کی تشخیص تو ہو گئی۔ یعنی

(۱) تحفظ ذات عقل کا فریضہ ہے۔

(۲) عقل اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں ہر وقت ایسے اسباب کی فکر کرتی رہتی ہے جن سے اس فرد متعلقہ کی حفاظت ہو جائے۔

(۳) انسان، عام حیوانات کی طرح، اپنی وقتی حفاظت پر ہی قانع نہیں ہو جاتا بلکہ مستقبل کی حفاظت بھی چاہتا ہے۔

(۴) اس حفاظت کے لئے اسے ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ اگر میں کل کو محتاج ہو گیا تو میرا یا میری اولاد کا کیا بنے گا۔

(۵) احتیاج کی یہ فکر اسے ہر وقت مضطرب و پریشان رکھتی ہے اور اس طرح ہر فرد اپنے اپنے مفاد کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے اور اس دوڑ میں کسی دوسرے کے مفاد کا قطعاً خیال نہیں کرتا۔

(۶) اسی کا نام خود غرضی اور کیریکٹر کا فقدان ہے۔

اب آؤ اس کے علاج کی طرف۔

علت مرض ہے احتیاج کا خوف۔ لہٰذا مرض کا علاج ہو گا اس خوف کا دل سے نکال دینا۔ سوال یہ ہے کہ یہ خوف دل سے نکالا کس طرح جا سکتا ہے۔

اگر ہر فرد کو اس امر کا پورا پورا یقین ہو جائے کہ اس کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہ سکتی، اس کو کوئی احتیاج ستا نہیں سکتی، وہ کبھی بھوکا نہیں مر سکتا اس کی اولاد کسی حالت میں بھی بےکس و بےبس نہیں رہ سکتی۔ یعنی اسے اس امر کا یقین ہو کہ اس کی اور اس کی اولاد کی تمام ضروریات زندگی کا سامان موجود ہے، تو اس کے دل سے احتیاج کا خوف نکل جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ جس شخص نے زندگی کا بیمہ کرا رکھا ہو وہ کس قدر مطمئن ہوتا ہے۔ یزدانی کو دیکھو کس طرح موت کو آوازیں دیتا پھرتا ہے۔ زندگی تو ایک طرف، جس دن سے ملک نے دکان کا بیمہ کرایا ہے، گھوڑے بیچ کر سوتا ہے، ورنہ اس سے پہلے چار میل پر فائر بریگیڈ کی گھنٹی اس کے ہوش و حواس گم کر دیا کرتی تھی لہٰذا جب کسی فرد کے دل سے فکرِ احتیاج نکل جائے تو اس میں خود غرضی نہیں رہتی؛ اور جب خود غرضی نہ رہے تو خود بخود کیرکٹر پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن وہ یقین کس طرح سے پیدا کیا جائے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یعنی ہر فرد کے دل میں اس امر کا یقین کہ اس کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہ سکتی وہ اور اس کی اولاد کبھی بھوکی نہیں مر سکتی۔

یہ پیدا ہو گا اللہ پر ایمان لانے سے، اسے رازق ماننے سے، اس پر توکل کرنے سے، اس امر پر یقین رکھنے سے کہ ہر فرد کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے اپنے سر لے رکھی ہے۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور تمہاری اس ہنسی کی آواز گویا تصور سے سن رہا ہوں؛ جو ان فقروں سے بےساختہ تمہارے لب پر آ جائے گی۔ میں خود تمہاری اس ہنسی میں شریک ہوں۔

تم کہو گے کہ میں کیسی پہیلیاں کہہ رہا ہوں۔ یعنی ایک طرف تو یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ یقین پیدا ہو گا اللہ کی رزاقیت کے ایمان سے اور دوسری طرف یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ یہ باتیں ایسی ہیں جن سے بےساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔ لیکن یہ پہیلیاں نہیں۔ ذرا سمجھنے کی کوشش کرو تو بات بالکل صاف ہے، ان الفاظ کا ایک مفہوم وہ ہے جو مُلّا کے مذہب نے تمہارے ذہن میں مرتسم کر رکھا ہے، وہ مفہوم فی الواقعہ ایسا ہے جس سے بےساختہ ہنسی آ جاتی ہے — لیکن ان ہی الفاظ کا ایک مفہوم وہ ہے جو خود ان الفاظ کے "مصنف" نے متعین کیا ہے۔ وہ مفہوم درحقیقت وہ

یقین پیدا کر سکتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ مذہب نے جس خدا کو کائنات سے ماورا عرش پر بٹھا رکھا ہے وہ واقعی کسی انسان کے رزق کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اس کے رزاق ہونے کے دعوے کے باوجود، اس کی خدائی میں کروڑوں بندے بھوک کے سوتے اور لاکھوں انسان فاقوں سے مرتے ہیں اس کے اس بلند آہنگ اعلان کے باوجود کہ وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا (۱۱/۶) زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو) آج آدھی دنیا کو پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہیں ہو رہی۔ لہٰذا انسانوں کے خودساختہ مذہب کے پیدا کردہ "خدا" پر ایمان لانے اور اس کے دعاوی پر توکل رکھنے سے وہ یقین کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتا جو انسان کو احتیاج کی فکر سے بے خوف کر دے۔ یہی وہ "خدا" تھا جس کے متعلق مارکس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا تصور سرمایہ داروں کی مصلحت کوشیوں کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن خدا کے تصور کا ایک مفہوم وہ ہے جسے خود خدا نے متعین کیا ہے اور جو سلیم! قرآن کے حروف و نقوش میں جگمگ جگمگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس تصور کی رو سے ان مقامات پر خدا سے مفہوم ہے وہ نظام جو اس کے متعین فرمودہ ابدی قوانین کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔

سلیم! اس کا تو علم نہیں کہ تکوینی دنیا میں خدا کی رزاقیت کا نظام کیا ہے۔ تم اپنی نانی اماں کی زبان میں یوں سمجھو کہ ہم نہیں جانتے کہ وہ "پتھر میں کیڑے" کو کس طرح روزی پہنچاتا ہے، لیکن انسانی دنیا میں اس کا دعوئے رزاقیت و ربوبیت اس نظام کی رو سے پورا ہوتا ہے جو اس کے قوانین کی بنیادوں پر خود انسانوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں مشیت خداوندی کی تکمیل، انسانوں ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ لہٰذا جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر ایک کا رزق اللہ کے ذمے ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ نظام جو قوانین خداوندی کی رو سے قائم ہو، تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔ یہ ہے وہ نظام جس پر پورا پورا توکل (بھروسہ) کیا جا سکتا ہے۔ اور یہی ہے وہ نظام جو انسان کے اندر اس امر کا یقین پیدا کر سکتا ہے کہ میں بھوکا نہیں مر سکتا۔ میری اولاد تباہ نہیں ہو سکتی۔ اس نظام میں انسان احتیاج کی فکر سے بے خوف ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کی خصوصیت کبریٰ ہی یہ بتائی گئی ہے کہ اس کی ذمہ داری میں آجانے والوں کی کیفیت یہ ہوگی کہ

لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون انہیں نہ کسی قسم کا خوف رہے گا۔ نہ انہیں احتیاج کی فکر ستائے گی۔ "خافۃ" اس جبے کو کہتے ہیں جسے چھتے میں سے شہد نکالنے والے پہن لیتے ہیں تاکہ شہد مل جائے اور مکھیوں کے کاٹنے کا ڈر نہ ہو، اسی نظام سے انسان کی دنیا اس جنت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے متعلق ابن آدم سے کہا گیا تھا کہ ان لک الا تجوع فیھا ولا تعریٰ وانک لا تظمؤا فیھا ولا تضحیٰ (۲۰/۱۱۸) اس میں نہ تو بھوکا رہے گا نہ ننگا۔ نہ پیاسا رہے گا۔ نہ بلا مکان کے، دھوپ میں۔ اور یہ جنت بنے گی کس طرح سے؟ فاما یاتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلا یضل ولا یشقیٰ (۲۰/۱۲۳) ہماری طرف سے راہنمائی کے قوانین ملیں گے۔ سو جو ان قوانین کی اتباع کرے گا تو نہ اس کی کوششیں بے نتیجہ رہیں گی اور نہ اسے بھوک، لباس اور سردی گرمی کی تکالیف اٹھانی پڑیں گی۔ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون انہیں احتیاج کا خوف دامنگیر نہیں ہوگا۔

سلیم، تم پہلے دیکھ چکے ہو کہ خود غرضی کا بنیادی سبب احتیاج کا خوف تھا اور اس خوف سے نجات کا ذریعہ اس نظام ربوبیت کا قیام ہے جو ہر فرد کی ضروریات زندگی کا کفیل ہوتا ہے۔ بلکہ اس میں کسی فرد کے دل میں احتیاج کا خوف پیدا ہی نہیں ہوتا اور جب انسان احتیاج کی طرف سے مامون ہو جاتا ہے تو خود غرضی باقی نہیں رہتی۔ اور جب خود غرضی باقی نہیں رہتی تو کیرکٹر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اب سمجھے سلیم! کہ ہم میں آج کیرکٹر کیوں نہیں اور کیرکٹر پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ نظام ربوبیت کا قیام ان لوگوں کے ہاتھوں سے ممکن ہے جو کیرکٹر والے ہوں، اور چونکہ آج ہم میں کیرکٹر نہیں، اس لئے اس نظام کا قیام ناممکن ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ تم اس نظام کی ابتدا کردو، کیرکٹر اس کے پیچھے پیچھے چلا آئے گا۔ تم خدا کی ربوبیت کو عام ہونے دو، پھر دیکھو کہ کس طرح

ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ، دریا آشنا

کا منظر تمہارے سامنے آجاتا ہے اور ان ہی افراد کی سیرت میں کس قدر بلندیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس نظام کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے اور شعور کی یہ بیداری، فکر و نظر کی یہ تبدیلی، اس نظام کے تصور کے عام کرنے اور اس کے درخشندہ اور تابناک نتائج کو نگۂ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔ اس کا نام

تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ نبی اکرمؐ نے اسی نقطہ سے آغاز کار کیا ویعلمھم الکتاب والحکمۃ یعنی اس قانون ابدی کی تعلیم اور اس کی حکمت اور لم کی تفہیم (اس امر کی تعلیم کہ یہ قانون کیا ہے اور اسے کیوں رائج کرنا ضروری ہے) کتاب قانون کو کہتے ہیں اور حکمت ہوتی ہے (The Why of it) اس تصور کو عام کرنے سے ایسے سعید فطرت لوگ نتھر کر الگ ہو جاتے ہیں، جن کی نگاہوں میں کشادگی اور قلب میں وسعت کی استعداد ہوتی ہے۔ اسی کا نام نفس کی بالیدگی (تزکیہ) ہے۔ اور تعلیم کتاب وحکمت کے ساتھ اس کا چولی دامن کا تعلق ہے ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ اب یہاں سے سلیم! ایک دوسرا نقطہ شروع ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس تعلیم سے کونسی حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے جس سے انسان کی نگاہوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور وہ ذاتی مفاد کی تنگ وادیوں سے نکل کر اجتماعی مفاد کی اس جنت میں جا پہنچتا ہے جس کے متعلق فرمایا کہ عرضھا السمٰوٰت والارض (۳/۱۳۳) "اس کی وسعت تمام ارض وسما کو محیط ہے۔" یہ بات ذرا غور سے سمجھنے کی ہے۔ جب بات چھیڑ دیتے ہو تو اسے پوری طرح سمجھ بھی لیا کرو۔

تم دیکھ چکے ہو کہ ہر فرد کی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس فرد کی ذات کا تحفظ کرے۔ اس لئے ہر فرد اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے اور کسی اور کو اس مفاد میں شریک نہیں کرتا۔ لیکن (جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں) ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک باپ اپنے مفاد کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اپنی اولاد کو بھی اس میں شریک کر لیتا ہے۔ یہ شراکت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اس کا اپنا مفاد، اس کی اولاد ہی کا مفاد بن جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اپنی اولاد کے لئے کرتا ہے۔ اسے اپنے مستقبل کی فکر اس قدر نہیں ہوتی جس قدر اولاد کے مستقبل کی ہوتی ہے۔ اسے ہر وقت یہی اندیشہ ستاتا رہتا ہے کہ اگر میری موت بے وقت ہو گئی تو میری اولاد کا کیا بنے گا۔ تم نے سلیم! غور کیا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے! وہی عقل جس کا فریضہ اس فرد متعلقہ کا تحفظِ ذات تھا "ان ماورائے ذات" افراد کی حفاظت تمنّی کے لئے اس درجہ مشوش و پریشان کیوں ہو گئی؟ اس لئے کہ یہ شخص (باپ) ان ماورائے خویش افراد (یعنی اولاد) کو خود اپنی ذات ہی کا جزو سمجھتا ہے۔ وہ ان میں اور اپنے آپ میں کچھ فرق نہیں کرتا۔ یہی جذبہ ہے جس کے تحت

گھر (Home) کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ عائلی زندگی کی اساس (بنیاد) یہی ہے۔ اس زندگی کی ابتدا ہوتی ہے ایک عہدی رشتے سے۔ یعنی ایک مرد اور ایک عورت اپنے گھر کی نئی دنیا بسانے کا عہد کرتے ہیں اور اس عہد سے ایک نیا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اس کے بعد اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں اپنی اولاد کو خود اپنی ذات کا جزو سمجھتے ہیں۔ اس طرح، "گھر" ایک ایسی وحدت (Unit) بن جاتا ہے جس میں انفرادی مفاد، اجتماعی مفاد میں گم ہو جاتا ہے۔ اس سے، اس فردِ متعلقہ (باپ) کی نگاہوں میں اتنی کشاد اور قلب میں ایسی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ ایک حد تک بیرونِ خویش مفاد کو بھی اپنی ذات کا مفاد سمجھنے لگ جاتا ہے۔ اس وسعت و کشائش سے انفرادیت کی، بہت سی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ تم ایسے افراد کی سیرت کا مطالعہ کرو جو تجرد کی زندگی بسر کرتے ہیں، یوگ اور سنیاس کے تجرد کی زندگی نہیں۔ بلکہ اس تجرد کی زندگی جس کے متعلق اکبر نے کہا ہے ؎

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

تم دیکھو گے کہ اس یکسر انفرادیت کی زندگی میں انسان کی سیرت کے بہت سے گوشے بحرِ بیکراں ہونے کی بجائے گھٹ گھٹ کر جوئے کم آب بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ کچھ مشینی قسم کے انسان بن جاتے ہیں۔ دلی کی..... کرخنداری زبان میں یوں سمجھ لو کہ یہ "ایک دم لٹھ ہوتے ہیں لٹھ"۔ یعنی ان میں زندگی کی لوچ نہیں ہوتی۔

لیکن باپ اور اولاد کا یہ تعلق علم کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ جس باپ کو معلوم نہ ہو کہ فلاں لڑکا اس کا بیٹا ہے وہ اسے کبھی اپنی ذات کا جزو نہیں سمجھتا۔ تم نے رستم و افراسیاب کا قصہ پڑھا ہوگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ ان میں باپ اور بیٹے کا رشتہ ہے۔ لیکن جوں ہی ان پر یہ راز کھل گیا، دونوں اپنی اپنی جگہ پر رک گئے۔ لہذا اشتراکِ مفاد کے لئے اس امر کا ذہن نشین کرانا ضروری ہے کہ وہ افراد خود اس شخص کی ذات کا جزو ہیں۔ قرآن اس احساس کی بیداری (یا تعلیم) کی ابتدا عائلی زندگی کی اہمیت کو سامنے لانے سے کرتا ہے۔ تم قرآن کے مختلف اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ عائلی زندگی

(Family Life) کی ضرورت اور اہمیت کو کس طرح مختلف اسالیب اور متنوع انداز سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کو ابھار کر سامنے لانا ہے کہ ایک فرد کے مفاد اس کی اپنی ذات تک ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ اس میں اور بھی شریک ہوتے ہیں۔ اس احساس سے انسان کی تربیتِ ذات کی ابتدا ہوتی ہے۔ عائلی زندگی کے اس نقطۂ آغاز سے قرآن بتدریج آگے بڑھتا ہے اور ان دیواروں کو ایک ایک کر کے توڑتا جاتا ہے جنہوں نے انسان کو محدود چاردیواری کے اندر محبوس کر رکھا ہے۔ جوں جوں یہ دیواریں ٹوٹتی ہیں اس کی افقِ نگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ آخرالامر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ خلقکم من نفس واحدۃ تمام نوعِ انسانی کی تخلیقی اصل ایک ہے۔ یعنی جس رشتہ (ایک اصل کی شاخیں ہونے کے احساس) نے باپ اور بیٹے میں اشتراکِ مفاد پیدا کر دیا تھا، قرآن اسی رشتہ کو تمام انسانوں میں مشترک قرار دیتا ہے اور اس طرح "عقلِ خود بیں" کو "عقلِ جہاں بیں" میں تبدیل کر دیتا، اور نفسِ انسانی سے انفرادیت کی گرہیں کھول کھول کر اسے انسانیت کی

؎ معلوم نہیں، سلیم، تم نے اقبال کا مطالعہ بالالتزام شروع کیا ہے یا نہیں۔ اگر اب تک نہیں کیا تو یقین مانو کہ تم نے زندگی کا اتنا قیمتی حصہ ضائع کر دیا۔ پیامِ مشرق میں دیکھو کہ وہ اہلِ فرنگ کو (جنہوں نے یکسر انفرادیت کی زندگی اختیار کر رکھی ہے اور رفتہ رفتہ عائلی زندگی تک کو بھی ترک کرتے جا رہے ہیں) مخاطب کر کے کیا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است　　　بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم دارد　　　نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم دارد

اور جاوید نامہ میں بتلاتے ہیں کہ عقلِ خود بیں اور عقلِ جہاں بیں (وحی کی عطا فرمودہ بصیرت) میں فرق کیا ہے۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی کا نام کیرکٹر ہے۔

وسعتیں عطا کر دیتا ہے۔ اس طریقِ کار کا نام ہے "تعلیم کتاب و حکمت"، اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے نفسِ انسانی کی نشو ونما یعنی تزکیۂ نفس۔ ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم اس طریقِ تعلیم (تصورِ ربوبیت کے عام کرنے) سے معاشرے میں ایسے افراد نکھر کر الگ ہو جاتے ہیں جن پر اس نظام کی اہمیت واشگاف ہو جاتی ہے۔ ان افراد کے ہاتھوں اس نظام کی ابتدا ہوتی ہے جس میں ہر فرد فکرِ احتیاج سے بے خوف ہو جاتا ہے اور جب یہ نظام قائم ہو جاتا ہے تو پورے معاشرے میں اس کیرکٹر کی لہر دوڑ جاتی ہے جس کے فقدان کا رونا ہم آج اس طرح روتے ہیں۔ جب تک یہ نظام قائم رہتا ہے کیرکٹر بھی قائم رہتا ہے۔ جب یہ نظام بگڑ جاتا ہے تو پھر وہی انفرادیت کی بھاگڑ شروع ہو جاتی ہے۔ اس لئے سلیم! قوم میں کیرکٹر پیدا کرنے کے لئے اس نظام کی تدریج ضروری ہے جس میں افراد فکرِ احتیاج سے بے نیاز ہو جائیں اور لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کی فضا عام ہو جائے۔ ہم نے یہ نظام دیکھا نہیں، لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ یہ نظام حضور رسالتمآبؐ کے ہاتھوں متشکل ہوا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں پروان چڑھا۔ پھر یہ نظام باقی نہ رہا لیکن لوحِ زمانہ پر اس کی یادگار اب تک منقوش ہے۔ بقول غالب

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے

اسی "پرتوِ نقشِ خیالِ یار" کے تصدق، ہر اس شخص کا جس کی نگاہوں کے سامنے اس کا تصور ہو، یہ عالم ہوتا ہے کہ ع

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال!

اسی نظامِ قرآنی کی طرف دعوتِ فکر میری زندگی کا مقصود ہے۔ میری کوششیں ابھی تک "تعلیم کتاب و حکمت" کی منزلِ اول میں ہیں۔ میں امکان بھر اس کے صحیح تصور کو عام کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چونکہ عام مسلمانوں کی نگاہوں سے اس کا تصور یکسر اوجھل ہو چکا ہے۔ اس لئے اسے ازسرِ نو سامنے لانے کے لئے بڑی کاوش درکار ہے۔ جب اس کا تصور عام ہو جائے گا تو پھر اسے عملاً متشکل کرنے کا ولولہ بھی بیدار ہو گا۔

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش ہے

تم پوچھتے ہو کہ اس تعلیم کتاب و حکمت کے مرحلہ اول کے بعد کیا پروگرام ہو گا۔ تم نے جتنی مرتبہ اس سوال کو دہرایا ہے میں نے یہی کہا ہے کہ یہ سوال قبل از وقت ہے۔ پہلے اس تصور کو عام تو کرو۔ لیکن اس جواب سے تمہارے قلب سراپا شوق و اضطراب کی تسکین نہیں ہوتی۔ اب اس کے بعد اگر میں، تمہارے غالب کے الفاظ میں یہ کہدوں کہ

دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

تو کہو تمہاری تسکین ہو جائے گی!

تم ٹھیک کہتے ہو کہ

یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

لیکن سلیم ہر غنچہ اپنے جوشِ نمو سے کھل کر پھول بنتا ہے۔ "نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل" اگر اسے اس سے پہلے کھلانے کی کوشش کرو تو اس کی ایک ایک پتی بکھر جائے گی۔ اس نظام کی شگفتگی بھی اسی قانون کے تابع عمل میں آتی ہے جو اس کی اساس و بنیاد ہے انا علینا بیانہ سے اسی قانون فطرت کی طرف اشارہ ہے۔ تمہیں اس نظام کے جلد روبہ عمل آنے کی کوئی صورت بظاہر دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن سلیم! میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

یہ کب ہو گا؛ اس کے لئے نہ تمہاری بیتابیٔ تمنا کچھ کہہ سکتی ہے، نہ میرا گریۂ نیم شبی۔ اس باب میں تو خدا نے خود اپنے رسول تک سے کہہ دیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ انقلاب تمہارے بعد ظہور پذیر ہو یا خود تمہارے سامنے۔ فاما نذهبن بك فانا منهم منتقمون او نرينك الذی وعدناهم فانا عليهم مقتدرون (۴۳/۴۱-۴۲)

لیکن یہ ہو گا کیسے اس کے لئے نہایت ختم و یقین سے کہدیا کہ فاستمسك بالذی اوحی اليك انك علی

۱؎ صفحہ ۲۳۳ پر دیکھئے

صراطِ مستقیم (۴۳/۴۳)، "تم قرآن کے ساتھ متمسک رہو۔ یہی وہ متوازن راہ ہے جو اس انقلاب تک لے جائے گی۔"

یہی اس انقلاب عظیم کے داعیِ اوّل نے کیا۔ اور یہی تمہیں اور مجھے کرنا ہوگا۔

اس موضوع کو ختم کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ اور بھی ہے جس کا دہرا دینا ضروری ہے۔ تمہیں اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ انسانی زندگی کا منتہا اس کی طبعی زندگی کی ضروریات کا پورا ہو جانا ہی نہیں۔ ان ضروریات کی طرف سے اطمینان اس کی نگاہوں میں وہ کشادگی پیدا کر دیتا ہے جس سے یہ ذاتی مفاد پر کلی مفاد کو ترجیح دیتا ہے، اور اس طرح انسانی معاشرہ میں ایک نظم، ضبط اور توازن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے وہ مساعد فضا پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کی مضمر صلاحیتوں کی بالیدگی کے لئے ناگزیر ہے، اس طرح بہ حیثیتِ مجموعی انسانیت کی سطح بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ اس بلند سطح سے کیا ہوتا ہے؟ آج اس چیز کا سمجھنا دشوار ہے اس لئے کہ آج ہم جس فضا میں سانس لے رہے ہیں اس میں نفسا نفسی کی ایسی بھگدڑ مچ رہی ہے کہ انسانی فکر کے لئے اس طلسم پیچ و تاب سے نکلنا محال ہو رہا ہے۔ اس وقت انفرادی مفاد کی دھند اس قدر گہری ہے کہ اس میں انسان دو قدم آگے نہیں دیکھ سکتا۔ ان حالات میں وہ کیا سمجھے کہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون کی فضا میں دلوں کی کیا کیفیت ہوا کرتی ہے۔ بقول اقبالؔ

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی!

لیکن اسے بھی سمجھ رکھو کہ خدا تک پہنچنے کے لئے مقام آدم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور آدم وہ ہے جس کی مشہود

صفحہ ۲۳۲ کا فٹ نوٹ: سلیم! جب ایک مرتبہ قائدِ اعظمؒ کے ساتھ دوران گفتگو میں، یہ آیت سامنے آگئی تو اس سے اُن پر کیا کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اسے کسی دوسری فرصت میں بیان کروں گا۔ اس واقعہ کی یاد سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ ان کی زندگی کے بعض لمحات ایسے بھی تھے جنہیں دیکھنے کا موقعہ مجھے ہی ملا۔

زندگی کی ابتدا اس ارض سے ہوتی ہے۔ لہذا جس آدم کے لئے ارض (معاش) کی مشکلات حل نہیں ہوتیں اُس کی نگاہیں اوپر کیا اُٹھ سکیں گی۔

تجھے پہ سہل: دل جب تک زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

⁂

اب سلیم، تمہارے اس سوال کا جواب سامنے آتا ہے کہ جب انسان نے اس دنیا میں ابھی کروڑوں سال تک اور رہنا ہے تو نبوت کا سلسلہ کیوں ختم ہو گیا۔ ختمِ نبوت کی حقیقت، لِم اور مصلحت کے متعلق "معراج انسانیت" کے آخری باب میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے۔ اسے نہایت غور سے پڑھو، بات واضح ہو جائے گی۔ سلسلۂ رشد و ہدایت سے مقصود یہ تھا کہ انسانی معاشرہ میں ایسے انقلابات آتے رہیں جن سے اس میں نظم و توازن پیدا ہوتا رہے اور اس طرح انسانیت بتدریج اپنی ارتقائی منازل طے کرتی جائے۔ انسانی شعور کی ابتدائی زندگی میں یہ انقلابات اشخاص کے ذریعے رونما ہوتے تھے۔ انسانی تاریخ پر غور کرو۔ اس میں جہاں جہاں ایسے اشخاص کھڑے دکھائی دیں گے جو عام سطح سے اونچے ہوں گے۔ تمام سطح کے نقوش، انسانی تاریخ کی الواح پر باقی نہیں رہے (نہ وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ باقی رہیں) لیکن ان اُبھرے ہوئے انسانوں کی یاد تاریخی فضا میں ابھی تک باقی ہے۔ یہی وہ افراد تھے جن کے ہاتھوں کسی نہ کسی طرح کا انقلاب واقع ہوا۔ انقلاب انگیزی کا یہ طریق (Process) انسانی شعور کے ابتدائی مراحل کی چیز تھی۔ جب انسانی شعور آگے بڑھا تو فطرت نے خود اس طریق کو ترک کر دیا اور اس کی جگہ وہ طریق اختیار کیا جس سے خارجی دنیا میں انقلاب لانے کے لئے انسان کی ذہنی دنیا میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے۔ یہ ذہنی تبدیلی تصورات کے بدلنے سے ہوتی ہے۔ لہذا اب انقلابی دنیا میں، افراد کی جگہ تصورات نے لے لی۔ تم غور کرو، سلیم، آج دنیا میں افراد کے درمیان جنگ نہیں ہو رہی، مختلف تصورات (Ideologies) کی جنگ ہو رہی ہے۔ اب امامت

(Leadership) اشخاص (Personalities) کی نہیں بلکہ تصورات (Ideologies) کی ہے۔ اب مقابلہ مختلف افراد کا نہیں۔ مختلف نظامہائے زندگی کا ہے اور نظام کی بنیاد اشخاص پر نہیں بلکہ تصورات پر ہوتی ہے۔

رسول کی ذات میں شخصیت اور تصوریت (Personality & Ideology) دونوں ایک جا ممزوج (ملی ہوئی) ہوتی ہیں۔ یوں سمجھو کہ نبوت شخصیت کی مظہر ہوتی ہے اور رسالت، آئیڈیالوجی کی نقیب۔ نبی اکرمؐ کے بعد نبوت (شخصیت) ختم ہوگئی۔ اور رسالت (آئیڈیالوجی) باقی رہ گئی۔ اس لئے کہ اب انقلابات کا مدار، رسالت (Ideology) پر تھا نہ کہ شخصیتوں پر۔ آئیڈیالوجی حروف و نقوش کی شکل میں محض مجرد تصور (Abstract Concept) ہوتی ہے۔ اس کی عملی صورت نظام کہلاتی ہے۔ لہٰذا یوں کہو کہ ختم نبوت کے بعد اشخاص کی جگہ نظام نے لے لی۔ اب دنیا میں افراد کی اہمیت نہیں رہی اہمیت نظام کی ہوگئی جو نظام بہتر ہوگا، امامت اسی کے حصہ میں آئے گی، نبوت ختم ہوگئی لیکن رسالت محمدیہ (قرآن کی شکل میں) قیامت تک کے لئے باقی ہے۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ جو نظام اس رسالت (آئیڈیالوجی) کی رو سے قائم ہوگا، دنیا کی امامت اسی کے ہاتھ میں ہوگی۔ باقی دنیا رفتہ رفتہ اس حقیقت کے قریب آرہی ہے کہ اب امامت اشخاص کی نہیں، تصورات کی ہے اور مقابلہ افراد کا نہیں بلکہ نظامہائے زندگی کا ہے۔ لیکن مسلمان اس حقیقت سے دور ہی نہیں بلکہ اس راہ میں روک بن کر کھڑا ہے۔ ختم نبوت کی یہ لِم مدت ہوئی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی ہے۔ اس لئے اس نے اُس رسالت (پیامِ خداوندی) کو ایک عرصہ سے پس پشت ڈال رکھا ہے جس کی رو سے قائم کردہ نظام نے اسے امامتِ اقوام عطا کرنی تھی، اس کی جگہ یہ قرنہا قرن سے شخصیت پرستی کی جھاڑیوں میں الجھ رہا ہے۔ سلاطین، ائمہ، فقہاء و رواۃ، علماء، مشائخ، زندہ اور مردہ "مقربین بارگاہ خداوندی" غرضیکہ یہاں سے وہاں تک اس کی راہ میں اشخاص ہی اشخاص دکھائی دیتے ہیں۔ تصورات (آئیڈیالوجی) کا کہیں ذکر تک نہیں۔ یہ حقیقت اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکی کہ اگر فطرت کے پروگرام میں یہی ہوتا کہ انسانی معاشرہ

میں انقلاب اشخاص ہی کا محتاج رہے گا تو انبیاء کا سلسلہ بدستور جاری رہتا۔ مشیتِ خداوندی نے افراد کی جگہ آئیڈیالوجی کو دیدی۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک خدا کا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) ٹھیک نہ تھا۔ انہوں نے ختم نبوت کے باوجود اشخاص کا سلسلہ جاری رکھا۔ پہلے علماء کو "کالانبیاء بنی اسرائیل" بناکر، اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جو ان کے ذہن میں ختم نبوت کی رو سے پیدا ہو رہی تھی۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو ہر صدی پر ایک مجدد کو بلایا گیا کہ خدائی پروگرام کے اس نقص کو وہی آکر پورا کرے۔ اس سے بھی ہوسِ اشخاص پرستی کی تسکین نہ ہوئی تو ایک آخری نجات دہندہ (مہدی آخر الزماں) کا انتظار کرنے لگے۔ تم نے غور کیا، سلیم کہ مسلمان نے کس طرح ختم نبوت کی حقیقت سے عملاً انکار کیا ہے۔ جب انہوں نے اس طرح رسالت (آئیڈیالوجی) کی جگہ اشخاص کی طلب شروع کر دی تو گاہک شناس دوکاندار، طلب و رسد (Supply and Demand) کے اصول کے مطابق اس جنس کو منڈی میں لے آئے جس کی تلاش ان گاہکوں کو دوکان دکان لئے پھرتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ تم انبیاء کی کمی محسوس کر رہے ہو اور اس لئے علماء، محدث، مشائخ، مجدد، مہدی کے ناموں سے اپنا جی بہلاتے ہو؛ لیکن ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہاں جاپان میڈ "نبی" موجود ہیں۔ انہیں لو اور اس خلا کو پورا کرو جو تمہارے ذہن میں ختم نبوت کی رو سے پیدا ہو گیا ہے۔ غور کرو سلیم! قلب و نظر کی یہ تمام پریشانیاں اور متاعِ دین و دانش کی یہ تمام رہزنیاں اور قزاقیاں اسی ایک علت کی معلول ہیں کہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے عقیدے کے باوجود اشخاص کے بجائے آئیڈیالوجی (رسالت) کو درخورِ امامت نہیں سمجھا۔

یاد رکھو، سلیم! اشخاص کی امامت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب آئیڈیالوجی اور نظام کی امامت کا دور ہے، اور یہی مفہوم ہے ختم نبوت کا۔ (آئیڈیالوجی کے لئے کس طرح اشخاص کی جگہ ایک اُمّت کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے متعلق کبھی پھر لکھوں گا۔ ختمِ نبوت کے ضمن میں تشکیل اُمّت کا نکتہ بھی بڑا اہم ہے)۔

⁂

ابھی سلیم! تمہاری دو تین باتیں اور جواب طلب ہیں۔ لیکن ان کے جواب سے پہلے میں تمہاری توجہ پھر

اس اہم نکتہ کی طرف منعطف کرانا چاہتا ہوں جسے

بارہا گفتہ ام و بارِ دگر می گویم

اور وہ یہ کہ جو بات تم پوچھتے ہو پہلے اس کا مفہوم متعین کر لو۔ یاد رکھو سلیم! آدھی بات تو محض تعینِ مفہوم سے واضح ہو جائے گی۔ یقین نہ آئے تو ایسا کر کے دیکھ لو! میں کہتا ہوں سلیم! اگر ہم اس دور میں صرف اتنا کر جائیں کہ ہمارے ہاں جو الفاظ اور اصطلاحات مروج ہیں ان کا مفہوم اس طرح متعین کر لیں کہ ہر بولنے اور سننے والے کے ذہن میں ایک ہی مفہوم آئے (جس طرح پانی کہنے سے ہر شخص کے ذہن میں ایک ہی مفہوم آتا ہے) تو یقین مانو کہ یہ بہت بڑا کام ہوگا۔ میں اسی کی کوشش کر رہا ہوں۔ خدا مجھے کامیاب کر دے۔ ذرا سوچو سلیم! کہ جب تم سے کوئی کہے کہ فلاں کاروبار کرو، اس میں تمہیں نفع ہوگا، تو کہنے والا بھی سمجھتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور تم بھی جانتے ہو کہ اس سے مطلب کیا ہے۔ یہ الفاظ ایک ہندو کہے یا مسلمان۔ سنی کہے یا شیعہ۔ مقلد کہے یا غیر مقلد ہر ایک کا مفہوم ایک ہوگا۔ لیکن سلیم! جب کبھی تم سے کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں کام کرو، اس سے تمہیں ثواب ہوگا۔ تو ایمان سے کہو، تمہاری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ اس سے کیا ہوگا؟ یا یہ کہ ان الفاظ کا جو مفہوم تم نے سمجھا ہے، تمہیں یقین ہے کہ کہنے والے کے ذہن میں بھی وہی مفہوم ہے؟ پھر یہ بھی سوچو کہ کیا تم کسی ایسے شخص کو جو اس لفظ (ثواب) کے اس مفہوم سے واقف نہیں جو وراثتی طور پر ہمارے ذہنوں میں چلا آ رہا ہے، سمجھا سکتے ہو کہ اس سے مفہوم کیا ہے؟ جب کوئی زیادہ اصرار کرے گا تو تم کہہ دو گے کہ اس سے "نجات" حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے پھر وہی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ "نجات" سے مفہوم کیا ہے؟ اور کیا یہ مفہوم ہر اس شخص کے ذہن میں یکساں ہوتا ہے جو اس لفظ کو استعمال کرتا ہے! تم کہہ دو گے کہ اس سے مفہوم جنت میں جانا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جنت کا مفہوم تمہارے ذہن میں متعین ہے اور کیا یہی مفہوم ہر اس شخص کے ذہن میں ہوتا ہے جو اس لفظ کو استعمال کرتا ہے، مجھے تسلیم ہے کہ جہاں تک ان امور کا تعلق آنے والی زندگی سے ہے ان کا پورا پورا مفہوم، زندگی کی موجودہ سطح پر سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ لیکن ان امور کا تعلق صرف آنے والی زندگی ہی سے تو نہیں۔ ہماری موجودہ زندگی سے بھی

تو ان کا تعلق ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہاں تک ان کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے ہے، کیا ان کا کوئی متعین مفہوم ہمارے سامنے ہے؟ اور کیا وہ مفہوم ہر اس شخص کے ذہن میں یکساں ہے جو ان اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے؟ یہ تو تمہیں بھی تسلیم ہوگا کہ ایسا نہیں ہے۔ ان کا کوئی متعین مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ ان اصطلاحات کو سلیم! قرآن نے پیش کیا ہے۔ لہذا قرآن کو ان کا مفہوم بھی متعین کرنا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو (معاذ اللہ) وہ بڑی ناقص کتاب ہے۔ لیکن اگر وہ ان کا مفہوم متعین کرتا ہے تو وہ آج ہماری نگاہوں سے یکسر اوجھل ہے۔ یاد رکھو سلیم! جب تک ہم ان الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم، جن کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے ہے (اور وہ کونسی چیز ہے جس کا کسی نہ کسی حد تک ہماری موجودہ زندگی سے تعلق نہیں)، اس طرح متعین نہیں کرتے جس طرح ہم کاروباری دنیا میں الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم متعین کرتے ہیں۔ ہمارا کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کاروباری دنیا میں تجریدی گفتگو (Abstract Talk) سے کبھی کام نہیں چل سکتا۔ نہ کوئی قوم اس انداز گفتگو سے زندہ رہ سکتی ہے۔ ہمیں ٹھوس (Concrete) زمین پر رہنے کے لیے بھیجا گیا ہے ہمارے معاملات بھی ٹھوس (Concrete) اندازِ گفتگو سے طے ہونے چاہئیں۔ دیکھتے ہو کہ غالب اپنی رندانہ شوخی سے اس باب میں کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

لہذا، سلیم! سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم ان تمام الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم، جنہیں ہم روزمرہ بلا سوچے سمجھے استعمال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، قرآن سے متعین کرلیں۔ اس کے بعد باقی منزل بہت آسانی سے طے ہو جائے گی۔ تم بھی جب کوئی بات پوچھو تو پہلے اس کا مفہوم متعین کر لیا کرو۔

* * *

مجھے اس سے خوشی ہوئی، سلیم، کہ میرے خطوط سے تمہارے شکوک کی بہت سی پھانسیں نکلتی جا رہی ہیں۔

دعا دیں گے میرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے ہیں میرے ساتھ منزل کے

لیکن اس میں میری کاریگری تو کچھ نہیں، یہ تو اس کتابِ مبین کا تصدّق ہے جس کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ لاریب[1] فیہ اس سے قلب کے تمام اضطراب رفع ہو جاتے ہیں۔

نہیں اس میں شک کوئی تاجور کہ تڑپ ہے تیرے کلام میں
مگر اس میں تیرا کمال کیا یہ غمِ دوست زر و نگار ہے

یہ خط توقع سے زیادہ لمبا ہو گیا۔ باقی باتوں کے متعلق پھر سہی۔

والسلام
اپریل ۱۹۵۱ء

---

[1] ریب کے معنی اضطرابِ قلب کے ہیں

سلیم کے نام ۱۵ پندرھواں خط

مقامِ محمدیؐ

ہاں سلیم! اس میں کوئی کلام نہیں کہ دنیا میں تقریبیں دو ہی ہیں، ایک میلاد النبی کی عید اور دوسری نزولِ قرآن کی عید۔ اور اگر غور سے دیکھئے تو یہ دونوں تقاریب بھی درحقیقت ایک ہی تقریب کے دو رُخ ہیں۔ دنیا کی بھول ہے کہ اُس نے ان تقاریب کو صرف مسلمانوں کی تقاریب سمجھ رکھا ہے۔ یہ درحقیقت پوری کی پوری انسانیت کی تقاریب ہیں۔ اس لیے کہ یہ تقاریب نہ کسی شخصیت سے وابستہ ہیں، نہ کسی خاص قوم سے۔ نہ زمان کی قید میں محدود ہیں نہ مکان کی حدود میں محصور۔ یہ وہ تقاریب ہیں جن سے انسانیت کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ وہ مواقع ہیں جہاں کاروانِ آدمیت، اپنے سفرِ زندگی میں ایک نیا موڑ مڑا ہے۔ یہ تقاریب درحقیقت ایک حدِ فاصل ہیں دنیائے قدیم اور دنیائے جدید میں۔ اس مقام پر انسانی زندگی کے پُرانے اسلوب و انداز تہ کر کے رکھ دیئے گئے اور اس کے سامنے علم کے نئے مقامات، فکر کی نئی راہیں اور ارتقا کی نئی منزلیں بے نقاب کر دی گئیں۔ اس لئے یہ تقریبیں، کسی خاص قوم کی تقریبیں نہیں۔ پوری نوعِ انسانی کی تقریبیں ہیں۔ جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی لکھا تھا، خاک کے ذرّے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے پیکرِ انسانی میں جلوہ بار ہوئے۔ اب انسان کے سامنے زندگی کی ممکنات کا جو انتہائی مقام ہے وہ مقامِ محمدیؐ ہے [مقامِ نبوت نہیں بلکہ سیرتِ محمدیؐ کا مقام

اس لئے کہ ایک تو نبوت کا مقام اکتسابی نہیں جس تک پہنچ جانا ہر انسان کے لئے ممکن ہو۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہؐ کے بعد سلسلۂ نبوت ویسے ہی ختم ہو گیا۔ اب انسانیت کے وہ کمال رہ گئے جو اکتساباً حاصل کئے جا سکتے ہیں] یہی وجہ ہے کہ میں نے معارف القرآن کی چوتھی جلد کا نام معراجِ انسانیت رکھا تھا اس لئے کہ سیرتِ محمدیؐ درحقیقت معراجِ انسانیت کی آئینہ دار ہے۔ خدا سے نیچے اور ساری کائنات سے اوپر۔ یہ ہے مقامِ محمدیؐ۔ افسوس یہ ہے کہ انسان نے ابھی تک مقامِ محمدیؐ کو پہچانا نہیں اور اس کے ذمہ دار خود ہم مسلمان ہیں جنہوں نے اس مقام کی صحیح تصویر دنیا کے سامنے پیش نہیں کی، جس دن انسان نے اس مقام کو پہچان لیا، یہ زمین بدل جائے گی یہ آسمان بدل جائے گا اور دنیا ایک بار پھر اس حیات بخش و جاں فزا منظر کو اپنے سامنے دیکھ لے گی جسے خاکِ حجاز کے ذرّوں نے تیرہ سو برس پہلے دیکھا اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آسمان آج تک سرگرداں ہے۔

پہلے تو یہ دیکھو سلیم! وحی کسے کہتے ہیں اور نبوت کا مقام کیا ہے؟ اس کے لئے ذرا اس واقعہ کو پھر سے سامنے لاؤ جو تم نے پچھلی مرتبہ مجھ سے بیان کیا تھا۔ اگر میں بھولتا نہیں تو تم نے بتایا تھا کہ اس میں خریدار اور دوکاندار کی باہمی گفتگو کچھ اس قسم کی تھی۔

خریدار — تم نے ابھی صبح کہا تھا کہ اس کی قیمت چار روپے ہے۔ اب پانچ روپے مانگ رہے ہو؟

دوکاندار — وہ صبح کی بات ہے۔ اب اس کے دام بڑھ گئے ہیں۔

خریدار — لیکن جب میرے ساتھ تم نے چار روپے طے کر لئے تھے۔ تو پھر اب مجھ سے پانچ کیوں مانگتے ہو؟ تمہیں اپنی بات پر قائم رہنا چاہیئے۔

دوکاندار — طے اس وقت کیا تھا۔ اگر تم اُس وقت لے جاتے تو اور بات تھی۔ اب وہ بات گئی۔ اب تو پانچ روپے ہوں گے۔

یہی بات تھی ناں! جو باہمی کشاکش سے بڑھتے بڑھتے چپقلش اور اس سے آگے دست و گریبان تک پہنچ گئی تھی۔

لیکن یہ بات اس خاص خریدار اور دوکاندار کی نہیں۔ ہر انسان کا مزاج تاجرانہ واقع ہوا ہے۔ اور تاجرانہ

مزاج کے معنی ہی یہ ہیں کہ گاہک اپنا نفع سوچے اور دوکاندار اپنا۔ بلّی اپنی گھات میں اور چوہا اپنی گھات میں۔ جب گاہک کہتا ہے کہ انسان کو اپنی زبان پر قائم رہنا چاہیئے تو (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اس کا یہ مطالبہ بھی اس لئے ہوتا ہے کہ اس میں اس کا فائدہ ہوتا ہے۔ یعنی انسان، اصول کا مطالبہ بھی اس وقت کرتا ہے جب وہ دیکھے کہ اس اصول پر قائم رہنے سے اس کا فائدہ ہے۔ ساری دنیا میں یہی ہو رہا ہے اور انسان ہر جگہ یہی کچھ کرتا ہے۔ یہ انسانی عقل کا تقاضا ہے۔ جو شخص اپنا نقصان کرتا ہے دنیا اسے بے وقوف کہتی ہے جو اپنے مفاد کا تحفظ کرتا ہے اسے عقلمند قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی مفادِ خویش کا تحفظ، عقل کا تقاضا ہے اور اپنے فائدے کا خیال نہ کرنا بے عقلی کی علامت۔ اس مقامِ سود و زیاں میں اصول اور بے اصولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر عقل دیکھتی ہے کہ اس کا فائدہ پچھلے مقام سے ہٹنے میں ہے تو وہ اس مقام سے بلا تامل ہٹ جاتی ہے اور اپنی اس جدید روش کے جواز میں نئی نئی دلیلیں تراشتی اور بہانے ڈھونڈھتی ہے۔

زماں زماں شکند آں چہ می تراشد عقل

یہی عقل کا کاروبار ہے۔ یہی اس کا وطیرہ ہے۔ عقل، مفادِ خویش سے الگ ہٹ کر سوچ ہی نہیں سکتی۔

لیکن اگر دنیا میں یہی ہوتا رہے کہ ہر شخص جب جی چاہے اپنے مقام سے ہٹ جائے، تو دنیا میں کوئی نظم قائم نہ رہ سکے۔ تم دیکھتے ہو سلیم! کہ کاروباری دنیا نے اپنے لئے کچھ کاروباری اصول بنا رکھے ہیں۔ ان کے تمام کاروبار کا چلن ان اصولوں کی پابندی میں ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو اصول کی پابندی سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن اگر اس نے اپنی کاروباری ساکھ کو قائم رکھنا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا اور اپنے فائدے کے لئے اصول شکنی اور عہد فراموشی پر اُتر آتا ہے تو کاروباری دنیا میں اس کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے۔ کسی معاشرہ میں لوگ، جتنے زیادہ زبان اور اصول کے پابند ہوں گے وہ معاشرہ اتنا ہی زیادہ امن اور سلامتی کا معاشرہ کہلائے گا۔ اس میں ایک فرد دوسرے پر اعتماد کر سکے گا اور باہمی اعتماد اور بھروسے کی زندگی ہی اطمینان کی زندگی ہو سکتی ہے۔

اب سلیم ہمارے سامنے دو باتیں آگئیں۔

(i) عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اگر ہم دیکھیں کہ کسی اصول پر قائم رہنے سے نقصان ہوتا ہے تو ہمیں اُس اصول سے پھر جانا چاہیئے۔ اگر ہو سکے تو دلیل سازی اور بہانہ تراشی کی فریب کاری سے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر دھاندلی سے۔

(ii) لیکن معاشرہ کے امن و سکون کا تقاضا ہے کہ باہمی معاملات ایسے اصولوں کی رو سے طے ہوں جو ہر فرد کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ بدلتے نہ رہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اصول وضع کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔ عقل لحظہ بہ لحظہ بدلنے والی چیز ہے۔ غیر متبدل اصول زندگی وضع کرنا اس کے احاطہ سے باہر ہے۔

* * *

اب تم آفاقی کائنات Outer Universe میں غور کرو سلیم! تم دیکھو گے کہ وہاں کوئی چیز خود فیصلہ نہیں کرتی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ ان سب کے لئے پہلے سے اصول مقرر ہیں جن کی پابندی از خود ہوتی جا رہی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی صبح سورج یہ فیصلہ کر لے کہ میرا فائدہ اس میں ہے کہ میں دیر سے طلوع ہوں اور زمین یہ فیصلہ کر لے کہ میں آج کچھ دیر کے لئے آرام کر لوں۔ ان کے لئے اصول اور قوانین متعین ہیں۔ اور ان کی فطرت کے اندر داخل ہیں۔ ایک بکری کی فطرت میں ہے کہ وہ گھاس کھائے اور گوشت کی طرف نگاہ اٹھا کر کبھی نہ دیکھے۔ پانی کی فطرت ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہے۔ لیکن اس باب میں انسان ان سب سے الگ ہے۔ اس کی "فطرت" کے اندر کوئی اصول ودیعت کر کے نہیں رکھا گیا۔ جیسا کہ میں تمہیں اس سے پہلے تفصیلی طور پر ایک خط[1] میں لکھ چکا ہوں انسان کی فطرت کچھ نہیں۔ اس کی زندگی کا جتنا حصہ حیوانی سطح (Animal Level) سے متعلق ہے وہاں وہی طبعی قوانین (Physical Laws) جبلی طور پر (By Instinct) کارفرما ہیں جو دوسرے حیوانات میں عمل پیرا ہیں۔ بھوک کے وقت کھانے کا تقاضا۔ پیاس میں پانی کی طلب۔ تکان کے بعد آرام

---

[1] یہ خط ذرا آگے چل کر آتا ہے۔

اور نیند کی خواہش۔ طبعی قوانین کے مطابق پیدا ہوتی رہتی ہے لیکن جہاں تک اس کی زندگی کی انسانی سطح (Human Level) کا تعلق ہے، اس کی "فطرت" میں کوئی اصول اور قوانین نہیں رکھے گئے جن کی پابندی اس طرح از خود فطرۃً (By Nature) ہوتی جائے جس طرح آفاقی کائنات میں ہر شے اپنے اپنے متعلقہ قوانین کی پابندی کرتی جاتی ہے۔

اب صورتِ حال یوں ہوئی سلیم! کہ

(i) انسانی معاشرہ میں امن و توازن کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ مختلف افرادِ معاشرہ ایسے اصولوں کی پابندی کریں جو ان کی عقل کے مفاد پرستانہ تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے نہ رہیں۔

(ii) ان اصولوں کا وضع کرنا عقل کے بس کی بات نہیں۔

(iii) نہ ہی یہ اصول انسان کی فطرت کے اندر از خود موجود ہیں۔

اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کو "بے اصولا" ہی چھوڑ دیا گیا ہے؟ ایسا نہیں کیا گیا۔ ایسا کرنا تو اس پر بڑی زیادتی ہوتی۔ اسے زندگی کے غیر متبدل اصول دیئے گئے ہیں لیکن ان کے دینے کا ذریعہ مختلف اختیار کیا گیا ہے۔ وہ ذریعہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے بعض کو چن لیا جاتا اور انہیں ان محکم اصولوں کا علم دیدیا جاتا۔ ایسے انسانوں کو نبی اور اس ذریعۂ علم کو وحی کہا جاتا ہے۔ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وحی نہ تو عقل کی پیداوار ہو سکتی ہے اور نہ ہی یہ نبی کے اندر پہلے سے موجود ہوتی ہے جو ایک وقت کے بعد نمودار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ نبی انسان ہوتا ہے اور (یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ) ایسے اصولوں کا علم انسان کی "فطرت" کے اندر موجود نہیں۔ اسی حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ وحی اکتسابی شے نہیں، وہبی ہے۔ یعنی یہ نہیں کہ وحی کا امکان (Possibility) انسان کی فطرت کے اندر ہوتا ہے۔ اور جو انسان چاہے اس صلاحیت (Faculty) کو نشوونما دے کر (Develop کرکے) ایک دن نبی بن جائے۔ میرزا غلام احمد نے وحی کی ماہیت ہی کو نہیں سمجھا اس لئے یہ دعویٰ کر دیا کہ میں ذاتی کوشش سے، بتدریج، اکتسابی طور پر مقام نبوت

تک آپہنچا ہوں۔ تمہاری حیرت بجا ہے سلیم! کہ جو شخص وحی کی بنیادی خصوصیت تک کو نہیں سمجھ سکا، مسلمانوں کا ایک طبقہ اسے بھی نبی ماننے لگ گیا۔ لیکن اس میں حیرت واستعجاب کی کونسی بات ہے؟ تم ذرا دیکھو کہ تمہاری قوم میں جن لوگوں نے آج متبعین (Followers) کی اتنی بڑی تعداد اپنے پیچھے لگا رکھی ہے اور اس طرح بڑی بڑی جماعتوں کے مرکز بن کر بیٹھے ہیں، ان کی علمی اور ذہنی سطح کیا ہے؟ اگر یہ لوگ کسی سمجھدار قوم میں پیدا ہوتے تو ہوشمند طبقہ انہیں اپنے پاس نہ بیٹھنے دیتا۔ لیکن یہی لوگ ہیں کہ اس قوم میں لیڈر بن رہے ہیں اور لیڈر بھی اس انداز کے کہ دنیا بھر کے علوم وفنون سے متعلق مسائل (Problems) ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ لوگ ان علوم کی ابجد تک سے واقف نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود، نہایت مجتہدانہ انداز سے ان مسائل کا حل تجویز کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے جوابات اس انداز کے ہوتے ہیں جن پر علم ہنسے اور عقل ماتم کرے لیکن بایں ہمہ، ان کے معتقدین کا حلقہ ہے کہ ان پر سبحان اللہ اور ماشاراللہ کہتے نہیں تھکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو قوم تقلید کی خوگر ہو جائے اس میں علم اور جہالت میں تمیز کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے وہ ہر ڈگڈگی بجانے والے کے پیچھے ہو لیتی ہے۔ اندریں حالات اگر اس قوم میں سے کچھ لوگ "نبی قادیان" کے پیچھے بھی لگ گئے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ اگر یہ لوگ اس کے پیچھے نہ لگتے تو کسی اور جماعت کے مذہبی لیڈر کے پیچھے لگ جاتے۔

نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہکن است

ہاں! تو میں کہہ یہ رہا تھا سلیم! کہ انسانوں کو غیر متبدل اصولِ زندگی کا علم دینے کے لئے یہ انداز اختیار کیا گیا کہ بعض انسانوں کو یہ علم وحی کے ذریعے عطا کر دیا گیا اور انہیں اس پر مامور کر دیا کہ وہ اس علم کو دوسروں تک پہنچا دیں۔ اس علم (وحی) کے ملنے کو نبوت کہتے ہیں۔ اور اسے دوسروں تک پہنچانے کو رسالت۔ نبوت ختم ہو چکی ہے کیونکہ انسانیت کے لئے جس قدر محکم اصولوں کی ضرورت تھی انہیں آخری مرتبہ ایک کتاب (قرآن) میں محفوظ کر کے

دیدیا گیا۔ باقی رہا ان اصولوں (یعنی قرآن) کا دوسروں تک پہنچانا، سو یہ فریضۂ رسالت" قرآن ملنے والوں کے سپرد کر دیا گیا۔

دیکھو سلیم! وحی کی اس حقیقت کو، آج سے چودہ سو سال پہلے، عرب کے بادیہ نشینوں کو کس انداز سے سمجھایا گیا؟ وہ خانہ بدوش صحرانورد قوم تھی۔ عمر بھر سفر میں رہتی۔ آج یہاں۔ کل وہاں، سفر بھی صحراؤں میں، جہاں نہ سڑکیں ہیں نہ روشیں۔ نہ راستے ہیں نہ راستوں کے نشان۔ اگر کسی جگہ کسی پہلے جانے والے کے پاؤں کے نشان پڑ گئے ہیں تو ہوا کے ایک تیز جھونکے نے انہیں بھی ریت کے نیچے دبا دیا۔ ایسے راستے اور ان میں سفر۔ اور سفر بھی بالعموم راتوں کو۔ سوچو سلیم! کہ اندھیری راتوں میں ایسے صحراؤں میں کس طرح سفر کیا جاتا تھا؟ انہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں یا نہیں؟ عقل سے معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں پرندوں کی طرح یہ چیز "فطرت" کے اندر موجود نہیں کہ فضا کی پہنائیوں میں ہزارہا میل کا سفر کر رہے ہیں۔ اور کبھی راستہ نہیں بھولتے۔ ان صحرانوردوں کو لامحالہ کسی خارجی نشان راہ (ہدایت) کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ خارجی نشاناتِ راہ ایسے ہونے چاہیئے تھے جو راستہ دکھلانے میں کبھی غلطی نہ کریں۔ جو اپنی جگہ پر محکم ہوں۔ یہ نشاناتِ راہ کیا تھے؟ آسمان کے ستارے۔ یہی ان کی دلیلِ راہ بنتے تھے۔ یہی ان کے لئے خضرِ طریقت تھے۔ یہ ایسے محکم اور غیر متبدل (Sign-posts) تھے جن کی راہ نمائی میں کوئی دھوکا نہ تھا، کسی غلطی کا امکان نہ تھا۔

یہ تھے صحرانورد، عرب، قرآن کے اولیں مخاطب۔ ان سے کہا گیا کہ تم جاننا چاہتے ہو کہ جو راہ نمائی (ہدایت) تمہیں وحی کے ذریعے دی جا رہی ہے وہ کس قدر قابل اعتماد ہے؟ اس کے جواب میں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم یہ بتاؤ کہ ستاروں کی راہ نمائی کے متعلق تمہارا تجربہ اور مشاہدہ کیا کہتا ہے؟ کیا وہ مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ وہ ہر رات اپنی روش بدلتے رہتے ہیں یا یہ کہتا ہے کہ ان کی راہ نمائی غیر متبدل اور انتہائی درجے کی قابل اعتماد ہے؟ تمہارا جو جواب ستاروں کی رہنمائی کے متعلق ہے، وہی جواب وحی کے متعلق سمجھ لو اس لئے کہ اس رسول کو وحی بھی اسی مقام سے ملتی ہے جہاں سے ستاروں کو اپنی محکم روش پر چلنے کی وحی ملتی ہے۔

والنجم اذا ھوٰی (۵۳/۱)

ستارہ جو اپنی محکم روش پر چلتا چلتا غروب ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ...

کس حقیقت پر شاہد ہے؟ اس حقیقت پر کہ (ما ضل صاحبکم وما غوٰی (۵۳/۲) یہ تمہارا رفیقِ راہ، جو سفرِ زندگی میں تمہاری راہ نمائی کے لئے متعین کیا گیا ہے۔ نہ تو راستے کی تلاش میں سرگرداں پھرتا ہے اور نہ ہی راستہ پا لینے کے بعد اسے کھو سکتا ہے۔ اس لئے کہ (وما ینطق عن الھوٰی (۵۳/۳) وہ جو کچھ کہتا ہے اپنے خیالات کی رو سے نہیں کہتا بلکہ ان ھو الا وحی یوحیٰ (۵۳/۴) ان محکم اصولوں کو بیان کرتا ہے جو اس کی طرف وحی کئے جاتے ہیں۔ اسے یہ وحی اسی مقام سے ملتی ہے، جہاں سے ستارے کو وحی عطا ہوتی ہے علمہٗ شدید القوٰی ذو مرۃ ۔ (۵۳/۵-۶) اس خدا کی طرف سے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اور زندگی کی تمام گزرگاہوں سے واقف۔ تم اس کی قوتوں اور حکمتوں کا مشاہدہ ستاروں کی دنیا میں ہر روز کرتے ہو۔ آسمان کی اتنی بڑی وسیع و عریض کائنات اور اس میں ایسے ایسے عظیم الجثہ کرتے کس طرح سر جھکائے اس کے قانون کی اطاعت میں محوِ خرام ہیں۔

ستاروں کی یہ راہ نمائی جس طرح آج سے چودہ سو سال پہلے، عرب کے صحرا نشینوں کے لئے قانونِ خداوندی کے محکم اور اٹل ہونے کی ایک بیّن دلیل تھی، اسی طرح آج سمندری بیڑوں اور ہوائی جہازوں کے قائدین (Pilots) کے لئے ایک واضح برہان ہے۔ نہیں! اس سے بھی آگے۔ یہ دلیل جس طرح چودہ سو سال پہلے کی غیر مہذب، جاہل دنیا کے لئے سرمۂ چشم تھی، اسی طرح آج آئن سٹائن اور جیمس جینز کے لئے وجہِ بصیرت ہے۔ میں نے تمہیں فلکیات کے متعلق جیمس جینز کی کتاب بھیجی تھی۔ تم نے دیکھا تھا کہ یہ دورِ حاضر کا جلیل القدر ریاضی دان، ستاروں کی گزرگاہوں کا تماشا دیکھ کر کس طرح محوِ حیرت ہو جاتا ہے اور قانونِ خداوندی کی ہیبت و جبروت کے سامنے کس طرح، قدم قدم پر سجدہ ریز ہوتا ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں سے نبی اکرمؐ کو وحی عطا ہوئی۔ وحی کے اس علم نے، رسول کی ذات میں پورا پورا اعتدال اور توازن پیدا کر دیا (فاستوٰی ۵۳/۶) اور اس طرح وہ علم کی ان بلندیوں تک جا پہنچا جہاں عقل

انسانی کی رسائی ناممکن ہے۔ وھو بالافق الاعلیٰ (۵۳/۷) تم قطب مینار پر چڑھے تھے سلیم! تم نے دیکھا تھا کہ وہاں پہنچ کر انسان کی نگاہ کا دائرہ کس قدر وسیع ہو جاتا ہے۔ مینار کے نیچے کھڑے ہو کر انسان زیادہ سے زیادہ سو پچاس گز تک دیکھ سکتا ہے لیکن وہی انسان مینار کے اوپر چڑھ کر میلوں تک کی دنیا کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ انسان وہی ہوتا ہے۔ فقط مقام کی پستی اور بلندی اس کی نگاہ میں اس قدر فرق پیدا کر دیتی ہے۔ نبی کے لفظی معنی ہیں، مقام بلند پر کھڑا ہونے والا۔ وھو بالافق الاعلیٰ۔ علم (وحی) کی اس بلندی پر کھڑا ہو کر، نبی حقائق کائنات سے قریب تر ہو جاتا ہے! اور اُن کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے ثم دنا فتدلیٰ (۵۳/۸) (Archbishop) (Temple) نے لکھا ہے کہ قلب انسانی کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ اس کے اندر علم حاصل کرنے کی استعداد کس قدر ہے۔ اس پر Joad یہ اضافہ کرتا ہے کہ اگر انسان کی نگاہ میں وسعت زیادہ ہو تو وہ فلاسفر کہلاتا ہے اور اگر گہرائی زیادہ ہو تو تخلیقی سائنسدان یا نطین۔ اس پر قرآن کا اضافہ یہ ہے کہ جس کی نگاہ میں وسعت اور گہرائی دونوں ہوں وہ نبی ہوتا ہے اور یہ مقام کسی اور انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ نبی ان حقائق کا علم حاصل کرنے کے بعد اُن سے ایسا ہم آہنگ ہو جاتا ہے جیسے دو کمانیں اکٹھی ملی ہوں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ ہم آہنگ فکان قاب قوسین او ادنیٰ (۵۳/۹)، عربوں میں قاعدہ تھا کہ جب دو آدمی باہمی رفاقت اور یک رنگی کا معاہدہ کرتے تو دونوں اپنی اپنی کمانیں اکٹھی کرتے اور اس طرح دو کمانوں کی ایک کمان بنا کر، مل کر ایک تیر چلاتے۔ یہ نشان (Symbol) ہوتا ان کے دو قالب و یک جان ہونے کا۔ (قاب قوسین) میں کئی ایک خطوط میں اس حقیقت کو واضح کر چکا ہوں کہ انسانی دنیا میں انسان اور خدا کا تعلق باہمی رفاقت کا تعلق ہے (خدا رفیق اعلیٰ ہے) جب انسان کا ارادہ اور عمل، قانون خداوندی کی رفاقت میں کام کرتا ہے تو کائنات میں تخلیقی اضافے (Creative Additions) ہوتے جاتے ہیں اور اس کا حسن و توازن بڑھتا جاتا ہے۔ اس سے خود انسان کی ذات ایک متوازن شخصیت (Balanced Personality) بن جاتی ہے۔ یہ ہے وحی سے مقصود۔

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں سلیم! رسول اللہ کی نبوت، تاریخ میں ایک ایسے مقام پر آتی ہے جہاں سے انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے۔ قرآن سے پہلے ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا اس لئے یہ مشکل تھا کہ اس سے اعتراف حقیقت، دلیل و برہان کی رو سے کرایا جا سکے۔ اس کے لئے بعض اوقات اس قسم کے ذہنی اکراہ (Mental Compulsion) کی ضرورت پڑتی تھی جیسے معجزات۔ یہ وہی طریقہ ہے جس سے بچوں سے بات منوائی جاتی ہے۔ لیکن نزول قرآن کے بعد مشیت نے اپنے طریق (Process) میں تبدیلی کر دی اور اب حقیقت کو معجزات کی بجائے دلیل و برہان کے زور پر پیش کیا گیا اور کہہ دیا گیا کہ جسے ماننا ہے علم و بصیرت کی بنا پر مانے۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کے بار بار مطالبہ کے باوجود قرآن اعلان کئے جاتا ہے کہ ہم نے اس آخری نبی کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا۔ اس کا معجزہ اس کی وحی (قرآن) ہے جو علم کی بنیادوں پر نازل کیا گیا ہے اور علم ہی جس کا معیار شناخت ہے۔ قرآن نے تو یہ کچھ کہا لیکن مسلمانوں نے اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر کے رسول اللہؐ کے معجزات وضع کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ہماری کتب سیرت میں سینکڑوں معجزات رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں (بعض نے تو یہ بھی کیا ہے کہ تمام انبیاء سابقہ کے معجزات گنا کر ان سے دگنے معجزات رسولؐ اللہ کی طرف منسوب کر دیئے اور اس طرح خوش ہو گئے کہ ہم نے تمام انبیاء سابقہ پر حضورؐ کی برتری ثابت کر دی ہے)

یہی معجزات، تصوف کی خانقاہوں میں پہنچ کر کرامات کی شکل میں سامنے آنے شروع ہو گئے اور "دین کی حقانیت" کا معیار قرار پا گئے، حالانکہ ان کرامتوں سے زیادہ محیر العقول کرامات، ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے ہاتھوں سے سرزد ہو جاتی ہیں اور یہ یوگی اور سنیاسی بُت پرست ہوتے ہیں۔ اس قسم کی کرامات محض فنی چیز ہے جس کا تعلق نہ کفر سے ہے نہ اسلام سے۔ نہ توحید سے ہے نہ شرک سے۔ (ان امور کی تفصیل تمہیں معراج انسانیت میں مل جائے گی)

چونکہ میرزا صاحب کے سامنے قرآن نہیں تھا اور ان کا اسلام بھی وہی تھا جو صدیوں سے مروج چلا آ رہا تھا اور وہ نبوت کو بھی از قبیلِ تصوف سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی اپنے دعوئے نبوت کی بنیاد پیشگوئیوں

پر رکھدی جواز قبیل کرامات ہی ہیں۔

اگر ان کے سامنے حقیقی اسلام ہوتا تو کم از کم یہ حقیقت ان پر کھل جاتی کہ مہدی اور مجدد کے تصوّرات یکسر غیر قرآنی اور عجمی اسلام کے پیدا کردہ ہیں جس شخص کو (قرآن تو ایک طرف) تاریخ کا بھی اتنا علم نہ ہو اس سے دعوائے نبوت بہت بڑی جسارت بھی لیکن جسے مسلمانوں جیسی قوم مل جائے اس کے لئے نبی چھوڑ کر خدا بن جانا بھی کچھ حیرت انگیز نہیں۔

اس ضمن میں یہ چیز قابل ذکر ہے کہ اُمم سابقہ پر، انکار صداقت، عذاب بالعموم طبعی (PHYSICAL) شکل میں آیا کرتا تھا آندھیاں، زلزلے، سیلاب وغیرہ۔ لیکن نزول قرآن کے بعد قوموں کے اعمال کے نتائج ان کے عروج و زوال کی شکل میں سامنے آتے تھے (مرزا صاحب کے سامنے یہ حقیقت بھی نہ تھی اس لئے وہ اپنے مخالفین کا انجام طبعی موت کی شکل میں دیکھنے کے متمنی رہتے تھے)

لیکن اُمم سابقہ اور نزولِ قرآن کے بعد کے دور میں ایک فرق ان سب سے گہرا اور اہم تھا۔ میں نے تمہیں کسی گذشتہ خط میں بتایا تھا کہ ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ اب دنیا میں انقلاب شخصیتوں کے ہاتھوں نہیں، بلکہ تصورات (Ideologiee) کے ذریعہ رونما ہوا کرے گا اور انسانی معاشرہ کی باگ ڈور اشخاص کی بجائے نظام کے ہاتھ میں ہوا کرے گی اسی حقیقت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نزولِ قرآن (یعنی ختم نبوت) کے بعد اشخاص (Individuals) کا دور ختم ہو گیا اور ان کی جگہ امتوں کا دور شروع ہو گیا۔ اسی لئے قرآن میں ہے کہ ختم نبوت کے بعد، فریضہ رسالت اور قرآنی معاشرہ کے لئے ایک امت کی تشکیل کر دی گئی (وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس.... نیز کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔

فرد کی بجائے امت کا خیال سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہوا وہ دور بھی افراد کا تھا لیکن حضرت ابراہیمؑ کی اس آرزو سے آپ کی دور نگہی کا اندازہ ہو سکتا ہے آپ نے تعمیر کعبہ کے وقت دعا مانگی کہ اے اللہ (ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک (۲/۱۲۸) ہماری نسل سے ایک ایسی امت پیدا کر جو تیرے قانون کی کامل متبع ہو۔

یہ آرزو قبل از وقت تھی۔ انسانیت ہنوز اس دور میں نہیں پہنچی تھی، جہاں اس کی کشود کار افراد کے بجائے امتوں (Community or People) کے ہاتھوں سر انجام پائے۔ لیکن اس آرزو کو شرف قبولیت عطا ہو گیا اور وہیں سے تشکیل امت کی بنیاد رکھدی گئی۔ چنانچہ اس مقصدِ عظیم کے لئے آپ کے فرزند جلیل حضرت اسمٰعیلؑ کو تخت جہانبانی کے بجائے تولیت کعبہ کے لئے مختص کر لیا گیا اور شام کی سرداری حضرت اسحاقؑ کے حصہ میں آئی۔ اس کے بعد تم غور کرو سلیم! حضرت اسحاقؑ کی نسل سے افراد (انبیاء کرام) پیدا ہوتے رہے۔ لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں کوئی ایک ممتاز فرد بھی سامنے نہیں آتا۔ اس کے برعکس، ان کی نسل سے حجاز میں ایک قوم تربیت پاتی رہی اور جب وہ پختگی تک پہنچ گئی اور انسانیت نئے دور کے لئے تیار ہو گئی تو شاخ اسحٰقؑ سے افراد کا سلسلہ ختم کر کے، شاخ اسمٰعیلؑ میں ایک آخری فرد پیدا کر دیا جس نے نظامِ انسانیت امت کے سپرد کر دیا۔ اس طرح دعائے ابراہیمی، اپنے وقت پر جا کر مستجاب ہوئی۔ اور دنیا میں افراد کی جگہ، امم نے لے لی۔ اسی لئے قرآن میں اس انداز کو "ملت ابیکم ابراھیم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کے ساتھ تشکیل امت کے بنیادی اصول بھی بدل گئے۔ دنیا میں قومیں (جو درحقیقت قبائل ہی کی پھیلی ہوئی شکلیں تھیں)، نسل اور وطن کے اشتراک سے بنتی چلی آ رہی تھیں۔ قرآن نے کہا کہ امت کی تشکیل، اشتراک ایمان (Ideology) کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے پہلے بھی حضرات انبیاء کرام اپنی جماعتوں کی تشکیل ایمان ہی کی بنیاد پر کرتے رہے تھے۔ لیکن انکی جماعتوں نے عالمگیر شکل اختیار نہیں کی تھی۔ امت کی عالمگیریت قرآن ہی کے دور سے شروع ہوئی: انسانیت کی تاریخ میں یہ بھی ایک بہت بڑا انقلاب تھا۔ ایسا بڑا اصولی انقلاب کہ انسان اس تیرہ سو سال میں بمشکل اس کی اہمیت کو پہچان سکا ہے۔ وہ ابھی تک اپنے پرانے تصورات (رنگ، نسل و وطن) کی بنا پر قوموں کی تشکیل کرتا رہا ہے اور ہزار خون خرابے کے بعد اب کہیں جا کر اسکی سمجھ میں بات آنی شروع ہوئی ہے کہ امت کی تشکیل وحدت تصور کی بنا پر ہونی چاہیئے نہ کہ اشتراک وطن و نسل کی بنیاد پر۔

تم نے دیکھا سلیم! نبوتِ محمدیہؐ سے کس طرح انسان کی تاریخ دو حصوں میں بٹ چکی ہے اور قرآن کے ساتھ کس طرح انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے، لیکن اس تیرہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں کا سارا زور اسی پر

صرف ہوتا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو قرآن سے پہلے زمانے کے "مذہب" میں تبدیل کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اور آج جو اسلام دنیا میں مروّج ہے وہ زمانۂ قبل از قرآن کا مذہب ہو تو ہو قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں لیکن دنیا خود زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر قرآنی انقلاب کو اپناتی چلی جارہی ہے۔ اس لئے میرا اندازہ یہ ہے کہ قرآنی انقلاب کا مستقبل، موجودہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہیں، بلکہ ان غیر مسلم قوموں کے ہاتھ میں ہے جو غیر شعوری طور پر اس کے قریب آتی چلی جارہی ہیں۔ اگر ان کے سامنے قرآن اس کے اصلی رنگ میں پیش کر دیا جائے، تو مجھے بڑی توقع ہے سلیم! کہ وہ اسے قبول کرنے میں قطعاً تامل نہیں کریں گے۔ ان قوموں کے مفکرین کے جو خیالات میرے سامنے آرہے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس انقلاب کی تلاش میں کس طرح سرگرداں پھر رہے ہیں جو قرآن کی دفتین میں پوشیدہ ہے۔ اس وقت اُن کے سامنے قرآن نہیں لیکن اگر ان کے سامنے قرآن پیش کر دیا جائے تو وہ اس پر لبیک کہیں گے۔ اس لیے کہ وہ خود اس قسم کے انقلاب کی تلاش میں ہیں۔ جب اُن کے سامنے قرآنی حقیقت آئے گی تو اِس قسم کے خیالات اُن کے سدّ راہ نہیں ہوں گے کہ یہ دعوت اس تعلیم کے خلاف ہے جو ہم میں ہزار برس سے متوارث چلی آرہی ہے، جو ہمارے اسلاف کا مسلک تھا۔ وہ قرآن کے پیش کردہ مسلک کو اس کی (Face Value) پر پرکھیں گے اور (On merit) اس کا جائزہ لیں گے۔ قرآن نے یہی معیار اپنی صداقت کے لئے پیش کیا ہے، قرآن اس معیار پر پورا اترے گا۔ اور چونکہ انہیں اب خود اس انقلاب کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو قرآن پیش کرتا ہے' اس لئے وہ قرآنی انقلاب پر لبیک کہیں گے۔ یہ ہیں وجوہات میرے اس اندازے کے، کہ قرآنی انقلاب کی آماجگاہ غیر مسلم اقوام کے نشیمن بن سکیں گے موجودہ مسلمانوں میں غالباً کوئی خطہ بھی اسے اپنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا[1]۔ اس لئے کہ تمام اسلامی ممالک از منۂ متوسطہ کے انسانوں کے خود ساختہ مذہب کو ابدی حقیقتیں سمجھے بیٹھے ہیں اور ان سے ایک قدم ہٹنے، یا کم از کم اُن پر غور و فکر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ جس قوم کا انداز نگاہ Attitude of Mind یہ ہو کہ ہم کسی ایسی بات کے سننے

---

[1] میں ترکی کے جدید رجحانات کا بنظر غائر مطالعہ کر رہا ہوں۔ اگر انہیں اب بھی قرآن مل جائے تو اُن سے عمدہ توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔

کے لیے بھی تیار نہیں جو اس مسلک کے خلاف ہو جو ہم میں متوارث چلا آرہا ہے، خواہ وہ بات خود قرآن ہی کی کیوں نہ ہو، وہ قوم قرآن سے کس طرح مستفید ہو سکتی ہے؟ مجھے سلیم! بیس برس ہو گئے، اتنی سی بات کہتے ہوئے کہ بھائی جو بات بھی جائے اسے علیٰ وجہ البصیرت (On its merits) پرکھ کر دیکھو کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ در آنحالیکہ ہمارے پاس ہر بات کے پرکھنے کا معیار (قرآن) بھی موجود ہے۔ لیکن اس تمام عرصہ میں اتنی موٹی سی بات مسلمان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ وہ بنیاد ہے جس پر قرآنی عمارت استوار ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں یہ بنیاد ہی تیار نہیں ہو سکتی۔ ان کے برعکس غیر مسلم قومیں از خود اس مقام پر موجود ہیں، جہاں سے قرآن اپنی دعوت کا آغاز کرتا ہے یعنی اس کی دعوت کو علیٰ وجہ البصیرت پرکھنا۔ اس لئے جو کام یہاں شاید صدیوں تک بھی نہ ہو سکے گا، وہاں وہ کام پہلے سے ہو چکا ہے۔ قرآن زندہ قوموں کو دعوت دیتا ہے لینذر من کان حیا (۳۶/۷۰)، وہ قبرستان میں وعظ نہیں کہتا۔ وہ مُردوں کو مُلّاؤں کے سپرد کرتا ہے اور خود ان قوموں کی تلاش کرتا ہے جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے

یہاں پہنچ کر تمہارا وہ سوال خود بخود میرے سامنے آجاتا ہے کہ کہیں میں نے بھی اپنی عمر مُردوں ہی کو وعظ سنانے میں تو صرف نہیں کر دی۔ اُس وقت تو میں نے تمہاری بات اَن سُنی کر دی تھی، لیکن اب سوچتا ہوں کہ بات تھی غور طلب! سچ کہہ گیا ہے سعدی کہ

گاہ باشد کہ .... (باقی تم خود سمجھ لو)

لیکن سلیم! اسے تو خود تم بھی تسلیم کرو گے کہ تم بھی بالآخر اسی فضا سے اُبھرے ہو، جس میں، مَیں وعظ کہتا چلا آرہا ہوں۔ اور تمہارے جیسے کئی اور قلبِ سلیم ہیں جو اس وقت قرآن کی آواز کو اپنے لئے نشیدِ حیات بنائے ہوئے ہیں۔ میری "آہِ نیم شبی اور نالۂ سحر گاہی" کا اتنا صلہ بھی کم نہیں۔

کیوں؟ کیا خیال ہے تمہارا؟

والسلام

جنوری۔ ۱۹۵۳ء

استدراک

اس خط کی اشاعت کے بعد مجھے ایک صاحب فکر اور صاحب قلم دوست کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں بعض مقامات کی وضاحت طلب کی گئی تھی۔ وہ خط اور اس کا جواب ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔

خط

اے محترم: میری خوش قسمتی ہے کہ میں آپ کے عہد میں پیدا ہوا اور آپ کے تعارف کا شرف حاصل کر سکا ورنہ کیا خبر کہ کفر و الحاد کے کس عمیق ترین گڑھے میں تشکک و انکار کے بھاری پتھروں کے نیچے دبا ہوا ہوتا۔ آپ کے خطوط کی ضیا پاشیوں نے میرے ذہن و دماغ کے تاریک ترین گوشوں کو رشک شب چہاردہم بنا دیا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہتی جب میں یہ سوچتا ہوں کہ مجھے ایک ایسی جامع العلوم ہستی سے تخاطب کی سعادت حاصل ہے جس کا دامن ملائیت کی گرد سے بالکل پاک ہے۔ جس کے ہاں اظہار اختلاف اور وضاحت طلبی نہ موجب تکفیر ہے نہ قابل دار۔ الحمد للہ علیٰ ذالک

گزشتہ جنوری میں سلیم کے نام آپ نے جو الطاف نامہ (زیادہ صحیح یوں کہ حقائق نامہ) تحریر فرمایا ہے، سابقہ خطوط کی طرح اس نے میرے بہت سے شبہات زائل کئے اور بہت سے نئے نکتے سکھائے۔ خصوصًا والنجم اذا ھوٰی پر آپ نے جو روشنی ڈالی ہے اور "النجم" کو آیات مابعد کے ساتھ جو تطبیق دی ہے وہ تیرہ صدیوں کی تفسیری تاریخ میں ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ ہمارے بزرگ مفسرین نے آج تک ان آیات کو ابہام و تصوف کی چیستان بنا رکھا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ زمین پر تو اس کا مطلب حل نہیں ہوتا تو آسمان کی پرواز شروع کر دی۔ اب نہ کوئی آسمان پر جا کر واپس آئے اور نہ ان کی غلطی پکڑ سکے۔ اور انکار کرے تو کافر۔

اسی نامہ گرامی میں بعض سطور ایسی بھی نظر سے گزریں جن کے متعلق مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سر دست صرف ایک مقام کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں۔ ممکن ہو تو آیندہ خط میں ان پر تفصیلی نظر ڈالیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ

> امم سابقہ پر، انکار صداقت کی پاداش میں عذاب طبعی Physical شکل میں آیا کرتا تھا

آندھیاں، زلزلے، سیلاب وغیرہ۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد قوموں کے اعمال کے نتائج اُن کے عروج و زوال کی شکل میں سامنے آنے لگے۔

آپ نے دو باتیں فرمائی ہیں

۱۔ عذاب بشکل طبعی زمانہ قبل قرآن سے مخصوص تھا۔

۲۔ عذاب بشکل عروج و زوال زمانہ بعد قرآن کے لئے مخصوص ہے۔

تاریخ عالم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ازمنہ ماضیہ میں عذاب طبعی کے ساتھ عروج و زوال کا عذاب بھی آتا رہا ہے۔ آپ اس سے یقیناً بے خبر نہیں ہوں گے اس لئے شواہد کی ضرورت نہیں۔ اب رہی دوسری بات کہ "نزول قرآن کے بعد صرف عروج و زوال کا عذاب باقی رہ گیا ہے اور طبعی عذاب آندھیاں، زلزلے، سیلاب وغیرہ کا تعلق قوموں کے اعمال کے نتائج سے نہیں رہا" یہ نظریہ محل نظر ہے۔ کیونکہ قوموں کی بداعمالیاں اب بھی موجود ہیں اور یہ طبعی حوادث بھی رونما ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک خالص مادی آدمی بہت سے دلائل کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ان کا اعمالِ اقوام سے کوئی تعلق نہیں اور ایک خالص مذہبی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان کا ظہور انسانی اعمال سے وابستہ ہے۔ دلائل وہ بھی کچھ نہ کچھ دے ہی سکتا ہے۔ میں اور آپ خدا کے فضل سے نہ تو مادیات کو نظر انداز کر سکتے ہیں (کیونکہ یہ بھی تو اللہ ہی کی چیزیں ہیں) اور نہ ہی قرآن سے صرفِ نظر کرنا جائز سمجھتے ہیں (اس لئے کہ یہ خدا کا قانون ہے) اس لئے ہمیں دونوں پہلوؤں کو متوازن رکھ کر سمجھنا ہوگا، اور آپ تو بفضلہٖ پہلے سے اس کا بہت خیال رکھتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ اسلوب اعتدال و توازن آپ ہی سے سیکھا ہے فجزاکم اللہ

آج ہی کا ذکر ہے کہ میں ظہر کے بعد سورۂ "اعراف" کو دیکھ رہا تھا، اس میں مختلف اقوام اور ان کے اعمال و سزائے اعمال کا ذکر سامنے آگیا، اس موقع پر مجھے شدت سے محسوس ہوا کہ آپ نے کوئی بامحاورہ اور محشیٰ ترجمہ قرآن کیا[1] ہوتا تو بہت سے نکتے گھر بیٹھے ہی حل ہو جاتے اور آپ کو بار بار تکلیف دینے کی ضرورت

---

[1] میں اس کام پر بھی ایک عرصہ سے لگا ہوا ہوں۔ اللہ اسے جلد تکمیل تک پہنچا دے۔
(پرویز)

پیش نہ آتی ـــــ اب سنئے میرے تاثرات جو آپ کے نامۂ گرامی کی مذکورہ بالا سطور اور اس سورہ کے مطالعے سے پیدا ہوئے۔

سب سے پہلے نوح علیہ السلام کا ذکر ہے جو ختم ہوتا ہے اس آیت پر

"ہم نے ان لوگوں کو غرق کر دیا، جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا"

اس کے بعد ہود علیہ السلام کا بیان ہے جس کا خاتمہ حسب ذیل ہے۔

"ہم نے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا"

پھر صالح اور شعیب علیہما السلام کا تذکرہ ہے ان کے مخاطبین کا انجام یہ ہے کہ

"ان کو رجفہ (بھونچال) نے آپکڑا"

ان دونوں بزرگوں کے درمیان لوط علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ ان کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:۔

"ہم نے ان پر ایک بارش برسائی، پھر دیکھو ان مجرموں کا انجام کیا ہوا؟"

یہ پانچ قومیں ہیں اور آپ کی تعبیر صحیح کے مطابق ان کو طبعی عذاب کی سزا ملی۔ اس سلسلۂ بیان کے بعد فرماتے ہیں کہ

> اگر بستیوں کے باشندے ایمان و تقویٰ اختیار کرتے تو ہم زمین و آسمان کی برکتیں ان کے لئے فراخ کر دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا اور ہم نے ان کے کرتوت کے سبب گرفتار عذاب کیا۔ کیا بستیوں کے باشندے ایسے نڈر ہو گئے کہ ان کو ہمارا عذاب راتوں رات آ پہنچے اور وہ سوتے ہوئے ہوں ـــــ اور کیا اہل بلاد بے خوف ہو گئے کہ دن کو ہمارا عذاب انہیں آئے اور وہ کھیل میں مگن ہوں۔

ان آیات سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبعی برکات، بارش، ہوا، اناج وغیرہ کا تعلق ایمان و تقویٰ سے ہے اور طبعی عذاب، زلزلہ، سیلاب وغیرہ کا باعث تکذیب اور دوسرے انسانی اعمال (بما کانوا یکسبون)

ہیں ۔ اور اس میں کسی خاص عہد کی قید نہیں کہ پہلے ہوتا تھا اور اب نہیں ہوگا۔

اب جو میں نے زیادہ سوچا تو میرے خیال میں بعض دوسری آیات بھی آئیں جو میرے اس شبہ کی مؤید ہیں (یہ شبہ جو آپ کی مذکورہ بالا سطور سے پیدا ہوا۔) مثلاً سورۂ فاطر میں ہے:۔

> برا مکر خود اہل مکر ہی کو گھیر لیتا ہے، پھر یہ رکتی ؛ لوگ اگلے زمانے والوں ہی کی پاداش کی روش کے منتظر ہیں اور اللہ کی روش میں تم کوئی تبدیل و تحویل نہیں پاؤ گے۔

یعنی جیسے طبعی عذاب یا قومی زوال کی سزا اگلوں کو ملی زمانہ قرآن کے مکذبین کو بھی ملے گی۔ اور یہ ایک ایسا قانون ہے جو اٹل ہے۔ سورۂ انعام میں ہے:۔

> اللہ قادر ہے اس پر کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے۔ یا تمہارے پاؤں تلے سے۔ یا تم کو آپس میں بھڑا دے

یہ تین عذاب ہیں۔ ان میں سے پہلے دو طبعی سمجھے جاتے ہیں اور یہ عام ہیں کسی زمانہ سے مختص نہیں۔ سورہ "ملک" کے آخر میں ہے

> کہہ دے، خیال تو کرو۔ اگر تم پانی سے محروم کر دیئے جاؤ، تو پھر کون ہے جو تمہیں خوشگوار پانی لا کر دے۔

یہ بھی میرے شبہ کی تائید ہے

محترم میں کوئی مضمون نگاری تو کر نہیں رہا کہ خواہ مخواہ بات کو طول دوں۔ آپ اس مختصر گزارش سے میرے مفہوم کو بہ تمام و کمال سمجھ گئے ہوں گے۔ میں نے آیات کے الفاظ اور باقاعدہ حوالے نقل نہیں کئے، اس لئے کہ یہ اور اس مفہوم کی اور بہت سی آیات پہلے سے آپ کے سامنے ہوں گی، اگر آپ اس عریضے کو "طلوع اسلام" میں چھپنے کے لئے بھیج دیں تو اس کے جواب سے جو آپ دیں گے بہت سے ایسے دوستوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے جو مروجہ تراجم قرآن کی بنا پر میری طرح اس شبہ میں گرفتار ہوئے ہوں گے۔

والسلام مع الکرام

جواب

میں اپنے واجب الاحترام کرمفرما کا (جن کے خلوص اور محبت کی میرے دل میں خاص قدر ہے، بدل

شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ان نکات کی وضاحت اس انداز سے طلب فرمائی

جہاں تک میں قرآن سے سمجھ سکا ہوں، قوموں کے عروج و زوال سے متعلق ایک واضح قرآنی اصول تو یہ ہے کہ جو قوم اپنے معاشرہ کو قانونِ خداوندی کے مطابق متشکل کر لیتی ہے وہ قانونِ خداوندی کے ثمرات سے مالا مال ہو جاتی ہے۔ اسے زندگی کی خوشگواریاں اور مرفہ الحالیاں نصیب ہو جاتی ہیں۔ ان کا حال بھی تابندہ ہوتا ہے اور مستقبل بھی درخشندہ۔ ان کے برعکس جو قومیں اپنے معاشرہ کو اپنے خود ساختہ آئین کے تابع رکھتی ہیں اور اسی طرح ضوابطِ خداوندی سے اعراض برتتی ہیں ان کے معاشرہ میں فساد رونما ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ قوموں کے عروج و زوال کا یہ ابدی قانون شروع سے آج تک مسلسل چلا آتا ہے۔ زمانۂ قبل از قرآن میں بھی یہی قانون نافذ تھا اور آج بھی قوموں کی تقدیروں کے فیصلے اسی کے مطابق ہوتے ہیں۔

لیکن قوموں کی سزا کی ایک اور شکل بھی قرآن میں آئی ہے اور یہ وہ شکل ہے جسے میں نے طبعی عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کسی قوم کا بارش کے سیلاب، آندھی کے طوفان، بھونچال کے جھٹکے اور کوہ آتش فشاں کی شرر باریوں سے ہلاک ہو جانا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، عذاب کی یہ شکل زمانہ قبل از قرآن تک محدود رہی ہے اس کے بعد اس کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب قوموں کے عروج و زوال کا وہ پہلا اصول کارفرما ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ آج بھی آندھیاں آتی ہیں، بارشیں ہوتی ہیں، زلزلے آتے ہیں اور آتش فشاں پہاڑ پھٹتے ہیں، وبائیں پھیلتی ہیں اور ٹڈی دل کی یورشیں بھی ہوتی ہیں ان سے قوموں کے نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں اور زمانۂ قبل از قرآن کے اسی قسم کے حوادث میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اس زمانہ میں خدا کا رسول اپنی قوم کو قبل از وقت آگاہ کرتا تھا کہ تم فلاں فلاں جرائم سے باز آ جاؤ، ورنہ سیلاب یا آندھی یا آتش فشانی کے عذاب سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ وہ قوم اس تنذیر سے اعراض برتتی، اس کے بعد وہ رسول، مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر قبل از وقت الگ ہو جاتا اور فاسقین کی قوم موعودہ عذاب سے تباہ ہو جاتی۔ قرآن میں جہاں ان اقوام کی اس قسم کی ہلاکت کا ذکر آیا ہے اس کے ساتھ ہی اس کی صراحت بھی موجود ہے کہ ہم نے مومنین کی جماعت کو

اس سے محفوظ رکھا۔

قرآن کے ساتھ حسّی معجزات کا دور ختم ہو گیا۔ طبعی حوادث کا سلسلہ اب بھی جاری ہے لیکن اب یہ حوادث نہ کسی رسول کی وعید کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں اور نہ ہی مؤمن اور فاسق میں کوئی فرق کرتے ہیں۔ اب اگر کہیں زلزلہ آتا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس خطے کے لوگوں نے خاص طور پر قانون خداوندی سے سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور دنیا کے باقی خطے جہاں وہ زلزلہ نہیں آیا مومنانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ ہی ایسی صورت ہوتی ہے کہ اس زلزلہ سے صرف بدکار لوگ مرتے ہیں اور نیکو کار محفوظ رہتے ہیں۔ وہ زلزلہ طبعی قوانین کے مطابق ظہور میں آتا ہے اور جو اس کی زد میں آجائے ہلاک ہو جاتا ہے۔ اگر اب بھی جرائم کی سزائیں طبعی حوادث کے ذریعہ ملتیں تو میرا خیال ہے (اور آپ بھی یقیناً اس سے متفق ہوں گے) کہ دنیا کی ساری آبادی کبھی کی غرق ہو چکی ہوتی۔ آج کونسا خطۂ زمین ہے جہاں قانون خداوندی کی علانیہ تکذیب نہیں ہو رہی۔ میرا خیال ہے کہ ان اشارات سے سورۂ اعراف کی ان آیات کا مطلب واضح ہو گیا ہو گا جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

اب لیجئے وہ باقی دو تین آیات جن کی طرف آپ نے متوجہ کیا ہے۔ سورۂ فاطر کی محولہ صدر آیت میں ارشاد ہے۔

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (۳۵/۴۳)

ناہموار تدبیریں کرنے والوں کی تدبیروں کا وبال خود ان ہی کے اوپر پڑتا ہے۔

خود یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہ عذاب طبعی حوادث کی شکل میں نہیں آتا۔ بات بالکل واضح ہے کہ جو معاشرہ ناہموار خطوط پر متشکل ہوتا ہے وہ خود ان ناہمواریوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

یہ وہ سنّت ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

سورۂ "ملک" کی آیت یہ ہے۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُکُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْکُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ (۶۷/۳۰)

اُن سے کہو کہ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اگر پانی زمین کی ترائی میں اُتر جائے تو تمہارے چشموں سے نہریں کیسے جاری ہوں۔

اس آیت میں ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی کسی حد تک تفصیل اس خط میں بیان کر چکا ہوں جو دسمبر ۱۹۵۶ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے اس میں دیکھا ہو گا کہ قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے "ذرا سوچو کہ اس میں تمہاری ہنرمندی کا حصہ کس قدر ہوتا ہے اور ہمارے قوانین اس میں کیا کچھ کرتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن اس نتیجہ کو سامنے لاتا ہے کہ تم تمام پیداوار کے واحد مالک کس طرح بن سکتے ہو۔ وہاں (سورۂ الواقعہ) میں ہے:

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ...... لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْکُرُوْنَ ۝ (۵۶/۶۸-۷۰)

کیا تم نے اس پانی پر بھی غور کیا جسے تم پیتے ہو۔ اگر ہم اس پانی کو کھاری بنا دیتے تو تمہاری ہنرمندی اس میں کیا کر لیتی۔ پھر تم خدا کی اس بخشائش کو اس کے صحیح مقام میں صرف کیوں نہیں کرتے۔

یہی وہ چیز ہے جسے سورۂ "ملک" کی مندرجہ بالا آیت میں یہ کہہ کر بیان کیا گیا ہے کہ اگر وہ پانی جس پر تمہاری کھیتیوں کا دار و مدار ہے زمین کے اوپر نہ آتا تو تم کیا کر لیتے۔ ظاہر ہے کہ اس میں جرائم کی پاداش میں طبعی عذاب کا کوئی پہلو نہیں۔

اب سورۂ انعام کی اس آیت کو لیجئے جس سے آپ کو شبہ ہوا ہے کہ اس میں طبعی عذاب کا ذکر ہے۔ آیت یوں ہے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِکُمْ

---

[1] دیکھئے بارہواں خط۔

أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ ۗ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ (۶/۶۵)

اُن سے کہدو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب پیدا کردے یا نیچے سے یا مخلوط طور پر تمہیں پارٹیوں میں تقسیم کردے۔ اور پھر یہ پارٹیاں ایک دوسرے سے ٹکراتی رہیں۔ ذرا غور کرو ہم کس طرح اپنے قوانین کو مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ حقیقت کو سمجھ سکیں۔

بات بالکل صاف ہے۔ یہاں کسی قوم کی تباہی کے تین طریقے بتائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ قوم کا طبقۂ اعلیٰ ظلم و استبداد شروع کردے اور اس طرح نیچے کا طبقہ کچلا جائے اور کچھ عرصہ کے بعد نہ اوپر کا طبقہ باقی رہے نہ نیچے کا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قوم کے نیچے کا طبقہ فساد انگیزیاں شروع کردے اور اس طرح معاشرہ میں بدنظمی پیدا ہو کر تباہی کا موجب بن جائے۔ اور تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس قسم کی پارٹیاں بنیں جن میں اوپر اور نیچے کے طبقات مخلوط طور پر شامل ہوں (جیسا کہ لَبَسَ سے واضح ہے) اس طرح یہ پارٹیاں ایک دوسرے کی مخالفت سے ساری قوم کو برباد کردیتی ہیں۔ اگر غور کیجئے تو قرآن کے اس بیان میں ایک خاص ترتیب بھی ہے۔ پہلے اوپر کا طبقہ قوم کو استبدادی شکنجہ میں کستا ہے۔ جب ان کی گرفت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے تو نیچے کا طبقہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ شکاری قسم کے لوگ اس صورتِ حال کو (Exploit) کرتے ہیں اور اس طرح قوم پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے۔ اس سے خانہ جنگی شروع ہوتی ہے جس کا نتیجہ بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہے وہ عذاب جس کی طرف قرآن نے مندرجہ بالا آیت میں اشارہ کیا ہے۔

میں نے اس مقام پر صرف اشارات کو کافی سمجھا ہے۔ ان تمام امور کی تفصیل میری زیرِ تسوید تصنیف "قرآنی نظامِ ربوبیت" میں ملے گی۔ جس میں میں نے بتایا ہے کہ صحیح خطوط پر متشکل معاشرہ کس طرح زمین و آسمان کی برکات سے متمتع ہوتا ہے اور اس کے برعکس ناہمواریاں پیدا کرنے والا معاشرہ کس جہنم کی زندگی بسر کرتا ہے۔ قرآن کی وہ تمام آیات جو معاشرتی عذاب سے متعلق ہیں وہاں سامنے آجائیں گی۔ والسلام

پرویز (فروری ۱۹۵۳ء)

سلیمؔ کے نام سولھواں خط

(مقام رسالت)

یہ تو سلیم! میں نے اسی دن سمجھ لیا تھا جب پچھلا خط لکھا ہے کہ تم مقام نبوت سمجھ لینے کے بعد ضرور پوچھو گے کہ مقام رسالت کیا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے میں سمجھتا ہوں اُن الفاظ سے زیادہ موزوں الفاظ شاید ہی کہیں اور مل سکیں جن سے علامہ اقبالؒ نے اپنے پانچویں خطبہ کا افتتاح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> محمدؐ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (حضرت عبد القدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے، جو ایک فقرہ کے اندر شعور نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ اور جب واپس بھی آتا ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ آتا ہے کہ زمانہ کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے۔ اور اس طرح مقاصد و مطامح کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔

ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو۔ کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے، اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی روح سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔

جیسا کہ میں "معراجِ انسانیت" میں لکھ چکا ہوں، حقیقتِ کُلی کا ادراک خاصۂ نبوت ہے۔ یہ یکسر وہبی ہوتا ہے، اور غیر از نبی اس میں شریک نہیں ہو سکتا، اکتسابی طور پر ادراکِ حقیقت کی جو کوششیں کی جاتی ہیں، ان سے انسان کی بعض داخلی قوتوں کی نشوونما (Development) ہو جاتی ہے۔ ایسا شخص، اس چیز مدارجِ انسانیت کا معراجِ کمال سمجھ کر کیف و مستی کی انفرادی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ نوعِ انسانی کے لئے اس کے پاس کوئی پیغام نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے، نبی کو مشاہدۂ حقیقت اس لئے کرایا جاتا ہے کہ وہ ضمیرِ کائنات سے وہ پیغام اپنے ساتھ لائے جس سے انسانوں کی دنیا میں انقلاب پیدا ہو جائے اور وہ اس صورِ اسرافیل سے معاشرہ میں حشر برپا کر دے۔ وہ اس ادراکِ حقیقت سے ان مفاسد کی علت العلل کو بے نقاب دیکھ لیتا ہے جن کی وجہ سے معاشرہ کی کوئی شے اپنے صحیح مقام پر باقی نہیں رہتی۔ اس تشخیص کے بعد، ان مفاسد کا علاج بھی اس کی نگاہوں کے سامنے کھلے کھلے انداز میں آجاتا ہے۔ یہ ہے منصبِ نبوت۔ یعنی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لینا۔ رموزِ کائنات سے اس طرح آگاہ ہو جانے سے انسان جن فردوس آگیں کیفیات سے لذت اندوز ہوتا ہے، اس کا کبھی جی نہیں چاہتا کہ اس کی توجہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی دوسری طرف منعطف ہو جائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

لیکن ایک نبی پر انکشافِ حقیقت اس لئے نہیں کیا جاتا ہے کہ وہ اس کی کیف آور لذتوں میں جذب ہو کر رہ جائے،

اس سے بہت بڑا کام لینا ہوتا ہے۔ وحی کے ذریعے اسے جو قوتیں عطا ہوتی ہیں وہ درحقیقت اس مقصد عظیم کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہیں، جس کے لئے اسے مامور کیا جاتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ

دیکھا ہے جو کچھ تو نے اوروں کو بھی دکھلا دے!

اور اس طرح انسانوں کی دنیا میں وہ تحیر انگیز انقلاب پیدا کر دے جس سے آغشتۂ خاک و خون آدم، شرفِ انسانیت کی بلندیوں تک جا پہنچے اسے منصبِ رسالت کہتے ہیں۔ یعنی وحی کی روشنی میں انسانی معاشرہ میں انقلاب آفرینی اس سے تم نے سمجھ لیا ہوگا سلیم! کہ نبوت بلا رسالت، بے معنی ہے اور رسالت بلا نبوت ناممکن۔ یعنی اگر نبی، قوانین خداوندی (وحی) کے مل جانے کے بعد، کنج تنہائی میں خاموش بیٹھا رہے تو اس نبوت کے کچھ معنی ہی نہیں۔ اور اگر کوئی شخص، قوانین خداوندی (وحی) سے الگ ہٹ کر انسانی معاشرہ میں انقلاب پیدا کرنا چاہے تو یہ انقلاب کبھی انسانیت کے عروج و ارتقاء کا موجب نہیں بن سکتا۔ لہٰذا نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ایک قوت ہے اور دوسری اس کی عملی تعبیر، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ایک ہی شخصیت کو کہیں نبی کہا گیا ہے اور کہیں رسول۔ منصبِ رسالت (یعنی پیام رسانی اور انقلاب آفرینی) کی یہ ذمہ داریاں اتنی اہم اور صبر آزما ہوتی ہیں کہ جب نبی اکرمؐ اُن سے عہدہ برا ہوئے ہیں تو قرآن نے کہا کہ

ووضعنا عنك وزرك الذی انقض ظھرك (۹۴/۲-۳)

اور ہم نے تجھ سے تیرا وہ بوجھ اتار دیا جس نے تیری کمر توڑ رکھی تھی

یہی تھیں وہ ذمہ داریاں جن کی طرف آپ کو اس وقت بلایا گیا جب آپ غارِ حرا کی تجرد گاہ میں نبوت سے سرفراز کئے گئے۔ اس وقت ندائے جمال نے آپ کو پکارا اور کہا کہ

یَآیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ[۱]

---

[۱] اس کے معنی کئے جاتے ہیں

اے کپڑا اوڑھنے والے۔ اُٹھ

[یہاں سے سورۂ مدثر کی آیات مسلسل آتی جائیں گی۔]

سلیم! اس خطاب (مدثر) پر غور کرو۔ آنے والی ذمہ داریوں کی تصویر سامنے آجائے گی۔ جب پرندے اپنے گھونسلوں کو درست کرتے ہیں تو اسے تدثیر کہتے ہیں۔ اسے انگریزی میں کہیں گے (To set one's house in order) اسی لئے نہایت اچھے منتظم کو دثرالمال کہتے ہیں۔ جب درخت، خزاں کے بعد نئی کونپلیں اور پتے نکالتے ہیں تو اسے بھی تدثیر کہتے ہیں۔ لہٰذا المدثر کے معنی ہوئے۔

کائنات کو سنوارنے والا۔

انسانیت کے گھرانے کو درست کرنے والا۔

آدمیت کی شاخ خزاں دیدہ کو گلہائے رنگا رنگ سے حلوہ بار کرنے والا۔

اسلئے کہا یہ گیا کہ اے وہ جس کے ذمے اس قدر اہم فرائض عائد ہوتے ہیں قم!

خیز و بخاک تشنہ بادۂ زندگی فشاں

اُٹھ! اور اس انقلاب آفریں دعوت حق و صداقت سے دنیائے انسانیت میں حیات انگیز تحرک پیدا کر دے جس سے تمام نظامہائے کہن کی بنیادیں ہل جائیں اور بساطِ کائنات جدید خطوط پر متشکل ہو جائے۔

خیز و قانونِ اخوت سازدہ　　جام صہبائے محبت بازدہ
باز در عالم بیار ایام صلح　　جنگجویاں را بدہ پیغام صلح
باز ایں اوراق را شیرازہ کن　　باز آئینِ محبت تازہ کن

قُمْ! اُٹھ۔ اور فَاَنْذِرْ۔

نذر کے معنی تو تم جانتے ہی ہو سلیم! منت ماننا۔ جس چیز کو انسان اپنے اوپر واجب قرار دے لے اسے نذر کہتے ہیں۔ یہیں سے انذار ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی کو اس کے فرائض و واجبات کی یاد دلانا۔ جب کسی معاشرہ میں فساد رنا ہمواریاں، عام ہو جائیں تو اس وقت بھی بعض افراد ضرور ایسے ملیں گے جنہیں اس کا احساس ہو گا کہ انسانیت غلط راستے پر جا رہی ہے۔ لیکن نہ تو انہیں یہ معلوم ہو گا کہ صحیح راہ کونسی ہے اور نہ ہی یہ

کہ معاشرہ کو صحیح خطوط پر متشکل کرنے کا طریق کیا ہے ان کے دل میں فقط ایک تڑپ ہوگی، خلش ہوگی، تپش ہوگی۔ اس کا احساس ہوگا کہ جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہے لیکن اس کا علاج کچھ نہیں سوجھے گا یعنی ان لوگوں میں زندگی کے آثار ہوتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو رسول کی اس دعوتِ انقلاب پر سب سے پہلے لبیک کہتے ہیں اسی لئے قرآن نے کہا ہے

لِيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا... (۳۶/۷۰)

تاکہ تو اسے اس کے واجبات سے آگاہ کرے جس میں زندگی کے آثار ہیں۔

اس مقصدِ عظیم (مشن) کو ساتھ لے کر، نبی — اتر کر حرا سے سوئے قوم آتا ہے اور ان پیکروں کو اپنے گرد جمع کرنے کی دعوت دیتا ہے جن میں زندگی کے امکانات ہوتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے، ان کی نگاہوں میں معاشرے کی اقدار بدلتا ہے۔ یہ تو تم جانتے ہو سلیم! کہ

قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگاہ

کائنات کا سارا نقشہ اقدار Values کے مطابق مرتب ہوتا ہے، جس قسم کی اقدار ہوں گی اسی قسم کا معاشرہ ہوگا۔ اقدار بدل دیجئے معاشرہ خود بخود بدل جائے گا۔ جوڈ کے الفاظ ہیں۔ "اگر تم اقدار کے متعلق تصورات بدل دو تو اس سے اندازِ زیست بدل جائے گا۔ اسی کا نام معاشرہ کی تبدیلی ہے" Decadence ذرا غور کرو سلیم! کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں بڑائی کے معیار کیا ہوتے ہیں؟ (خود اپنے ہی معاشرہ پر غور کرو، کہ اس سے زیادہ بگڑا ہوا معاشرہ اور کہاں ملے گا؟) بڑائی کے معیار؟ دولت کی فراوانی (بلا تمیز اس کے کہ دولت کہاں سے آئی ہے اور کس طرح حاصل کی گئی ہے) جاہ و منصب (بلا تفریق اس کے کہ وہ منصب حاصل کس طرح کیا گیا ہے اور اس صاحبِ منصب میں اس کی اہلیت بھی ہے یا نہیں) قوت و اقتدار (اس شرط کے بغیر کہ اس قوت کو استعمال کس طرح کیا جا رہا ہے)۔ یہی ہیں ناں تمہارے معاشرے میں بڑائی کے معیار؟ اور ان ہی معیاروں کا ماحصل ہے ناں وہ جہنم جس میں سارا معاشرہ مبتلا ہے؟ رسول آتا ہے اور سب سے پہلے بڑائی کا معیار بدل دیتا ہے اس کی دعوت کی بنیاد ہوتی ہے۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ[1]

بڑائی اور کبریائی کا راز ربوبیت میں ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ تعریف و توصیف کا مستحق صرف وہ ہے جو ربوبیت عامہ کا کفیل ہے۔ یہی معیار تکریم و تعظیم ہے۔ یعنی جو معاشرہ یا اجتماعی نظام افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا ذمہ دار بنتا ہے وہی واجب التکریم ہوتا ہے اور تعظیم بھی ان ہی افراد کی ہو سکتی ہے جو اپنی محنت کے ماحصل کو نوعِ انسانی کی ربوبیت کے لئے عام کر دیں۔

اس اعلانِ عظیم کے بعد، رسول کو وہ اصولی ہدایات دی جاتی ہیں جن پر اس کی دعوتِ انقلاب کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ[2]

تمہیں یاد ہے سلیم! جب ہم سرحد گئے تھے تو ایک گاؤں سے باہر، ایک شخص ٹیلے پر کھڑا زور زور سے کپڑا ہلا رہا تھا اور لوگ (اس کپڑے کو دیکھ کر) اس کے گرد جمع ہوتے جا رہے تھے۔ زمانۂ قدیم میں لوگوں کو پکارنے کا یہی ذریعہ تھا۔ اسی طریق سے انہیں دعوت دی جاتی تھی۔ اسے عربی زبان میں تثویب کہتے ہیں (ثوب کے معنی کپڑا) چنانچہ مؤذن کے الفاظ (اَلصَّلٰوةُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ وغیرہ) تثویب کہلاتے ہیں۔ لہٰذا ثیاب کے معنی ہیں دعوت اور طَهِّرْ کے معنی ہیں دور رکھنا۔ بنا بریں۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ

کے معنی یہ ہوئے کہ اپنی دعوت (تحریک) کو ہر قسم کے مذموم عناصر Undesirable Elements سے دور (پاک) رکھ۔ اس تحریک میں صرف وہ لوگ شامل ہو سکیں گے جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی رکھتے ہوں۔ جس کے دل میں کوئی خباثت آلود مقصد ہوگا، اُسے اس تحریک سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ صاف اور

---

[1] اس کے عام معنی کئے جاتے ہیں۔ اپنے رب کی بڑائی کر۔

[2] ״ ״ ״ ״ اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

شفاف دعوت۔ پاکیزہ اور نکھری ہوئی تحریک۔ کھلے کھلے اور واضح مقاصد اور ان مقاصد کے حصول کے ذرائع نہایت صاف اور سیدھے، نہ مقاصد میں کوئی شر کا پہلو مضمر، اور نہ ہی ان کے حصول کے ذرائع میں کسی قسم کا فریب یا بد دیانتی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحریک میں شامل ہونے والوں کے عزم میں استواری اور کیرکٹر میں پختگی ہونی ضروری ہے جو ذمہ داریوں کے بوجھ سے لڑکھڑا جائے یا جس کے پائے استقلال میں لغزش آجائے، وہ اس تحریک کے شایان شان نہیں ہوگا۔ اس لئے کہدیا گیا کہ

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ[1]

تم نے بعض اونٹوں کو دیکھا ہوگا سلیم! بیٹھتے وقت ان کی پچھلی ٹانگیں کانپتی اور لڑکھڑاتی ہیں۔ یہ کمزوری کی نشانی اور اونٹوں کی خاص بیماری ہوتی ہے اسے رجز کہتے ہیں۔ لہذا اس تحریک میں شریک ہونے والوں میں رجز نہیں ہونا چاہیئے کہ ذمہ داریوں کے بوجھ سے اُن کے پاؤں میں لغزش آجائے۔ اس لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس جماعت کے افراد کی ایسی تعلیم و تربیت کی جائے اور ان کی نشوونما (تزکیہ) کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے اندر خود اعتمادی اور محکم گیری کی قوت پیدا ہو جائے اور سخت سے سخت مقام پر بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے والرجز فاھجر یہ ہے اس تحریک کا تیسرا عمود

اوّل — اقدار کا بدل دینا اور صرف ربوبیت کو کبریائی کا معیار قرار دیدینا وربک فکبر

دوم — اس دعوت کو فساد انگیز اور خباثت آلود محرکات و عناصر سے پاک صاف رکھنا اور

سوم — ان تمام امکانات کو دور کر دینا جن سے افراد کارواں کے پائے استقلال میں لغزش کا اندیشہ ہو۔

اب آگے بڑھیئے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک میں وہ لوگ بھی شامل ہوں گے جو صرف اپنا دل اور جان لیکر

---

[1] اس کے عام معنی کئے جاتے ہیں اور ناپاکی سے دور رہ۔

آئیں گے۔ اس کے سوا ان کے پاس اور کوئی دنیادی متاع نہیں ہوگی۔ اور وہ لوگ بھی جن کے پاس سامانِ زندگی کی فراوانی ہوگی۔ تحریک ربوبیت میں یہ ساز و سامان سب کا مشترکہ ہوگا۔ دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو کچھ دیتا ہے تو یا تو اس سے زیادہ مقدار میں واپس لینے کے خیال سے دیتا ہے اور یا (کم از کم احسان مندی کے طور پر۔ احسان مندی کے معنی یہ ہیں کہ جس پر احسان کیا ہے وہ تمام عمر تمہارا بے دام غلام رہیگا۔ وہ ہر بات تمہاری مرضی کے مطابق کرے گا۔ جوں ہی اس نے کوئی بات تمہاری مرضی اور منشا کے خلاف کی تم نے جھٹ اُسے احسان فراموش اور کمینہ کہہ کر ذلیل کر دیا۔ لیکن تحریک ربوبیت میں ان جذبات و تصورات کی گنجائش نہیں۔ اس کا تمام تر مدار "دینے" میں ہے "لینے" میں نہیں۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے وہ "دیگا" اور اس کے بدلہ میں نہ کسی معاوضہ کی خواہش کرے گا نہ احسان رکھے گا۔ ان میں سے ہر ایک کا اصول یہ ہوگا کہ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا۔ (میں اس کے لئے تم سے کسی معاوضے کا خواہشمند نہیں ہوں) اس لئے اس تحریک کا چوتھا اصول یہ ہے کہ

لَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ

اس خیال سے احسان نہ کر کہ اس کے بدلے میں زیادہ ملے گا۔

یعنی یہ سب سعی و کاوش اور داد و دہش اس نظام کے قیام اور استحکام کے لئے ہوگی جو تمام افرادِ معاشرہ کی ربوبیت کا ذمہ دار ہے۔ اس نظام کے ذریعے خود تمہاری ربوبیت بھی ہوتی جائے گی۔ لہذا اس نظام میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ کس نے کتنا دیا اور اس کے معاوضے میں اسے کتنا ملا۔ تم سب کو نظامِ ربوبیت کے قیام کے لئے استقامت پذیر رہنا ہوگا۔

وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن پر اس دعوت کی تعمیر استوار ہوگی۔

⁂

اس کے بعد اس حقیقت کو بھی واشگاف کر دیا گیا کہ یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بچھونا ہے۔ نظام ربوبیت آسانی سے قائم نہیں ہو جائے گا۔ مفاد پرست جماعتیں اس کی مخالفت میں چاروں طرف سے ہجوم کر کے امنڈ آئیں گی۔ اور وہ وقت بھی آ جائے گا جب اس مخالفت کا مقابلہ میدان جنگ میں کرنا ہو گا۔ لیکن مخالفت کے ابتدائی مراحل ہوں یا آخری شکل۔ ہر مرحلہ اور ہر قدم پر اس حقیقت پر یقین محکم رکھو کہ آخر الامر کامیابی تمہاری ہی ہو گی۔ اس لئے کہ جو معاشرہ ذاتی مفاد پرستیوں کے سہارے پر قائم ہو وہ نظام ربوبیت عامہ کے مقابلہ میں کبھی ٹھہر نہیں سکتا۔ اس لئے

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ

جب لڑائی کا بگل بجایا جائے گا۔

تو اس وقت واقعی بڑی مشکلوں کا سامنا ہو گا

فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ

لیکن ان مشکلات سے گھبرانا نہیں۔ تمہارے لئے یہ سب آسان ہو جائیں گی۔ مصیبت ہو گی فریق مقابل کیلئے

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ۔

اب سوال یہ پیدا ہو گا کہ ان ابتدائی مراحل میں، جب ہنوز اپنی جماعت زیر تشکیل و تربیت ہو گی، مخالفین کی دشنام طرازیوں اور شر انگیزیوں کا کیا جواب دیا جائے؟ یہ مرحلہ واقعی بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ مخالف قوتیں اپنی دسیسہ کاریوں کے طرح طرح کے حربے استعمال کرتی ہیں تاکہ وہ قوت جو اس جماعت کی تعلیم و تربیت اور تشکیل و تنظیم میں صرف ہوتی ہے، ان حربوں کی مدافعت میں ضائع ہو جائے۔ شر انگیزی کے یہ تیر میدان جنگ کی تیغ و سنان سے کہیں زیادہ زہر آلود اور زخم آور ہوتے ہیں۔ اگر اس جماعت کے افراد ان شرارتوں کی مدافعت میں الجھ جائیں تو ان کی ساری توانائی اس میں ضائع ہو جاتی ہے اس لئے اس مقام پر بار بار تاکید کی جاتی ہے کہ دیکھنا کہیں ان باتوں میں الجھ کر نہ رہ جانا۔ اس وقت تمہاری کامیابی اسی میں ہے کہ ان سے

دامن بچا کر نہایت خوشگواری سے آگے بڑھ جاؤ۔ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (۱۵/۸۵) دوسری جگہ ہے

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا (۷۳/۱۰)

جو کچھ یہ مخالفین کہتے ہیں اس سے دل برداشتہ مت ہو جاؤ، ہمت سے کام لو اور نہایت خوش اسلوبی سے
کنارہ کشی کرتے ہوئے انہیں چھوڑ کر آگے نکل جاؤ

تم اپنے کام میں لگے رہو۔ ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے پروگرام کی تکمیل میں منہمک رہو اور ان مخالفین کو "میرے حوالے کر دو"؛ میرا قانونِ مکافاتِ عمل ان سے نپٹ لے گا۔ ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۔ یہ مخالفت کرنے والا وہ ہے جسے ہم نے تنہا پیدا کیا تھا[1]۔ نہ اس کے ساتھ مال و دولت تھی۔ نہ سامانِ قوت و حشمت۔ یہ تمام دولت اور قوت جن کی بنا پر یہ اس طرح سرکش و عنید ہو رہا ہے، اس غلط نظام کی پیدا کردہ ہیں جس کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہے۔ اس لئے ہمارا قانون ان ہلاکت سامانیوں کو تباہ و برباد کر دیگا۔

ہم نے اسے فراواں مال دیا۔ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا اور آل اولاد، جن کے زور پر یہ اس قدر بھرا ہوا۔ وَبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۔ فرس شاہد کہتے ہیں ایسے گھوڑے کو جو دوڑنے میں اپنی تمام قوت صرف کر دے اس لئے بنین شہود وہ ابنائے خاندان ہیں جو مخالفت میں اپنی پوری قوت صرف کر دیں۔ ہم نے اس کی زندگی کے راستے ہموار کر دیئے وَمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا اب یہ چاہتا یہ ہے کہ ہم اس کے ساز و سامان میں اور اضافے کرتے جائیں جن سے یہ ہمارے قانون اور ضابطہ کی مخالفت میں اور بھی سرکش ہوتا جائے۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ ۔ كَلَّا ۔ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا اب وہ جماعت وجود پذیر ہو گئی ہے جس کے ہاتھوں ہمارا ضابطۂ قانون ایک نظام کی شکل میں متشکل ہو جائے گا۔ اسی جماعت کے ہاتھوں یہ مفاد پرست گروہ مصیبتوں میں پھنسے گا۔ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا

---

[1] یہاں صیغہ تو واحد کا ہے لیکن مراد اس سے انسانوں کی وہ تمام جماعتیں ہیں جو نظام ربوبیت کے قیام کے راستے میں مزاحم ہوتی ہیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ غار حرا سے اتر کر، ایک رسول کے سامنے کیا پروگرام ہوتا ہے۔ اب تم نے سمجھا کہ سورۂ المدثر کی ان آیات کا مفہوم کیا ہے جن کے متعلق تم کہہ رہے تھے کہ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا۔ تم سمجھتے ہو سلیم! ان ترجموں سے قرآن کس طرح سمجھ میں آسکتا ہے؟

اس جملۂ معترضہ کے بعد آگے بڑھو۔ اتنا کچھ بیان کرنے کے بعد، قرآن نے ایک عالمگیر حقیقت کو دل کش محاکاتی انداز میں پیش کیا ہے۔ قرآن کا یہی اسلوب ہے جس پر (Julian Huxley) ایک جدید الٰہیات کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے۔ میں نے پچھلے سال تمہیں نیویارک ٹائمز بابت ۲۲ ؁۵۲ کا ایک تراشہ بھیجا تھا۔ جس میں ہکسلے نے کہا تھا کہ دنیا کا جدید مذہب وہ ہوگا جو انسانیت کی ارتقاء کو اپنا اصول قرار دے۔ اسی خطبہ میں اس نے کہا تھا کہ اس مذہب کو اس انداز میں پیش کیا جائے

> جو ایک طرف ایسا سادہ اور سلیس ہو کہ عام انسان بھی اس سے نفع اندوز ہو سکیں
>
> اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُر معانی کہ ایک بلند ترین مفکر بھی اس سے
>
> مطمئن ہو جائے۔

قرآن پر غور کرو۔ اس میں یہی اسلوب بیان نظر آئے گا، اب اس محاکاتی انداز کو دیکھو جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

قرآن، رسول سے کہتا ہے کہ تمہارا کام یہ ہے کہ ربوبیت عامہ اور انفرادی مفاد پرستیوں کے دونوں نظام اور ان کی خوبیاں اور خرابیاں لوگوں کے سامنے واضح طور پر بیان کر دو۔ اس کے بعد اُن سے کہو کہ وہ خود غور کریں اور سوچیں کہ کونسا راستہ ہمیں کس منزل کی طرف لیجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو گروہ اپنے ذاتی مفاد سے الگ ہٹ کر خالص انسانیت کے نقطۂ نگاہ سے دیکھے گا، اسے نظام ربوبیت میں جنت کا عکس نظر آئے گا۔ اس کے برعکس، جو گروہ مفاد پرستی کی نگاہوں سے دیکھے گا، اسے اس نظام میں اپنا سب کچھ لٹتا دکھائی دیگا۔ اب دیکھو سلیم! قرآن اس حقیقت کو کس طرح بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ یوں سمجھو کہ مفاد پرست گروہ کا

نمایندہ آیا۔

إِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ

اس نے سوچا دونوں راستوں پر غور کیا، اپنے ذاتی نفع اور نقصان کا انفرادی نقطۂ نگاہ سے موازنہ کیا۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ۔ یہ غارت ہو، اس نے کس قسم کا اندازہ لگایا؟ یہ کس قدر غلط نتیجہ پر پہنچا۔ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ۔ توبہ۔ توبہ ایسا غلط اندازہ جس سے تباہیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہو۔ بہرحال اس نے سوچا۔ اندازہ لگایا۔ ایک نتیجے پر پہنچا ثُمَّ نَظَرَ پھر آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھا ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ سینے کی داخلی کشمکش کے آثار، حجر کے نقشوں کی طرح اس کی پیشانی پر نمودار ہو گئے۔ اس نے تیوری چڑھائی، مُنہ بسورا، اور نفرت و حقارت اور غرور و تکبر کے کف بردہاں جذبات سے لبریز پیٹھ موڑ کر چل دیا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ وہ اس طرح واپس جا رہا ہے اور اس کے دماغ میں بار بار وہ الفاظ گونج رہے ہیں جو اس سے ابھی ابھی کہے گئے تھے کہ "یاد رکھو! اگر تم نے اس نظام کو قائم نہ کیا جو نوعِ انسانی کے مفادِ کُلی کا ذمّہ دار ہے تو تمہاری دولت اور حشمت سب برباد ہو جائے گی۔ اس تنذیر (warning) کو یوں ہی مذاق سمجھ کر نہ ٹال دو۔ یہ آسمانی فیصلے ہیں۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ اس میں ذرا ردّ و بدل نہیں ہو گا۔ جو کچھ کہا جا رہا ہے اسی طرح ہو کر رہے گا۔" یہ الفاظ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

وہ غصّے کے جوش میں پاگل ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور جھنجلا کر بولا کہ سب غلط ہے، پُرانے زمانے کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ سب کچھ اپنے جی سے بنایا جاتا ہے اور ہمیں یہ کہہ کر دھمکایا جاتا ہے کہ "یہ خدا کے فیصلے ہیں، یہ وحی کی آواز ہے"۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ کہاں کی وحی اور کہاں کا خدا! یہ سب کھیل اس شخص کا اپنا بنایا ہوا ہے۔ (فَقَالَ إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ)

مفاد پرست گروہ کا نمائندہ یوں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا اور اس کے پیچھے خدا کے قانونِ مکافات نے پکار کر کہا کہ تم عنقریب دیکھو گے کہ تمہاری دولت و حشمت کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ سب کچھ جُھلس کر رہ جائے گا۔ نہیں! پگھل کر بہہ جائے گا۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔ یوں جھلس جائے گا کہ پہچان تک نہیں ہو سکے گی کہ یہاں

کیا تھا۔

سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ۔ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ۔ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ۔ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۷۴/۲۶-۲۹)

اس تباہی و بربادی کے بعد، دنیا تحقیقاتی کمیشن بٹھائے گی کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس ہلاکت کے اسباب و علل کیا تھے؟ یہ انقلاب کس طرح رونما ہو گیا۔ یہ اتنی بڑی قوتوں کے مالک اس طرح بے نام و نشان کیسے ہو گئے۔

يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (۷۴/۴۰-۴۲)

مجرمین سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں اس تباہی اور بربادی کی طرف کونسی چیز کھینچ لائی

میں محسوس کر رہا ہوں سلیم! کہ تم کس قدر بیتاب ہو یہ سننے کے لئے کہ ان مجرمین کی طرف سے اس سوال کا کیا جواب ملتا ہے؟ بات ہے بھی ایسی جس کے لئے ہر قلب حساس کو اس طرح بیتاب ہونا چاہیئے! اتنا بڑا عظیم الشان انقلاب کس طرح واقع ہو گیا؟ اتنی بڑی قوتوں کے ملک۔ ایسی وسیع و عریض سلطنتوں کے حاکم۔ ایسی لاتعداد دولت کے خزانوں کے قارون۔ انہیں کیا ہوا کہ انقلاب کی ایک گردش میں یوں نسیاً منسیا ہو گئے کانھم لم یکن شیئاً من کورا گویا یہ کبھی کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہ تھے! سنو سلیم! کہ ان مجرمین کی طرف سے کیا جواب ملا؟ جواب یہ ملا کہ

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (۷۴/۴۳)

کہا کہ ہم ان کے ساتھ شامل نہ ہوئے جنہوں نے نظامِ صلوٰۃ کو قائم کیا تھا۔

نظامِ صلوٰۃ کیا ہے؟ اس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ لیکن قرآن نے اس تمام تفصیل کو سمٹا کر ایک فقرہ میں رکھ دیا ہے۔ یعنی

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (۷۴/۴۴)

ہم مساکین کے رزق کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔

یہ تھا وہ جرم جس کی پاداش میں ایسا انقلاب عظیم آگیا۔ ہم مساکین کے رزق کا انتظام نہیں کیا کرتے تھے۔ ہم باتیں بہت بنایا کرتے تھے۔ بڑی بڑی اسکیمیں۔ بڑی خوش آئند تدبیریں۔ بڑے بڑے جاذب نگاہ منصوبے (Plans)

وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ (۴۵/۷۴)

بڑی بڑی مدلل بحثیں۔ بڑے بڑے بلند آہنگ ریزولیشنز۔ بڑی بڑی شگفتہ تقریریں۔ ہم یہ سب کچھ کیا کرتے تھے لیکن عملاً

وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ (۴۶/۷۴)

عملاً یہ حالت تھی کہ ہم اسے باور ہی نہیں کیا کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ اس غلط معاشرے کا انجام جس میں مسکین کی روٹی کا انتظام نہیں ہوتا، ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں اس پر بالکل ایمان نہیں تھا تا آنکہ یہ حقیقت ٹھوس شکل میں ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی

حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ (۴۷/۷۴)

اس انقلاب کے بعد یہ خود تو ایک طرف، ان کے حمایتیوں کی کوئی حمایت بھی ان کے کام نہ آسکی

فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (۴۸/۷۴)

کچھ سمجھے سلیم! قرآن کی ان آیات کا مطلب کیا ہے؛ تم سمجھے ہو یا نہ۔ آؤ تمہیں یہ بتاؤں کہ جو لوگ اپنی عقل و فکر سے کام لیتے ہیں وہ قرآن کی ان آیات کو کس حسن و خوبی سے سمجھتے ہیں۔ امریکہ کا ایک نامور جرنلسٹ ہے (Jack Belden) اس نے انقلاب چین کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے (China Shakes The World دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے اس کتاب کی تعریف کی ہے۔ مجھے اس وقت نہ تو چین کے انقلاب کے متعلق کچھ کہنا ہے اور نہ ہی اس کتاب کی بابت مجھے یہ تمہیدی تعارف ایک اور مقصد کے لئے کرنا پڑا ہے۔ اس نے اس کتاب کے "پیش لفظ" میں لکھا ہے کہ دنیا حیران ہے کہ یہ انقلاب واقع کس طرح ہو گیا۔ چانگ کائی شیک جیسا خاقانِ چین، اپنے بےحد و دفر ہوش جیوش و عساکر، اور وسعت نا آشنا ساز و براق کے

باوجود، کیوں اس طرح شکست کھا گیا۔ خود امریکہ جس نے چانگ کائی شیک کو اس قدر مدد دی تھی، حیران ہے کہ دنیا میں اُن کی سیاست کی بساط اُلٹ کیسے گئی۔ اس کے بعد جیک بیلڈن لکھتا ہے کہ یہ لوگ تحقیقاتی کمیشن تو بٹھاتے ہیں لیکن

> نہ تو امریکہ کی حکومت، امریکہ کا پریس۔ نہ ہی امریکہ کے عوام اور نہ ہی ان کے نمائندے جو مشرق اقصےٰ کے کونسل خانوں میں بیٹھے ہیں۔ نہ ہی کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی دفاتر۔ اصل حقیقت تک پہنچ سکے ہیں۔ وہ اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لیجا ہی نہیں سکے کہ وہ اہل چین کے کرب آگیں پُر از جذبات قلوب کی گہرائیوں تک پہنچ سکتی۔

اس کے بعد سلیم! وہ حقیقت بیان کی ہے جس کے لئے مجھے یہ ساری تمہید اٹھانی پڑی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

> ان تمام لوگوں کو (جو اس انقلاب کی علت معلوم کرنا چاہتے ہیں)، محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلا دینی چاہیئے جو وہ مکّہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ
>
> كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۸۹/۱۷)
>
> نہیں! اس کی وجہ یہ ہے کہ، تم یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کو اس کی ترغیب نہیں دیتے تھے کہ مسکین کی روٹی کا انتظام کیا جائے۔

کچھ سُن رہے ہو سلیم! یا کھو گئے ہو اپنے تصوّرات کی دنیا میں؟ دیکھا تم نے کہ امریکہ کا یہ "ملحد" کس انداز سے قرآن سمجھا ہے؟ غور کیا تم نے کہ اس کی نگاہ کہاں پہنچی ہے؟ کتنی دفعہ خود تم نے ان آیات کو پڑھا اور کتنی مرتبہ "درسِ قرآن" میں انہیں قرآءت کے پورے آداب اور تجوید و ترتیل کے قواعد و ضوابط کے مطابق پڑھتے ہوئے سنا۔ کیا آج تک کسی درس میں تم نے سنا اور کسی تفسیر میں تم نے پڑھا کہ حضور رسالت مآبؐ مکہ کے تاجروں سے کیا فرمایا کرتے تھے؟ اس حقیقت تک پہنچا تو یہ غیر مسلم مصنف پہنچا! یہی وجہ تھی جو میں نے تمہیں اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ میرا اندازہ ہے کہ قرآن کو اگر سمجھیں گے تو مغرب کے مفکرین سمجھیں گے۔ ہمارے ہاں قرآن صرف ایک ایک حرف پر دس دس

نیکیاں حاصل کرنے اور ختمِ قرآن کا ثواب مُردوں کو پہنچانے ہی کے کام آسکے گا۔ یا اس کام

کہ از یٰسین او آساں بمیری

وہ ہمیں ہیں جن کے متعلق قرآن (سورۂ مدثر کی مندرجہ صدر آیات کے بعد) کہتا ہے کہ

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ (۷۴/۴۹)

انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ان حقائق سے اعراض برتتے ہیں؟

اعراض بھی ایسا كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ (۷۴/۵۱) گویا یہ بدکے ہوئے گدھے ہیں جو شیر کی آواز سُن کر بدحواس بھاگ اُٹھتے ہیں۔ اس طرح ہراساں اور پریشاں، لرزاں و ترساں، گویا قرآن انہیں کھا جائیگا۔ مسلمانوں کے سامنے اسرائیلیوں کے قصّے اور کہانیاں پڑھیے۔ خوش ہو ہو کر سنیں گے۔ عجم کی وضع کردہ روایات دہرائیے، جھوم جھوم کر آپ سے ہم آہنگ ہوں گے۔ انہیں پیروں کی کرامات سنائیے، ان پر سر دھنیں گے لیکن جوں ہی ان کے سامنے قرآن پیش کیجیے اس طرح بدحواس ہو کر بھاگیں گے كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ یہ سب اس لئے کہ یہ لوگ انفرادی مفاد پرستی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (۷۴/۵۲)

ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا کاروباری پروگرام الگ الگ ہو۔

یہ لوگ مستقبل کے مفادِ کلی کی بجائے، انفرادی مفادِ عاجلہ کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ كَلَّا بَل لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ... اور وہ تمام قصّے کہانیاں (جسے مذہب کے مقدس لٹریچر کے نام سے پیش کیا جاتا ہے)، ان کے اس پروگرام کی تائید کرتا ہے۔ برعکس اس کے قرآن انفرادی مفادِ عاجلہ کی بجائے، انسانیت کے مفادِ کُلّی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ قرآن سے کیوں نہ بدکیں؟ لیکن اگر یہ (مسلمان نام رکھلانے والی قومیں) قرآن سے سبق حاصل نہیں کرتیں تو اس سے قرآن کا کیا بگڑتا ہے؟ قرآن کسی خاص قوم کے ساتھ وابستہ نہیں۔ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ (۷۴/۵۴) یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ (۷۴/۵۵) دنیا کی

جو قوم بھی چاہے اس سے راہ نمائی حاصل کر سکتی ہے اس کے لئے بس ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنی فکر کو قانون خداوندی سے ہم آہنگ کرلے۔ وَمَا یَذْکُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ جو اس طرح قرآن سے راہ نمائی حاصل کرلے گا، اسی کی زندگی ضابطۂ خداوندی کے مطابق ہوگی۔ اور اسی کے حصے میں اس کے قانون کی **حفاظت** آئے گی ھُوَ اَھْلُ التَّقْوٰی وَ اَھْلُ الْمَغْفِرَۃِ (۷۴/۵۶) باقی سب غیر محفوظ رہ جائیں گے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جو اس طرح غیر محفوظ رہ جائے اس کی حفاظت کون کر سکتا ہے۔ ومالہٗ من نصیر
رسول اسی نظام ربوبیت کی تشکیل کے لئے آتا ہے اور معاشرہ میں ایسا انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔

⁂

یہ ہے سلیم! منصب رسالت۔ یعنی نبی، حقیقت کلی کا یقینی علم لے کر اپنی تجردگاہ سے، انسانی معاشرہ کی طرف آتا ہے، اور

زندگی را می کند تفسیرِ نو   می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو
بندہا از پا کشاید بندہ را   از خداوندی رہاید بندہ را
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را   از حرم بیروں کند اصنام را

اور اس طرح دنیائے انسانیت میں وہ صالح انقلاب پیدا کر دیتا ہے جس میں رزق کے چشمے انسانوں کے انفرادی ہاتھ سے نکل کر، قرآنی نظام کی تحویل میں آجاتے ہیں اور اس طرح تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت کا سامان ہو جاتا ہے اور "زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھتی ہے"۔ جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں نبوت کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ حقیقت کا جس قدر علم انسانوں کو دیا جانا مقصود تھا وہ قرآن کے اندر آگیا اور قرآن قیامت تک کے لئے محفوظ ہو گیا۔ لیکن فریضۂ رسالت (یعنی قرآن کا پیغام اوروں تک پہنچانا اور اس کے مطابق انسانی معاشرہ کو متشکل کرنا)، اُمّتِ مسلمہ کے سپرد کر دیا گیا تاکہ یہ اسے آگے چلاتی رہے۔ اس کا ذریعہ تھا وہ نظام جسے قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ یہ سلسلہ تھوڑے دنوں تک جاری

رہا اور اس کے بعد، ہماری شومی قسمت سے، گاڑی کا کانٹا بدل گیا اور وہ کسی اور ہی سمت کو چل نکلی، یہ گاڑی آجتک اسی غلط سمت کو جا رہی ہے۔ اسے صحیح پٹڑی پر لانے کے لئے۔ فریضہ رسالت کے احیاء کی ضرورت ہے، یعنی اسی نظام کی از سرِ نو تشکیل کی ضرورت جس کا مرکز قرآن اور جس کا محیط پوری کی پوری اُمّت ہو۔ یہ وہ نظام ہے جو ایک طرف (Jack Belden) کی مثال ہیں چین اور امریکہ کے مفاد پرستوں سے کہہ سکتا ہے کہ تمہاری ہلاکت اور بربادی کی وجہ یہ تھی کہ

> تم یتیم کی تکریم نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کو مسکین کی روٹی کا انتظام کرنے کی ترغیب نہیں دیتے تھے۔

اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف، چین اور روس کے انقلابیوں سے بھی کہہ سکتا ہے کہ یاد رکھو۔ زندگی صرف اس دنیا کی......... زندگی نہیں، اس کا سلسلہ غیر متناہی ہے اس لئے مقصدِ حیات صرف روٹی کا بیا ہو جانا نہیں۔ مقصد انسان کی جملہ صلاحیتوں کی نشو و نما ہے تاکہ انسان کی یہ زندگی بھی خوشگواریوں کی زندگی ہو اور اس کے بعد کی زندگی بھی فردوس بداماں رہے۔ انما الحیوۃ الدنیا الا لعب و لهو لہذا ساری جد و جہد معاشرہ کے موجودہ تصورات کو مٹانے تک محدود نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد معاشرہ کو جدید خطوط پر متشکل کرنا بھی ضروری ہے اور وہ خطوط صرف وحی سے مل سکتے ہیں۔

در مقام لا نیاساید حیات سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا سازو برگ امتاں نفی بے اثبات مرگ امتاں

اور اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے معاشی نظام کو، قرآنی ضوابط کے تابع رکھا جائے، اس کی شادابی اور پائندگی کی یہی صورت ہے

گر جہاں داند حرامش را حرام
تا قیامت پختہ ماند ایں نظام

لیکن سلیم! یہ کام ہمارے "جبّوں اور عماموں" کے بس کا نہیں۔

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

یہ کچھ ان لوگوں کے ہاتھوں ہوگا جو قرآن کی روشنی میں عقلِ خداداد سے کام لیں گے۔ تم سلیم! مفکرینِ مغرب کے جدید افکار کا مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ وہ قرآن کے قریب آنے کیلئے کس طرح ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ علّامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:۔

> اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لئے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت، زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کیلئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ (پیامِ مشرق)

اس "نئے آدم" کی تخلیق کا امکان مسلمانوں کے ہاں تو نظر نہیں آتا۔ ان کے رگ و پے پر وہ عجمیت، شدت سے مسلط ہے جس کا اندیشہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا:۔

> اندیشہ ہے کہ اقوام کی طبائع پر وہ فرسودہ سست رگ اور دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت غالب نہ آجائے جو جذباتِ قلب کو افکارِ دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی۔

دیکھنا یہ ہے کہ اس "نئے آدم" کے ظہور کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصہ میں آتی ہے ؎

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں و لکم ماندہ دریں کشمکش اندر

لیکن دیکھنا! "نئے آدم" کے الفاظ سے کہیں تم بھی کسی "مسیح موعود" اور "مہدی" اور "مجدد" کا تصوّر لے کر نہ بیٹھ جانا۔ "نئے آدم" سے مُراد ہے وہ انسان جو خدا کے قانون کے علاوہ کسی اور قانون کی اطاعت گوارا

نہ کرے اور اس طرح اس دنیا کو ایک نئی دنیا میں تبدیل کر دے۔ اسی قسم کے انسانوں کی تشکیل، فریضۂ رسالت ہوتا ہے۔

اچھا۔ خدا حافظ۔

فروری۔ ۱۹۵۳ء

سلیم کے نام سترہواں خط

(۱) انسانی فطرت کیا ہے

(۲) اتفاقات کسے کہتے ہیں۔

سلیم! تم جس انداز سے اعتراضات کو استفسارات کے رنگ میں پیش کرتے ہو، یہ تمہاری سلامتی قلب کی دلیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ "قلب سلیم" بڑی گراں بہا متاع ہے۔ تم اس پر جس قدر بھی ناز کرو کم ہے۔ اس انقلاب عظیم کے دور میں کہ جسے قرآن نے "قیامت" سے تعبیر کیا ہے اور جو انسانیت کے قیام کا دور ہے، کوئی اور متاع اس قدر گراں بہا نہیں ہو گی۔ الا من اتی اللہ بقلب سلیم یہی وہ قلب (ذہنیت و نفسیاتی کیفیت) ہے جس کی طرف جنت کی آسودگیاں خود بخود کھنچی چلی آتی ہیں۔ و اُزلفۃ الجنۃ للمتقین (۲۶/۹۰) تمہاری یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے میں ہزار کام چھوڑ کر بھی تمہارے استفسارات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس سے خوشی ہوتی ہے کہ تم اب رفتہ رفتہ نظام ربوبیت کے اصول و مبانی کو سمجھتے جارہے ہو۔ اسی سے پورے کا پورا اسلامی نظام سمجھ میں آجائے گا۔

تمہارے پہلے اعتراض (یا استفسار) کا صغریٰ کبریٰ قائم کیا جائے تو مسئلہ کی نوعیت یوں بنتی ہے کہ

(i) خود غرضی انسانی فطرت میں ہے۔

(ii) جو کچھ انسانی فطرت کے مطابق ہے وہ عین اسلام ہے۔

(iii) جو کچھ عین اسلام ہے اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔

(iv) لہذا کوئی ایسا نظام جس میں خود غرضی کی جگہ کلی بہبود کو مقدم رکھا جائے، اسلامی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے

نتیجہ مستخرجہ یہ ہوا کہ نظامِ ربوبیت، تقاضائے اسلام نہیں ہو سکتا۔

اس استفسار میں تم نے ایک بہت بڑی بات چھیڑ دی ہے جس کا خط و کتابت کے ذریعے سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے۔ ایک طرف تو اس لئے کہ یہ مسئلہ بنیادی اور اساسی ہے اور دوسری طرف اس لئے کہ ہمارے ہر اہم مسئلہ کی طرح یہ بھی تہ در تہ غلط فہمیوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کا صحیح مقام معارف القرآن کی پانچویں جلد ہے جو اس وقت زیر تسوید ہے۔ لیکن چونکہ تمہاری بیتابی تمنا حریفِ انتظار و تربص نہیں ہوا کرتی، اس لئے مجبوراً اسے اسی مقام پر مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اسے ذرا توجہ سے سمجھنا۔ بات مشکل ہے اور گنجائش بہت کم۔

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اعتراض کا محرکہ جذبہ (غیر شعوری طور پر) یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ امور بطور مسلمات مانے جاتے ہیں کہ

(ا) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے

(ب) لہذا انسان کی فطرت عین خدا کی فطرت ہے۔

(ج) اسلام دینِ فطرت ہے۔ یعنی عین انسانی فطرت کے مطابق۔

(د) لہذا کوئی کام جو انسانی فطرت کے خلاف ہو وہ اسلام کے خلاف ہے۔

اسی بنا پر ہمارے ہاں سب سے بڑا زور اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کیا جاتا ہے کہ "اسلام دین فطرت" ہے یہ الفاظ بڑے خوش آیند ہیں اور چونکہ انہیں بطور مسلمات تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے ان پر کسی غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن سلیم! تم میرے مسلک کو جانتے ہو۔ میں ہمیشہ یہ تاکید کیا کرتا ہوں کہ جو الفاظ استعمال کرو، سب سے پہلے ان کا مفہوم متعین کر لو۔ یوں ہی اندھی تقلید میں الفاظ استعمال نہ کرتے جاؤ۔ "انسانی فطرت"۔ "انسانی فطرت" کے الفاظ صبح سے شام تک سینکڑوں مرتبہ دہرائے جاتے ہیں۔ لیکن تم نے کبھی سلیم! یہ بھی سوچا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ "انسانی فطرت" سے کہتے کسے ہیں؟ ذرا سوچ کر بتاؤ تو سہی کہ انسانی فطرت سے مفہوم کیا ہے؟ تم جس قدر سوچتے جاؤ گے، خود بخود محسوس کرتے جاؤ گے کہ ان الفاظ کا کوئی واضح مفہوم تمہارے ذہن میں نہیں ہے۔ اور ایک تم ہی پر کیا موقوف ہے۔ دوسرے لوگ بھی جو ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، ذرا ان سے پوچھ کر دیکھو کہ "انسانی فطرت" کیا ہوتی ہے۔ تم خود دیکھ لو گے کہ وہ بھی تمہاری طرح کورے ہوں گے۔ سلیم! ہمیں اسی چیز نے تباہ کر رکھا ہے۔ جب زندگی کے تصورات عمل سے بیگانہ ہو جائیں۔ جب الفاظ محض اصطلاحات اور اعمال محض رسوم بن کر رہ جائیں، جب کلمہ (نظریۂ حیات) کو استنتاجی میزان (Pragmatic Test) میں نہ تولا جائے، تو الفاظ کا استعمال روزمرہ کی عادت بن جاتا ہے۔ ان کا کوئی متعین مفہوم ذہن میں نہیں ہوتا۔ اسی کیفیت کو قرآن اسماء سمیتموھا انتم و اباؤکم سے تعبیر کرتا ہے (یعنی محض الفاظ جو قوم میں متوارث چلے آتے ہیں) اور اسی کو میں "شاعری" کہا کرتا ہوں۔

"انسانی فطرت" کیا ہے؟ یہ سوال ایسا اہم اور مشکل ہے کہ انسانی فکر ابھی تک اس کا جواب متعین نہیں کر پایا۔ مشرق میں تو خیر، ان امور کے متعلق غور و خوض اور تحقیق و تدقیق سے کام ہی نہیں لیا جاتا (مشرق نے صدیوں سے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تقلید اور بے عملی کی افیون کا یہی خاصہ ہوا کرتا ہے) مغرب میں جہاں ائمۂ فکر و خبر نے انسانی نفسیات (Human Psychology) کے متعلق اس قدر تحقیق و کاوش سے کام لیا ہے اور نفسِ انسانی کے امیال و عواطف اور مدرکات و احساسات کی بابت اس قدر ریسرچ کی ہے، وہ بھی اس

باب میں کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے کہ اُنسان کی فطرت، کیا ہے؟ اُن کے ہاں ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ اگر انسان کو خارجی اثرات سے متاثر نہ ہونے دیا جائے تو اس کے بعد وہ جن خصوصیات کا حامل ہو گا انہیں غیر ملوث انسانی فطرت (Un-adulteretzd human nature) کہا جائیگا۔ لیکن یہ نظریہ محض تصور ہی تصور میں پرورش پا سکتا ہے۔ عملی دنیا میں اس کا وجود نہیں مل سکتا۔

"خارجی اثرات، جو انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(۱) وہ اثرات جو انسانی بچہ وراثتاً اپنے ساتھ لاتا ہے اور

(۲) وہ اثرات جو اس پر تعلیم و تربیت (ماحول) سے مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی بچے کو کسی ایسے صحرا یا جنگل میں تنہا چھوڑ دیں جہاں کسی دوسرے انسان کے خیالات اس پر اثر انداز نہ ہوں اور اس کے بعد دیکھیں کہ وہ کن خصوصیات کا حامل بنتا ہے تاکہ ان خصوصیات کو "انسانی فطرت" کے اجزا کہا جا سکے۔ اول تو یہ بھی ناممکن ہے۔ لیکن بفرض محال اسے ممکن بھی تصور کر لیا جائے تو ہم ان اثرات کو کہاں لے جائیں گے جنہیں وہ بچہ وراثتاً اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس کی "فطرت" کو ان اثرات سے منزہ و معریٰ کر دینا محال ہے۔ یہ اثرات تو اس کے خون کے ذرات اور قلب و دماغ کے ریشہ ریشہ میں حلول کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ اگر اس کے ساتھ ائمہ علم الابدان کے اس نظریہ کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ انسان کے عادات و اطوار، اس کے غدود اور ان غدودوں سے رسنے والی رطوبات سے متشکل ہوتے ہیں، اور یہ غدود اس کی جسمانی ساخت کا لاینفک حصہ ہوتے ہیں جو اسے وراثت میں ملتی ہے، تو انسانی بچہ کو ان عوامل کے اثرات سے غیر متاثر رکھنا یکسر ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہذا کسی ایسے بچہ کا (عملاً) تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جسے ان عوامل سے الگ تھلگ رکھا جا سکے جن سے اس کی عادات و خصائل اور امیال و عواطف ترتیب پاتے ہیں۔

اور جب یہی ناممکنات سے ہے تو پھر "غیر ملوث انسانی فطرت" کا تعین بھی ناممکن ہے

دوسرے مکتب تحقیق کا خیال ہے کہ "انسانی فطرت" کو متعین کرنے کا طریق یہ ہے کہ شروع سے آج تک مختلف ادوار و امصار کے تمام انسانوں کی تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے اور اس طرح جو انسانی خصوصیات

ہر زمانہ اور ہر مقام پر نوعِ انسانی میں مشترک پائی جائیں، انہیں الگ کر لیا جائے۔ ان کے مجموعے کا نام "فطرت انسانی" ہوگا۔ لیکن غور کیجئے کہ یہ طریق کار جہاں اس قدر ناممکن العمل ہے وہاں کس قدر ناقص بھی ہے۔ تاریخ کیا ہے؟ انسانی دل و دماغ کے معمولات (Activities) کا ریکارڈ! یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ انسانی میلانات و رجحانات کن کن عوامل سے ترتیب پاتے ہیں اور کن کن عناصر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا کہ مختلف ادوار کے انسانوں کے معمولات کے اقدارِ مشترک (Common Factors) کا مجموعہ "انسان کی فطرتِ اصلیہ" کہلائے گا، خود فریبی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس طریق عمل سے آج تک کوئی حتمی نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو سکا۔

ایک تیسرا مکتبِ فکر، علمائے علم الانسان (Anthropology) پر مشتمل ہے جن کا خیال ہے کہ جب انسان اپنے ابتدائی زمانہ میں سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور تہذیب و تمدن کی حضریاتی زندگی سے ہنوز ناآشنا تھا۔ اس وقت وہ اپنی اصلی فطرت پر تھا۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ افریقہ کے حبشیوں، امریکہ کے احمر ہندیوں یا آسٹریلیا کے جنگلی باشندوں کی زندگی "فطرتِ انسانی" کی مظہر ہے۔ لیکن اول تو خود ان ائمہ تحقیق کے اکتشافات کے مطابق مختلف ممالک کے قدیم رجنگلی، انسانوں کے عادات و خصائل مختلف ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں جو شے قدرِ مشترک رہ جاتی ہے وہ ان کی جہالت اور توہم پرستی ہے۔ لہذا اس نظریہ کی رو سے "جہالت اور توہم پرستی" کے مجموعے کا نام "انسانی فطرت" قرار پا سکے گا۔

بعض علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ انسانی بچہ اپنے ایامِ طفولیت میں "فطرتِ انسانی" سے بہت قریب ہوتا ہے۔ لیکن سلیم! ذرا کسی بچے کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ اس میں کون کون سی خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ یہی ناکہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ آتا ہے اسے توڑ ڈالتا ہے۔ دوسرے کی چیز کو جھپٹ کر چھین لینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نہیں ملتی تو چیختا چلاتا، ضد کرتا ہے۔ دوسرے بچوں کو پیٹتا ہے۔ اگر کسی دوسرے بچے سے پیار کیا جائے تو اس پر حسد کے مارے جل اٹھتا ہے۔ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے، کبھی منہ میں مرچ

ڈال لیتا ہے۔ ہاتھ سے چاقو چھینو تو چیخنے لگ جاتا ہے۔ لہٰذا اس طریقِ فکر کے مطابق "فطرتِ انسانی" کے لاینفک اجزا یہی کچھ قرار پا سکتے ہیں۔

اب سلیم! ان چیزوں کو لو، جو عام طور پر تمام انسانوں میں بطور قدرِ مشترک پائی جاتی ہیں۔ یعنی تحفظ ذات (Preservation of Self) اور بقائے نسل کا جذبہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان چیزوں کو "انسانی فطرت" قرار دیا جا سکتا ہے؟ انسان کیا ہے؟ حیوان کی ارتقاء یافتہ شکل! جس طرح نباتات کی جڑیں زمین میں اور شاخیں فضا کی پہنائیوں میں ہوتی ہیں، اسی طرح انسان کی طبعی اصل، حیوانی ہے اور "انسانی اصل" اس سطح سے بلند۔ اس کی طبعی زندگی کا انحصار ان ہی عوامل پر ہے جن پر دوسرے حیوانوں کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ سانس لینا، کھانا، پینا، سونا، سردی گرمی کے شدید اثرات سے محفوظ رہنا، اسی طرح تحفظ ذات اور بقائے نسل کا جذبہ بھی حیوانی سطح کی چیز ہے۔ یہ جذبہ ہر حیوان میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جذبہ بھی "انسانی فطرت" نہ ہوا بلکہ "حیوانی فطرت" کا مظہر ٹھہرا۔ جس طرح حیوانات میں یہ چیزیں جبلی طور پر (INSTINCTIVELY) موجود ہوتی ہیں، اسی طرح یہ چیزیں انسان میں بھی موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ چیزیں انسانی فطرت (Human Nature) نہیں، بلکہ حیوانی جبلت (Animal Instinct) قرار پا سکتی ہیں۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ جو بات بظاہر اس قدر آسان دکھائی دیتی تھی، ذرا سے غور و فکر کے بعد وہ کس قدر مشکل نظر آنے لگی۔ یعنی "انسانی فطرت" اول تو متعین ہی نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ متعین ہوتی ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی کیا قرار پاتے ہیں؟ جہالت اور توہم پرستی (قدیم زمانہ کے وحشی انسانوں کے خصائص) یا شکست و ریخت، ضد، حسد، غلبہ و استیلاء، ناعاقبت اندیشی، اپنے نفع و نقصان سے بھی ناآگہی (بچے کی ابتدائی زندگی کی خصوصیات)۔ سلیم! غور کرو کہ اگر یہی "انسانی فطرت" ہے تو کیا یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے باعث عز و شرف قرار دیا جا سکے؟ کیا یہ اس قابل ہے کہ اس کے متعلق کہا جائے کہ

(i) یہ عین خدا کی فطرت (فطرت اللہ) ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور

(ii) اسلام اسی فطرت کے تقاضے پورے کرنے کا دین ہے۔

سوچو سلیم! کہ یہ سوچنے کی بات ہے!! اور اگر یہ انسانی فطرت نہیں تو بتاؤ وہ کونسی فطرت ہے جو خود اللہ کی فطرت ہے اور جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق دین اسلام ہے؟ اور پھر یہ بھی سوچو کہ اس فطرتِ انسانیہ کا پتہ اور نشان کہاں سے لیا جائے اور اسے متعین کس طرح کیا جائے؟

* * *

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم اکتا تو نہیں گئے؟ بات تم نے چھیڑ دی ہے بہت مشکل اور جو نتائج تمہارے سامنے آرہے ہیں، وہ ہیں یکسر غیر مانوس اور غیر متوقع۔ اس لئے اس بحث سے طبیعت کا اکتا جانا مستبعد نہیں۔ لیکن اب، یہ کمبل تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ اسے تو آخر تک سننا اور سن کر سمجھنا ہی ہوگا،

وہ اگلا قدم یہ ہے کہ خود قرآن میں بھی انسان کی بعض خصوصیات کا ذکر آیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان خصوصیات کے مجموعے کو وہ انسانی فطرت" قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہی انسانی فطرت کے اجزا ہیں تو کیا اس قسم کی فطرت کو "فطرت اللہ" کا مظہر اور اسلام کو اس فطرت کا دین سمجھا جا سکتا ہے؟ ان خصوصیات میں سب سے پہلے وہ۔ خصوصیت کبریٰ" ہے جو قصۂ آدم کے ضمن میں مذکور ہے اور جس کی طرف ملائکہ یہ کہہ کر اشارہ کرتے ہیں کہ اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفک الدماء (البقرہ) کیا تو زمین کی جانشینی اس کے سپرد کرے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے اس اعتراض کی تردید نہیں کی بلکہ صرف اتنا کہا کہ انی اعلم ما لا تعلمون۔ "ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے" لہذا انسان کی سب سے پہلی خصوصیت "فساد اور خونریزی" ہے۔ اور اس کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ یہ خصوصیت فی الواقعہ، بلا قید زمان و مکان، عمومی طور پر انسانوں میں قدر مشترک کہلا سکتی ہے۔

پھر قرآن کریم میں انسان کے متعلق ہے کہ یہ بڑا جھگڑالو ہے وکان الانسان اکثر شیٔ جدلا
(۱۸/۵۴)

خصیم مبین ہے (۳۶/۷۷)، "ظلوم جہول" ہے (۳۳/۷۲)، ہلوعًا ہے (یعنی ایسا جس کی نیت ہی نہیں بھرتی (۵۰/۳۰)، ناشکرا ہے (۱۷/۶۷)، خیر کی جگہ شر کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے (۱۷/۱۱)، جلد باز ہے (۱۷/۱۱) وغیرہ

تم نے غور کیا ہے سلیم! کہ یہ کونسی خصوصیات ہیں؟ کیا یہ وہی خصوصیات نہیں جو بچے کی ابتدائی زندگی یا دنیا کی وحشی اقوام میں پائی جاتی ہیں؟ یعنی وہ خصوصیات جن کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان کو "علیٰ حالہٖ" چھوڑ دیا جائے (علیٰ حالہٖ کی تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)۔ اگر یہ خصوصیات "انسان کی فطرتِ اصلیہ" کی مظاہر ہیں تو انہیں "فطرت اللہ" کا مظہر کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ خصوصیات کم از کم اس خدا کی "فطرت" تو کسی طرح بھی قرار نہیں دی جا سکتیں جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے اور نہ ہی اسلام، اس "فطرت" کا دین قرار دیا جا سکتا ہے؟

تم جی میں کہتے تو ہو گے سلیم! کہ میں نے بات کیا پوچھی اور سلسلۂ کلام کس طرف چل نکلا؟ لیکن اس کے بغیر بات سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔ اس تمہید کے بعد سلیم!! اس آیت جلیلہ کو سامنے لاؤ جسے اس مسئلہ کے لئے بطور سند پیش کیا جاتا ہے کہ

(i) انسان کو اللہ نے اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ اس لئے انسانی فطرت، فطرت اللہ کی مظہر ہے۔ اور

(ii) اسلام دین فطرت ہے۔

وہ آیت یہ ہے۔

فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ ذالک الدین القیم
ولکن اکثر الناس لا یعلمون (۳۰/۳۰)

اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ دین قیم (اسلام) ہے۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے"۔ اور اس سے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کی فطرت، فطرت اللہ پر متفرع ہے۔ یعنی جو اللہ کی فطرت ہے، وہی انسان کی فطرت ہے اور

اسلام اس فطرت کے مطابق دین ہے۔

ذرا سوچو سلیم! کہ اگر اس آیت کا یہی مفہوم لیا جائے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی کوششیں فطرتِ انسانیہ کے تعین میں یکسر ناکام ہیں۔ باقی رہا قرآن کریم، سو اس میں انسان کی جن خصوصیات کا عمومی طور پر ذکر ہے وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ انہیں "فطرت اللہ" قرار دیا جائے یا اس "فطرت" پر فخر کیا جا سکے۔ (یہ یاد رکھو کہ ذکر مومنین کی صفات کا نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا ہو رہا ہے) حقیقت یہ ہے کہ لفظ "فطرت" کا یہ مفہوم ہی غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال ہی نہیں کیا جس معنی میں آج مستعمل ہے۔ قرآن اس عربی مبین میں نازل ہوا جو عہد نزولِ قرآن میں عربوں کی زبان تھی۔ اُس زمانہ کے عربوں میں (جو بالعموم بدوی زندگی بسر کرتے تھے) فلسفہ، مابعد الطبیعیات، تصوف، اتھکس کی اصطلاحات رائج ہی نہ تھیں (بدو تو ایک طرف اُس زمانے کے شہری زندگی بسر کرنے والے عرب بھی ان اصطلاحات سے ناآشنا تھے) یہ اصطلاحات بہت بعد کے زمانے کی اختراعات ہیں۔ یا کم از کم عربی زبان میں ان کا عمل دخل بہت بعد میں ہوا ہے۔ یعنی اُس زمانہ میں جب عربوں کی سادہ زندگی کی جگہ عجمی تصوراتِ حیات نے لے لی اور اس طرح ان کی زبان (عربی مبین) کے سیدھے سادے الفاظ، عجمی نظریات کے اصطلاحی مفہوم کے لئے استعمال ہونے لگے۔ یاد رکھو سلیم! جب کوئی قوم سیدھی سادی زندگی بسر کر رہی ہو تو اس کی زبان کے الفاظ ٹھوس اشیا (Concrete things) کا مفہوم ادا کریں گے، مجرد[1] گفتگو (Abstract Talk) کے لئے وہ استعمال نہیں ہوں گے۔ کیونکہ سیدھی سادی

---

[1] خود اسی لفظ مجرد کو لو۔ اس کا مادہ جرد ہے۔ جراد ٹڈی (Locust) کو کہتے ہیں۔ جب مسلمانوں کے معاشرہ میں علمی نظریات دخیل ہوئے تو اس لفظ کے مفہوم میں وسعت آنی شروع ہو گئی۔ ٹڈی دل کا خاصہ ہے کہ وہ درختوں کو ٹنڈ منڈ کر دیتی ہے۔ اس لئے مجرد کے معنی ہو گئے تنہا بلا اہل و عیال۔ تجرید کے معنی ہوئے حشو و زوائد اور مکررات سے پاک کرنا۔ اس کے بعد جب اس معاشرہ میں علم الکلام اور تصوف آیا تو تجرید کے معنی ہو گئے (Abstract) یعنی تمام ٹھوس صفات سے منزہ۔ قرآن کا مفہوم سمجھنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ نزول قرآن کے زمانہ میں قرآن کے الفاظ (عربی مبین) کا کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔ بعد میں وہ الفاظ جن اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے

(باقی صفحہ ۲۹۱ پر)

زندگی بسر کرنیوالی قوم، مجرد گفتگو سے ناآشنا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اس وقت قرآن کا جو مفہوم مروج ہے وہ ان اصطلاحات کی رو سے متعین کیا گیا تھا جب اسلام پر عجمی تصورات چھا گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس مفہوم سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص دور میں قرآن کو اس طرح سے سمجھا گیا تھا۔ لیکن ہم نے اسی مفہوم کو "قرآن" سمجھ لیا اور اس طرح ایک خاص دور کا مفہوم، ازلی ابدی اور غیر متبدل تصور کر لیا گیا۔ جب تک ہم اس بنیادی غلطی سے نہیں نکلتے، قرآن ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہاں کے تمام الجھاؤ اسی غلط فہمی کے پیدا کردہ ہیں۔ اسی سے وہ تمام اختلافات پیدا ہوتے ہیں جو ہمارے لئے اس درجہ پریشانیٔ فکر و نظر کا باعث بن رہے ہیں۔ یعنی ہم نے انسانی تعبیرات کو خدا کا ازلی قرآن سمجھ رکھا ہے اور چونکہ انسانی تعبیرات میں اختلاف ناگزیر ہے اس لئے ہمارے ہاں خود "قرآن" میں اختلاف محسوس ہو رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کے اس اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کر لیں جو خاص خاص ادوار کا پیدا کردہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے وہ معانی متعین کریں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے اور ان معانی کی روشنی میں اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق، قرآن کا مفہوم از سر نو متعین کریں۔ جب تک ہم قرآنی الفاظ کے ماخذ Origin تک نہیں پہنچیں گے اور بعد کے اصطلاحی مفہوم ہی کو ازلی اور ابدی سمجھتے رہیں گے، قرآنی مطالب ہماری نگاہوں سے اوجھل رہیں گے۔

ہمارے ہاں لفظ فطرت کا ترجمہ نیچر (Nature) کیا جاتا ہے۔ لفظ نیچر کا مفہوم بہت وسیع ہے علم طبیعیات (Physics) میں نیچر، عالم آفاق کو کہتے ہیں۔ اور اس سے متعلقہ قوانین کو قوانین فطرت (Laws of Nature) مابعد الطبیعیات (Metaphysics) میں اس سے مراد اُس قوت سے ہوتی ہے جو کائنات کو چلا رہی ہے۔ فلسفہ میں اس کا مفہوم کسی شے کی وہ خصوصیت ہے جس سے

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۰) لگ گئے، ضروری نہیں کہ قرآن کا بھی وہی مفہوم ہو۔ ہمارے ہاں قرآنی الفاظ کا جو مفہوم مروج ہے وہ عام طور پر وہ اصطلاحی مفہوم ہے جو اس وقت متعین ہوا جب اسلام پر عجمی تصورات غالب آگئے تھے۔ لہٰذا آج کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ کے وہ معانی متعین کئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں مروج تھے اور ان معانی کی روشنی میں دورِ حاضرہ کی علمی سطح کے مطابق قرآنی مفہوم کو از سر نو سمجھا جائے۔

وہ شے دیگر اشیاء سے ممیز ہوتی ہے۔ علم النفس کی رو سے نیچر، جبلی استعداد، یا قلبی رجحانات و میلانات کو کہتے ہیں ان کے علاوہ یہ لفظ (نیچر) انگریزی زبان میں متعدد دیگر معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی سے پہلے خود ہمارے ہاں کے متکلمین اور حکماء کے ہاں لفظ فطرت ان ہی اصطلاحی معانی میں استعمال ہوتا تھا۔ لفظِ فطرت کے یہی معانی اس وقت ہمارے ہاں رائج ہیں اور چونکہ یہ معانی ایک عرصہ سے مروّج چلے آرہے ہیں اس لئے یہ ہمارے قلب و دماغ میں اس طرح پیوست ہو چکے ہیں کہ ادھر لفظِ فطرت ہمارے کانوں میں پڑا اور ادھر بلا کد و کاوش، اس کا ایک خاص مفہوم ہمارے سامنے آگیا: "اس شخص کی فطرت ہی ایسی ہے" "وہ فطرۃً اس قسم کا واقع ہوا ہے" "انسانی فطرت کا خاصہ ہے"؛ یہ فقرے ہماری روزمرہ کی زبان میں داخل ہیں اور ان سے لفظِ فطرت کا ایک خاص مفہوم ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ یہی الفاظ بولتے بولتے جب ہمارے سامنے قرآنی آیت میں "فطرت اللہ" کے الفاظ آتے ہیں تو اس سے وہی مفہوم ہمارے سامنے آجاتا ہے جس سے ہمارا ذہن اس درجہ مانوس ہو چکا ہے اور اسی مفہوم کے مطابق ہم قرآنی آیت کا مفہوم متعین کر لیتے ہیں اور پھر "اللہ کی فطرت جس پر انسانی فطرت[1] متفرع ہے" کو بطور ایک حقیقتِ ثابتہ پیش کر دیتے ہیں اور اسلام کو دینِ فطرت قرار دیدیتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس لفظِ فطرت کا وہ مفہوم جو اس وقت ہمارے ذہنوں میں پیوست ہے، کیا قرآن میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، لفظِ فطرت کا موجودہ مفہوم بعد کے زمانے کا ہے، جب یونان کا فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اور لفظ نیچر کا ترجمہ "فطرت" کیا گیا۔ لفظِ فطر کے اصل معنی کسی چیز کو پھاڑنا، شگاف دینا ہیں۔ "فُطر" نباتات کو کہتے ہیں جو زمین پھاڑ کر اُگتی ہے۔ لہٰذا اس سے مراد ہے کسی شے کو پھاڑ کر اس میں سے کسی نئی چیز کو پیدا کرنا۔ تخلیق، ایجاد، ابداع (To create; Originate) قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لئے آیا ہے فاطر السمٰوٰت والارض (پستیوں اور بلندیوں کا پیدا کرنے والا)۔ لہٰذا "فطرت اللہ" کے معنی

---

[1] "خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے"۔ یہ تصور درحقیقت یہود سے مستعار لیا گیا ہے جن کے ہاں (توریت کی رو سے) عقیدہ یہ ہے کہ "خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا"۔

(Nature of God) نہیں بلکہ خدا کا قانون تخلیق ہے۔ اسی قانون تخلیق کے مطابق اس نے عالم آفاق کو پیدا کیا الذی فطر السمٰوٰت والارض اور اسی کے مطابق انسان کو (قل الذی فطرکم اول مرۃ) لہذا فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا کے معنی ہوئے "اللہ کا وہ قانون تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا ہے" وہی قانون تخلیق جس کے مطابق آفاق وجود میں آیا ہے۔ یہ قانون تخلیق (یا نظام فطرت) کیا ہے ظاہر ہے کہ اس قانون کی رو سے کائنات کی ہر شے میں کچھ امکانی وسعتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں جن کی نمود و تکمیل اس شے کی زندگی کی غایت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی کچھ صلاحیتیں مضمر ہیں۔ ان صلاحیتوں کی کامل نشوونما انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ عالم آفاق اور عالم انسان میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی صورت میں نشوونما کا قانون، ان اشیاء پر مسلط کر دیا گیا ہے اور وہ بلا اختیار و ارادہ اس قانون کی پابندی کرتی ہیں۔ انہیں اس امر کا اختیار نہیں کہ چاہیں تو اس قانون کی پابندی کریں اور چاہیں تو اس سے سرکشی اختیار کر لیں ان کے برعکس، انسان کو صاحب اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس پر کوئی قانون مسلط کر کے نہیں رکھ دیا گیا۔ یعنی کوئی قانون ایسا نہیں جو اس کی "فطرت" کے اندر رکھ دیا گیا ہو اور یہ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو (حتیٰ کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جبلی پابندیاں جو اس میں حیوانی زندگی سے منتقل ہو کر آتی ہیں یہ ان کی اتباع پر بھی مجبور نہیں) بکری کا بچہ بھوک سے مر جائے گا۔ لیکن کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی خشکی کی طرف دوڑے گا اور بطخ کا بچہ پانی کی طرف۔ لیکن انسان کے بچے کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی بھی اسی بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح مصری کا ٹکڑا۔ وہ کبھی پانی میں جا گرتا ہے کبھی آگ کے شعلے کو پکڑ لیتا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جو اسے صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور کر دے۔ اس لئے انسان خارجی راہنمائی کا محتاج ہے۔ یہ خارجی راہنمائی وحی کے ذریعہ ملتی ہے فاما یاتینکم منی ھدًی فمن تبلغ ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (۲/۳۸) انسانوں کی طرف من جانب اللہ ہدایت آتی رہے گی۔ جو شخص یا قوم بھی اس راہ نمائی کی اتباع کرے گی اسے نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ اس ہدایت خداوندی

کے مجموعے کا نام ہے قرآن۔

یہیں سے سلیم! ایک اور اہم بات بھی نکلتی ہے۔ (لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم کہیں اس موضوع کی یبوست سے گھبرا نہ جاؤ۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس مرتبہ تم نے بات بڑی مشکل چھیڑ دی ہے۔ لیکن اگر تم نے ذرا ضبط اور صبر سے، ذہن پر زور دے کر بات کو سمجھ لیا تو اس کے بعد، تمہاری راہ کے بہت سے کانٹے صاف ہو جائیں گے!) وہ نئی بات کیا ہے؟ ذرا غور سے سنو۔ تم دیکھ چکے ہو کہ یہ تصور کہ انسان کی فطرت، خدا کی فطرت ہے، قرآنی تصور نہیں ہے، اسی سے ملتا جلتا (بلکہ اسی پر متفرع) یہ تصور بھی ہمارے ہاں عام طور پر مسلمہ مانا جاتا ہے کہ نیکی اور بدی کی تمیز خود فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ یہ تصور بھی بوجوہ غلط ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت اپنی اصلی حالت پر ہو اور وہ خارجی اثرات سے ملوث نہ ہو چکی ہو تو وہ نیکی اور بدی میں از خود تمیز کر لیتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابھی تک یہی متعین نہیں ہو سکا کہ انسانی فطرت ہے کیا؟ پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ایسی "فطرت" کا ملنا ناممکنات سے ہے جو خارجی اثرات (وراثت و ماحول) سے غیر متاثر ہو (میں اس وقت سلیم! حضرات انبیاء کرام کا ذکر نہیں کر رہا، عام انسانوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ نبوت کی حقیقت کا سمجھنا ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے) لہٰذا بات یوں ہوئی کہ

(۱) نیکی اور بدی کا علم غیر ملوث انسانی فطرت کے اندر مضمر ہے۔

(۲) لیکن غیر ملوث انسانی فطرت کہیں نہیں مل سکتی۔

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس "فطرت" کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دینے سے فائدہ کیا ہوا جس "فطرت" کا کہیں وجود ہی نظر نہیں آتا؟ یاد رکھو سلیم! نیکی اور بدی کا علم "فطرتِ انسانی" کے اندر نہیں۔ اس کا علم وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اور وحی قرآن کے اندر ہے۔ اگر نیکی اور بدی کا علم انسان کی فطرت میں ہوتا تو انسان کو اس کی فطرت کے اتباع کا حکم دیا جاتا۔ لیکن حکم وحی کے اتباع کا ہے، انسانی فطرت کے اتباع کا نہیں۔ وحی کے اتباع سے نفسِ انسانی

کی نشو و ارتقاء ہوتی ہے۔ اور، جس طرح مریض کو صحت اور توانائی سے ایک خاص سکون، اطمینان اور مسرت حاصل ہوتی ہے اسی طرح نظامِ وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو ایک خاص آسودگی اور طمانیت کی جنت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ محسوس کرتا ہے کہ ان احکام کی اتباع کوئی بیگار نہیں بلکہ اسی طرح باعث تسکین ہے جس طرح پیاسے کے لئے ٹھنڈا پانی۔ لہذا ان احکام کی اتباع اس کی بالیدگیٔ نفس کا ذریعہ اور مقصودِ حیات ہے۔

انسان کے اندر تعمیر و تخریب دونوں کی صلاحیت موجود ہے۔ (دنیا میں کوئی جانور خودکشی نہیں کرسکتا۔ یہ "شرف" بھی حضرت انسان ہی کو حاصل ہے)۔ اسی تخریب و تعمیر کو قرآن نے "فجور و تقویٰ" (Integration and Disintegration) سے تعبیر کیا ہے "والنفس وما سوٰھا" نفس انسانی اور اسے ہموار رکھنے والی قوتیں اس پر شاہد ہیں "کہ فالھمھا فجورھا وتقوٰھا" اس میں فجور و تقویٰ کے امکانات ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں" "قد افلح من زکّٰھا" جس نے اس کی بالیدگی کا سامان بہم پہنچایا۔ اس کی کھیتی بارآور ہو گئی" "وقد خاب من دسّٰھا" جس نے اس کی بالیدگی کی قوتوں کو دبا دیا، وہ تباہ ہو گیا" لہذا نیکی اور بدی کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر نہیں۔ صرف نیکی اور بدی "(یعنی نفس انسانی کی تکمیل و تخریب) کے امکانات اس کے اندر موجود ہیں۔ ان ممکنات کو صحیح طور پر بروئے کار لانے کا طریق کیا ہے؟ اس کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

بات یہاں تک پہنچ چکی ہے سلیم! کہ

(i) خدا کا تخلیقی قانون (فطرت اللہ) کائنات اور انسان دونوں میں کارفرما ہے۔

(ii) اس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی کسی شے کو اختیار نہیں کہ وہ قانون خداوندی سے انحراف کر سکے (اسے تقدیر کی پابندی کہتے ہیں)

(iii) انسان کے اندر اس کی ذات کی نشوونما اور تکمیل کی صلاحیت بھی رکھ دی گئی ہے۔ اور اسے تباہ و برباد کر دینے کی استعداد بھی۔

(۶) انسان کی نشو و نما اس نظام کے اندر ہوتی ہے جو ہدایت خداوندی کی رو سے متشکل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر نظام اس کی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

(۷) انسان کو اختیار حاصل ہے کہ چاہے بالیدگی اور ارتقاء کی راہ اختیار کر لے اور چاہے بربادی اور تباہی کے عمیق غاروں کی طرف چلا جائے۔

جب انسان، نظامِ خداوندی کے بجائے دوسری راہیں اختیار کر لیتا ہے تو اسے "اتباعِ ہویٰ" کہتے ہیں۔ یعنی "نیچے کی طرف لیجانے والی قوتوں کی اتباع۔ اپنے اپنے جذبات کی اتباع۔ انفرادی مصالح کی اتباع۔ اس روشِ زندگی سے وہ خصوصیات ابھر کر سامنے آجاتی ہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی شکست و ریخت۔ فتنہ و فساد، ناہمواریاں اور نااستواریاں۔ جنگ و جدل۔ ظلم و جہول۔ کفران و "ہلوعت" خود غرضی اور مفاد پرستی وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ "فطرتِ انسانی" کے مظاہر نہیں بلکہ اس روشِ زندگی کے نتائج ہیں جسے انسان وحی کی روشنی کو چھوڑ کر تنہا عقل کی رو سے اختیار کرتا ہے۔ یعنی اگر انسان کو وحی کی روشنی کے بغیر "علیٰ حالہ" چھوڑ دیا جائے تو اس سے اسی قسم کی خصوصیات کا ظہور ہوگا۔

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم! سورۂ روم کی اس آیت کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے جو "فطرت اللہ" "انسانی فطرت" اور "دینِ فطرت" کے تصورات کی بنیاد قرار دی جاتی ہے۔ سلسلۂ کلام یوں ہے

بل اتبع الذین ظلموا اھوائھم بغیر علم۔ فمن یھدی من اضل اللہ۔ وما لھم من نصرین (۳۰/۲۹)

جو لوگ ہر شے کو اس کے اصلی مقام پر نہیں رکھتے ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ علم (وحی) کو چھوڑ کر اپنے جذبات کی اتباع کرتے ہیں اور اس طرح زندگی کی صحیح راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ یوں بھٹکنے والوں کو کون صحیح راہ پر لا سکتا ہے؟ ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہو سکتا۔

ان کے برعکس صحیح راہِ حیات پر چلنے کی آرزو رکھنے والوں سے کہا گیا کہ

فاقم وجھک للدین حنیفا۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ ذالک الدین القیم۔ ولکن اکثر الناس لا یعلمون (۳۰/۳۰)

تم، ہر دوسرے ضابطۂ حیات سے منہ موڑ کر اس ضابطہ (الدین) کو اپنا نصب العین بناؤ جو اللہ کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے۔ وہ قانون جس کی رو سے انسان کی خلقت عمل میں آئی ہے، یہ تخلیقی قانون اپنے نتائج کے اعتبار سے غیر متبدل ہے۔ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو خود بھی محکم ہے اور وجۂ قیام بھی۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔

یہ ضابطہ حیات (الدین) کیا ہے؟

منیبین الیہ۔ واتقوہُ۔ واقیموا الصلوٰۃ۔ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا۔ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۱-۳۲)

سفرِ زندگی میں ہر قدم اس کی طرف اٹھے۔ اس کے قوانین سے کامل ہم آہنگی ہو۔ نظامِ صلوٰۃ سے اپنی وحدت کو قائم رکھا جائے اور دین میں تفرقہ انگیزی پیدا کر کے مشرکانہ مسلک نہ اختیار کر لیا جائے۔ تفرقہ شرک ہے جس میں قانونِ خداوندی کو معیارِ حق و باطل تسلیم کرنے کے بجائے ہر گروہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ برسرِ حق ہے اور یوں اس فریبِ نفس میں مگن رہتا ہے۔

غور کیا تم نے سلیم! صحیح راہ یہ ہے کہ سفرِ زندگی میں انسان کا ہر قدم، ضابطۂ خداوندی کے مطابق اٹھے۔ نہ یہ کہ تنہا عقل (یا جذبات) کی اتباع میں، ناقۂ بے زمام کی طرح، جدھر منہ اٹھا چل دیئے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنے معاشرتی نظام کو ضابطہ خداوندی کی بنیادوں پر متشکل کر لیں۔ یہی بلندیوں کی راہ ہے ولو شئنا لرفعنٰہ بھا (ہمارا قانونِ مشیت یہ ہے کہ قرآن کے مطابق چلنے سے بلندیاں حاصل ہوتی ہیں) ولٰکنہ اخلد الی الارض واتبع ھوٰہ (لیکن اپنے جذبات کی اتباع کرنے والا پستیوں کی طرف جانا چاہتا ہے اس کا کیا علاج؟ (۷/۱۷۶) لیکن یہ بلندیاں، نظامِ ربوبیت کے بغیر ناممکن ہیں۔ دیکھو قرآن کس قدر واضح الفاظ میں

اس حقیقت کی صراحت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

ان سعیکم لشتٰی

انسانی کوششوں کے رُخ مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن دیکھو کونسا رُخ کس منزل کی طرف لے جاتا ہے۔

فاما من اعطٰی واتقٰی

جو دیتا ہے اور قانون ربوبیت سے ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے

وصدق بالحسنٰی

اور اس طرح معاشرہ میں صحیح توازن وتناسب قائم رکھنے کے دعوے کو سچ کر دکھاتا ہے

فسنیسرہٗ للیسرٰی

تو اس کے لئے کشادگی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔

واما من بخل واستغنٰی

لیکن جو مال کو روک رکھتا ہے اور اپنے آپ کو خود مکتفی سمجھ کر اجتماعی نظام سے مستغنی ہو بیٹھتا ہے۔

وکذب بالحسنٰی

اور اس طرح معاشرہ کے توازن کی عملی تکذیب کرتا ہے۔

فسنیسرہٗ للعسرٰی

تو اس کے لئے عسرت کی راہیں کھل جاتی ہیں

ومایغنی عنہ مالہ اذا تردٰی (۹۲/۵-۱۱)

جب معاشرہ کا توازن بگڑنے سے تباہی آتی ہے تو اس کا انفرادی مال و متاع اسے اس تباہی سے بچا نہیں سکتا۔

اس تمہید کے بعد سلیم! اب تم آؤ۔ اپنے اعتراض کی طرف۔ تم کہتے ہو کہ جب خود غرضی "انسانی فطرت" کا تقاضا ہے تو پھر کوئی ایسا اقدام جو اس خود غرضی کی جگہ کلی مفاد کی طرف لے جائے "خلافِ فطرت" ہوگا۔ جہاں تک "فطرت" کا سوال ہے امید ہے کہ گزشتہ تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہو گی۔ اب لو اس تقاضا کو۔ میں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ انسان، حیوان ہی کی ایک ارتقاپذیر شکل ہے۔ اس لئے انسان اور حیوان میں چند اقدار مشترک ہیں۔ اگر ان اقدار مشترکہ کو کم از کم درجے تک لیجائیں تو نظر آئے گا کہ تحفظِ ذات، اور افزائش نسل، دو نمایاں خصوصیات ہیں جو حیوانات اور انسان دونوں میں موجود ہیں۔ جہاں تک تحفظِ ذات کا تعلق ہے میں اپنے پچھلے خط میں بتا چکا ہوں کہ حیوان اپنی وقتی ضروریات کے پورا ہو جانے کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے، لیکن انسان وقتی ضروریات کے بعد بھی بہت کچھ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے۔ اسی طرح افزائش نسل کے جذبہ کو لیجئے۔ حیوانات میں جنسی اختلاط محض افزائش نسل کی خاطر ہوتا ہے اور اس کے لئے خدا کے تخلیقی قانون نے ان پر ایسی پابندی عائد کر رکھی ہے جس سے سرکشی ممکن نہیں۔ حیوانات کے جوڑے ہر وقت ساتھ ساتھ پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن جنسی قوتوں کی موجودگی کے باوصف، انہیں جنسی اختلاط کا خیال ہر وقت دامنگیر نہیں رہتا۔ یہ جذبہ اسی وقت روبہ کار آتا ہے، جب افزائش نسل کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے برعکس انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے جس وقت جی چاہے جنسی اختلاط میں مشغول ہو سکتا ہے۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ تحفظِ ذات اور افزائش نسل کے ان دونوں بنیادی تقاضوں میں حیوان اور انسان میں کس قدر فرق ہے۔ انسان، اس باب میں کسی "اندرونی قاعدے" کی رو سے مجبور نہیں، بلکہ اسے اختیار حاصل ہے کہ ان تقاضوں کو جس طرح جی چاہے پورا کرے۔ لیکن انسان "تمدنی زندگی (Social Life) بسر کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد کا کوئی ایک عمل دوسرے افراد کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس لئے انسانی اختیار و ارادہ کو بلا حدود و قیود نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے اختیار کو صحیح سواحل (Channels) میں مقید رکھنے کے لئے وحی کی رو سے تحدید کی گئی ہے۔ اگر "افزائش نسل" کی قوتوں پر تحدید عائد نہ کی جائے تو انسانی معاشرہ میں جنسی فوضویت (Sexual Anarchy) پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر تحفظِ ذات کے جذبہ کو بے زمام

چھوڑ دیا جائے تو اس سے معاشی فساد (ناہمواریاں) نمودار ہو جاتی ہیں۔ تحفظِ ذات کے جذبہ کو بے لگام چھوڑ دینے کا نام "خود غرضی" ہے۔ ہدایتِ خداوندی کی رو سے عائد کردہ تحدیدات، افزائشِ نسل اور تحفظِ ذات کے تقاضوں کی تسکین کا انتظام بطریقِ احسن کر دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی معاشرہ کو ان ناہمواریوں سے بچا لیتی ہیں جو ان جذبات کو بلا تحدید چھوڑ دینے سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔

اب سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ "خود غرضی" "فطرتِ انسانی" کا تقاضا نہیں بلکہ تحفظِ ذات کے حیوانی (اور انسانی) تقاضا کو، ذاتی جذبات (یا تنہا عقل) کے مطابق پورا کرنے کی کوششِ بے مہار کا نام ہے۔ تنہا عقل (یا ذاتی جذبات) انفرادی تحفظِ ذات کی اندھی کوششوں میں، کلی مفادِ انسانیت کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور وحی کی رو سے متعین کردہ نظام، تحفظِ ذات کا ایسا انتظام کرتا ہے جس میں تمام نوعِ انسان کی پرورش اور ہر فرد کی امکانی صلاحیتوں کا نشوونما (یعنی تکمیلِ ذات) بطریقِ احسن ہو جائے۔ اس کا نام نظامِ ربوبیت ہے۔ پھر سن رکھو سلیم! کہ مقصودِ حیات صرف طبعی زندگی کی پرورش نہیں۔ اگر مقصود یہی ہوتا تو انسان کو حیوانی سطح سے بلند کیا ہی نہ جاتا۔ یہ حقیقت کہ انسان حیوانی سطح سے بلند ہے، اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مقصودِ حیات طبعی زندگی کی پرورش سے آگے ہے۔ اسی کا نام انسانی صلاحیتوں یعنی اس کی ذات یا (Personality) کا نشوونما پانا ہے اور اس کا انتظام نظامِ ربوبیت کی رو سے ہوتا ہے جس کا ضابطہ قرآن ہے۔

⁂

اب سلیم! تمہارا دوسرا اعتراض سامنے آتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کچھ زیادہ تگ و تاز بھی نہیں کرتا۔ لیکن یوں ہی کچھ "اتفاق" ایسا ہو جاتا ہے کہ اسے بے شمار دولت مل جاتی ہے۔ چونکہ اس قسم کے اتفاقات (Chances) کی کوئی منطقی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی اس لئے اس سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ایسا خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جب خدا کا منشاء یہ ہے کہ اس شخص کو اس قدر فراواں دولت دیدی جائے تو اس پر تحدید منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی۔

تمہارا یہ اعتراض بھی سلیم! بہت سی بنیادی غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ تم نے "اتفاق" (Chance) کا ذکر کر کے "تقدیر" کا مسئلہ چھیڑ دیا اور تم جانتے ہو کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جو خطوں میں طے ہو جائے۔ بایں ہمہ جہاں تک تمہارے زیرِ نظر اعتراض کا تعلق ہے، اس کے متعلق مختصراً اس خط میں لکھنا مناسب ہے۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ہماری کائنات کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ عالمِ آفاق (یعنی انسانوں کی دنیا کے علاوہ باقی ساری کائنات) اور دوسرا حصہ، انسانی دنیا۔ اگر سلیم! تم اس بنیادی فرق کو پیشِ نظر رکھو تو مسئلہ تقدیر کی بہت سی پیچیدگیاں خود بخود حل ہو جائیں گی۔ عالمِ آفاق میں خدا کا قانون از خود کارفرما ہے اور کسی کو اس سے سرتابی کی مجال نہیں۔ کلٌ لہٗ قانتون لیکن انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اپنی مملکت میں آپ صاحبِ اختیار ہے لیکن جس طرح عالمِ آفاق کی نشو و ربوبیت ایک قانون کے تابع ہوتی ہے اسی طرح عالمِ انسانی کی نمود و ارتقاء بھی ایک نظام کے ماتحت کارفرما ہوتی ہے۔ عالمِ آفاق میں ہر شے کو اس قانون کی پابندی طوعاً و کرہاً کرنی پڑتی ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "تقدیر" کے پابند ہیں۔ یعنی اُن اندازوں کے پابند جو ان کی نقل و حرکت اور نشو و نما کے لئے مقرر ہیں اور جن سے انہیں کسی صورت میں بھی مفر نہیں۔ اس کے برعکس عالمِ انسانیت میں یہ قانون، ہدایتِ خداوندی کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ لیکن انسان کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ بالفاظِ دیگر اشیائے کائنات تخلیقی قانون کی پابندی مجبوراً کرتی ہیں، جو ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن انسان، قانونِ خداوندی کی پابندی اپنے اختیار سے کرتا ہے جو اسے انبیاء کی وساطت سے ملتا ہے۔ بقول اقبالؔ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اب آگے بڑھو۔ انسانی زندگی کا ایک حصہ عالمِ آفاق سے بھی متعلق ہے۔ یعنی اس کی طبعی زندگی اس کا نظامِ بدن ان ہی قوانین کے مطابق چلتا ہے جو قوانین، حیوانات کی طبعی زندگی میں کارفرما ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت

ہے کہ انسان کائنات ہی کی فضاؤں میں سکونت پذیر ہے، اس لئے کائناتی قوتیں بھی اس کی زندگی کے نظام طبعی پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں مثلاً کسی جگہ زلزلہ آجاتا ہے تو ہزاروں انسان دب کر مر جاتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے تو بستیوں کی بستیاں خس و خاشاک کی طرح بہ جاتی ہیں۔ انسان کائنات کی ان خارجی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے۔ لیکن جو قوتیں ہنوز اس کے دام تسخیر سے باہر ہیں، وہ ضرور اس پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ جس چیز کا نام تم نے "اتفاق" رکھا ہے اس کا ایک حصہ ان ہی قوتوں کے غلبہ سے متعلق ہے۔ یہ "اتفاق" محض اس وقت تک "اتفاق" (Chance) رہتا ہے جب تک کائنات کی ان قوتوں کے اسباب و علل انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ ..
.. .. ۔جب یہ اسباب و علل انسان کی سمجھ میں آجاتے ہیں تو یہ قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں اور تسخیر شدہ قوتیں، قاعدے اور قانون کے مطابق کارفرما رہتی ہیں۔ ان میں "اتفاق" کا طلسم ختم ہو جاتا ہے۔

"اتفاق" کا دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے اور یہی وہ حصہ ہے جس کی طرف تم نے اپنے اعتراض میں اشارہ کیا ہے۔ یعنی تمہارا کہنا یہ ہے کہ عام قاعدے کے مطابق، ثمر، محنت کے ماحصل کا نام ہونا چاہیئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے بیشتر ثمرات ان کی سعی و کاوش کا ماحصل نہیں ہوتے، بلکہ ایسی راہوں سے آتے ہیں جنہیں سعی و کاوش اور جد و جہد سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا۔ ان ہی کا نام تم نے "اتفاقات" رکھا ہے لیکن اگر تم غور کرو سلیم! تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ "اتفاقات" در اصل ہمارے غلط معاشری نظام کا نتیجہ ہیں۔ صحیح معاشری نظام میں ہر نتیجہ قاعدے اور قانون ہی کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اس میں ثمرات، سعی و کاوش ہی کا ماحصل قرار پاتے ہیں۔ جس طرح کائنات کی مسخر شدہ قوتوں میں "اتفاقات" کا طلسم باقی نہیں رہتا اسی طرح صحیح معاشری نظام میں بھی "اتفاقات" کا اسم تم ختم ہو جاتا ہے؛ یہاں "ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" کا بے لاگ قانون کارفرما ہوتا ہے جس میں عمل انسانی کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور بے عملی کوئی ثمر پیدا نہیں کرتی۔ نہ ہی غلط عمل، صحیح نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ ہم نے

اپنے اوپر غلط نظام مسلط کر رکھا ہے اور اس کے نتائج کو "اتفاقات" کا نام دیکر انہیں "فضل خداوندی" کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ذرا غور کرو سلیم! "ھذا من فضل ربی کے یہ بڑے بڑے درخشندہ اور مقدس کتبے کیا اس غلط معاشری نظام کے "اتفاقات" ہی کے مظہر نہیں ہیں؟

اب یہ بات سامنے آنی چاہیئے کہ غلط نظام میں یہ "اتفاقات" وقوع پذیر کس طرح ہوتے ہیں؟ ہم کہتے یہ ہیں کہ غلط نظام طاغوتی نظام ہوتا ہے۔ اس میں "ابلیس" کا قانون کارفرما ہوتا ہے۔ ذرا سوچو کہ "ابلیس" کرتا کیا ہے؟ وہ کسی دوسری دنیا سے، دولت یا قوت لاکر "اتفاقات" کے ذریعے بہم نہیں پہنچا دیتا۔ وہ کرتا صرف یہ ہے کہ دولت اور قوت کی تقسیم ناہموار طریق سے کر دیتا ہے۔ یعنی قانونِ بقائے توانائی (Law of Conservation of Energy) کی طرح، دولت یا قوت کی مقدار تو اتنی ہی رہتی ہے صرف اس کی تقسیم ناہموار ہو جاتی ہے (اسی کا نام فساد ہے) وہ ایک طبقہ سے اس کی محنت کا ماحصل چھین کر، دوسرے طبقہ کو بلاسعی و محنت دیدیتا ہے (اسی بلاسعی و محنت یافت کا نام "اتفاق" ہے) یہ "معاشی فساد" ہے۔ اسی طرح وہ ایک طبقہ کی اختیاراتی قوتوں کو چھین کر دوسرے طبقہ کو دیدیتا ہے۔ اس کا نام "سیاسی فساد" ہے۔ (چھین کر کیا دیدیتا ہے؟ وہ اس مقصد کے لئے ایسے ایسے غلط تصورات پیدا کر دیتا ہے جس سے ایک طبقہ اپنی قوتوں کو از خود دوسرے طبقہ کے حوالے کر کے ان کے رحم و کرم پر جینے کا خوگر ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے اس کا نام "مقدر" رکھ لیتا ہے) یہی وہ معاشی فساد ہے جس کے متعلق اقبال کہتا ہے کہ

فرنگ آئینِ رزاقی بداند
بایں بخشد ازو وامی ستاند
بہ شیطاں آنچناں روزی رساند
کہ یزداں اندراں حیراں بماند

اسی طرح اقبال سیاسی فساد کے پیدا کردہ خداؤں کے متعلق کہتا ہے کہ ان کی قوت بھی اپنی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ

ایں صنم چو سجدہ اش کردی خداست
تا یکے اندر قیام آئی فناست

یہ سب کچھ لازمی نتیجہ ہے اس غلط نظام کا جو تنہا عقل کی رو سے قائم کیا جاتا ہے۔ اگر سلیم! انسان اپنے معاشرتی نظام کو وحی کی متعین کردہ بنیادوں پر استوار کرے تو اس میں نہ "غلط تقسیم" ہوتی ہے اور نہ ہی وہ "اتفاقات" باعث فریبِ نگاہ بنتے ہیں جن کا نام معاشی دنیا میں "فضلِ ربی" رکھ کر دھوکے کا جال بچھایا جاتا ہے اور سیاسی دنیا میں ظلِ الٰہی اور نیابتِ خداوندی کے سحرِ مقدس سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کی جاتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد، سلیم! یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی کہ انسان کی معاشری دنیا میں جن چیزوں کو ہم "اتفاقات" "قرار دیکر" "منجانب اللہ" تصور کر لیتے ہیں، وہ درحقیقت ہماری معاشری ناہمواریوں کے نتائج ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ضابطے ہیں "اتفاقات" کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جس خدا کے تخلیقی قانون کی یہ کیفیت ہو کہ آسمان کے محیّر العقول کرّے اس قدر حیرت انگیز جسامت اور حیران کن رفتار کے باوجود ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتے، کیا اسی خدا کے قانون کا وہ حصہ جو انسانی اعمال اور ان کے نتائج سے متعلق ہے (معاذ اللہ) اس قدر "سکھا شاہی" کا قانون ہو جائے گا کہ جسے چاہے، بلا قاعدہ اور قانون فراوانیٔ رزق عطا کر دے اور جس پر چاہے روزی کے دروازے بند کر دے؟ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔ اللہ تعالیٰ جہاں "مَنْ يَّشَآءُ" کہتا ہے اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جسے چاہا "موج میں آکر" خزانے بخش دیئے اور جسے چاہا "خفگی میں آکر" نانِ شبینہ تک سے محتاج کر دیا۔ خدا کی مشیت، اس کے قانونِ کائنات کا دوسرا نام ہے اور انسانوں کی دنیا میں اس کا قانونِ مشیت انسانوں ہی کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ یعنی جب انسانی نظام خدا کے ضابطے کے مطابق متشکل ہوگا تو اس کے نتائج قانونِ مشیت کے مطابق خوشگوار مرتب ہوں گے۔ اور جب یہ نظام غیر خدائی ضابطے کے مطابق ہوگا تو اس کے عواقب قانونِ مشیت کے مطابق ناخوش آیند ہوں گے۔ یہ خدا کا قانون ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا اور تم خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ لہٰذا جو قانون اپنے نتائج کے اعتبار سے اٹل اور غیر متبدل ہو، اس میں "اتفاقات" کا کیا دخل اور بلا سعی و محنت ثمرات حاصل کرنے کی توقع کیسی؟ اس میں قدم قدم پر جزآء بما کانو یعملون کا قانون

خوشگواریوں اور بدحالیوں کی بیزان بنتا ہے۔

قسمت بادہ باندازۂ جام است اینجا

اس کے برعکس یہ "ابلیسی نظام" کے کرشمے ہوتے ہیں کہ

دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

⁂

تمہاری بیتابیٔ تمنا مجھ سے رہ رہ کر پوچھتی ہے کہ قرآن کا یہ نظام ربوبیت، جو نوع انسان کے لئے آیۂ رحمت ہے، کس سرزمین میں متشکل ہوگا اور کب ہوگا؟ اس کے متعلق میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں کہ اس نظام کی تشکیل کے لئے اولین مرحلہ یہ ہے کہ اس کا صحیح اور واضح تصور ذہنوں میں جاگزیں ہو جائے، اس لئے کہ انسان کی خارجی دنیا میں کوئی انقلاب وقوع پذیر نہیں ہوسکتا جب تک پہلے اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔ اندرونی تبدیلی کے بغیر ہنگامے تو واقعہ ہوسکتے ہیں، انقلاب ظہور میں نہیں آسکتا۔ مجھے اس ذہنی تبدیلی کے آثار اسلامی ممالک میں کہیں نظر نہیں آتے، . . . . میں قریب قریب ہر اسلامی ملک کے ارباب فکر سے ملا ہوں اور جن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ان کے فکر کا مطالعہ کیا ہے۔ تم حیران ہو گے سلیم! مجھے خالص قرآنی فکر کہیں دکھائی نہیں دیا اور خالص قرآنی فکر کے بغیر، قرآنی نظام کی تشکیل کا تصور بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ وہاں یا تو اس فکر کا نام اسلامی فکر رکھا جاتا ہے جو ہم میں ہزار برس سے متوارث چلا آرہا ہے، اور جس کے متعلق میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ وہ یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کی اس سازش کا نتیجہ ہے جو انہوں نے اسلام سے انتقام لینے کی خاطر نہایت منظم طریق سے کی اور اس میں بیحد کامیاب رہے۔ اور یا، اسلام کو ایک نجی عقیدہ قرار دے کر، عملی دنیا میں مغرب کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس باب میں ہم پاکستانی مسلمان بڑے خوش بخت واقع ہوئے ہیں کہ یہاں خالص قرآنی فکر کی تابناک شعاعیں ضو فشاں ملتی ہیں۔ مبدا فیض کی کرم گستری سے یہیں اقبالؔ پیدا ہوا جس نے اسلامی فکر پر چھائے ہوئے عجمی تصورات کو الگ کر دینے میں اپنی عمر صرف کر دی اور اپنی

نوائے شوق سے ملت اسلامیہ کو قرآن کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ یہی سرزمین حافظ سید محب الحق (مرحوم و مغفور) کی بصیرتِ قرآنی کی جلوہ گاہ بنی کہ جنہوں نے قریب ساٹھ، ستر برس مسلسل قرآن کی طرف دعوت دی۔ آج اسی سرزمین میں علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی کی قرآنی فکر برگ و بار لا رہی ہے، جنہوں نے اپنی عمر عزیز اسی جہاد کے لئے وقف کر رکھی ہے .... (اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے تاکہ ہم ان کے تدبر فی القرآن کے نتائج سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں) میرے کاشانۂ فکر میں سلیم! اگر کوئی چمکتی ہوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ ان ہی کے جلائے ہوئے دیوں کا فروغ ہے۔ اس قرآنی فکر کی مثال مسلمانوں کے کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے میری تمام توقعات اسلامی ممالک میں سے اسی سرزمین سے وابستہ ہیں۔ یہی میری آرزوؤں کی محور اور میری تمناؤں کی مرکز ہے، میں جانتا ہوں کہ اس فضا پر بھی بڑے بڑے دبیز بادل چھائے ہیں تاکہ آفتابِ قرآنی کی یہ تابندہ شعاعیں، اندھیرے میں جینے والی چمگادڑوں کے لئے وجہ خیرگیِ نگاہ نہ بن جائیں۔ لیکن با ایں ہمہ اگر اس فکر کی تابانی کے کہیں امکانات ہیں تو وہ یہی سرزمین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سلیم! تمہیں اور تمہاری وساطت سے تمام نوجوانانِ ملت کو تاکید کرتا رہتا ہوں کہ اس سرزمین کی حفاظت اور استحکام کے لئے اپنی جانیں تک وقف کر دو۔ یہ محض اس لئے کہ اگر اسلامی ممالک میں سے کسی سرزمین میں قرآنی نظام کی تشکیل کے امکانات (زود یا بدیر) ہو سکتے ہیں تو وہ یہی خطۂ زمین ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ نامساعد حالات کے ان جھکڑوں میں کسی نہ کسی طرح اس دیئے کو جلائے رکھوں۔ وہ دیا جو تیل کی جگہ خونِ جگر سے روشن ہوتا ہے۔ اگر عجمی اسلام کی علمبردار ملائیت کی تند و تیز ہواؤں نے اسے سرِ بام نہ جلنے دیا تو تہِ داماں جلاؤں گا اور اگر ان کی یورشیں وہاں تک بھی پہنچ گئیں تو اسے سینہ کے محراب میں، فانوسِ قلب میں روشن رکھوں گا کہ وہاں تو کوئی قوت اسے بجھا نہیں سکے گی! اس کے ساتھ ساتھ سلیم! تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگوں گا تاکہ مرتے وقت اس گراں بہا امانت کو تمہارے سپرد کر کے اطمینان کی موت مروں یاد رکھو سلیم! دنیا میں فروغِ آدمیت صرف قرآنی چراغ سے ہو سکے گا اور بس! واللہ علیٰ ما نقول شہید

کبھی کبھی مجھے یہ خیال بھی آتا ہے کہ اس پیغامِ خداوندی کی اشاعت کے لئے ہم اپنے آپ کو اسلامی ممالک میں ہی کیوں مقید رکھیں۔ یہ پیغام تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے اس لئے اگر اس کے لئے کسی غیر مسلم ملک کی فضا زیادہ سازگار ہے تو اسے وہاں کیوں نہ عام کیا جائے؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ، مسلمانوں کی نسبت مغربی اقوام کے غیر مسلم قرآن کی آواز کو زیادہ توجہ سے سننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ جو کچھ ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے اسے کس طرح چھوڑ دیا جائے۔ غیر مسلموں کے سامنے یہ سوال ہی نہیں۔ وہ قرآن کو اس کی ذاتی قیمت (Intrinsic Value) کے لحاظ سے پرکھیں گے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس نے، جب اور جہاں قرآن کو اس کی ذاتی قیمت سے (On its merits) پرکھا، وہ قرآن کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس اعتبار سے مجھے مغربی اقوام کی سرزمین، قرآنی پیغام کے لئے زیادہ سازگار معلوم ہوتی ہے کہ وہاں عقل ہے، مُلّا ازم کی جہالت اور تنگ نظری نہیں ہے۔

اب رہا یہ کہ ایسا کب ہوگا؟ سو اس کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ "جب اللہ چاہے گا"۔ اور میں جب اللہ سے یہی سوال کرتا ہوں تو وہاں سے جواب ملتا ہے کہ "جب تم چاہو گے"، اس لئے کہ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر وما بانفسہم (۱۳/۱۱) اللہ کا قانون اُس وقت خارجی انقلاب لایا کرتا ہے۔ جب قوم میں داخلی انقلاب پیدا ہو جائے۔ یہی وہ "داخلی انقلاب" ہے جس کے لئے سب سے پہلے نوجوانانِ ملت کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنی ضروری ہے اور یہ تبدیلی اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کے سامنے وہ قرآنی تصورات بے نقاب کئے جائیں جن سے عہد محمد رسول اللہ والذین معہٗ میں وہ انقلاب پیدا ہو گیا جس کی مثال پھر سامنے نہیں آئی۔ میری زندگی کا مقصود ان ہی قرآنی تصورات کا عام کرنا ہے ولو کرہ المشرکون۔

والسلام

جون سنہ ۱۹۵۱ء

سلیم کے نام اٹھارواں خط

انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کیسے ہوسکتی ہے؟

ہاں سلیم! تمہاری اطلاع درست تھی۔ میں پچھلے دنوں اچھا نہیں رہا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ سنہ ۱۹۴۲ء میں مجھے لو لگ گئی تھی۔ اس کے بعد آج تک میری حالت یہ ہے کہ ذرا سی گرم ہوا بھی اثر کر جاتی ہے۔ اگلے دنوں یہی ہوا۔ ایک رات سخت تکلیف رہی۔ درد سے تڑپتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا دوائیوں کا بکس میرے سرہانے رکھا تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ اس کے لئے کونسی دوائی چاہیئے۔ صبح وہ آئے اور اسی ڈبے میں سے ایک دوائی نکال کر دی جس سے فوراً آرام ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ دنیا بھر کے مصائب و نوائب کا شکار ہو رہے ہیں۔ مختلف نوعیتوں کے درد اور آلام میں مبتلا ہیں۔ قرآن اُن کے سرہانے رکھا رہتا ہے۔ لیکن انہیں معلوم نہیں کہ اس نسخے کا استعمال کیسے کیا جائے۔ "نیم حکیموں" کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ نہ شفا ہوتی ہے نہ رہائی۔ ورنہ اگر یہ کبھی قرآن کھول کر دیکھ لیتے تو اس میں سے انہیں شفا کا نسخہ اس طرح مل جاتا جس طرح برادرانِ حضرت یوسفؑ کو بوریوں میں سے اپنی پونجی مل گئی تھی۔ لما فتحوا متاعھم وجدوا بضاعتھم

کیسی بدبختی ہے سلیم! اس مریض کی جو تڑپ تڑپ کر جان دیدے در آں حالیکہ دواؤں کا بکس اس کے سرہانے رکھا ہو!

* * *

مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے "فطرت اللہ" کا صحیح مفہوم سمجھ لیا۔ ورنہ وہ بات مشکل بھی تھی اور روشِ عامہ سے ہٹی ہوئی بھی۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید اتنی جلدی تمہاری سمجھ میں نہ آسکے۔ دیکھا تم نے سلیم! ایک بات کے واضح ہو جانے سے کتنی اور باتیں خود بخود صاف ہو جاتی ہیں؟ قرآن فی الواقعہ بہت آسان ہے ولقد یسرنا القرآن للذکر بشرطیکہ اسے سلیقے سے سمجھا جائے، اور اگر اسے چیستان بنا دیا جائے تو پھر اس میں ایسا الجھاؤ پیدا ہوتا ہے کہ ملا بیچارے کے اٹھارہ علوم تو ایک طرف، دنیا بھر کے علومِ زندگی کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتے۔ لیکن یہ گتھیاں خود، ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ خود ہی اندر سے کواڑ بند کر رکھا ہے اور خود ہی رو رہے ہیں کہ باہر کیسے نکلیں۔ ہاتھ بڑھاؤ، کواڑ کھولو۔ باہر نکلنے کا راستہ خود بخود کھل جائے گا۔

تم نے ٹھیک سمجھا ہے کہ خدا کا جو قانونِ تخلیق، عالمِ آفاق میں کارفرما ہے، وہی انسان کی دنیا میں نافذ العمل ہے، اس فرق کے ساتھ۔ کہ وہاں یہ قانون از خود کارفرما ہے اور یہاں انسان کو اختیار ہے کہ چاہے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے کوئی دوسرا قانون اختیار کرلے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ انسان کی زندگی کے دو حصے ہیں: ایک حصہ وہی ہے جو حیوانات سے متعلق ہے۔ یعنی انسان کی طبعی زندگی؛ اس میں بدیہی طور پر وہی قانون کارفرما ہے جو عام حیوانات میں جاری و ساری ہے۔ حیوانات ہی کی طرح اس کی زندگی کا دار و مدار بھی ہوا اور غذا پر ہے۔ سونا اور جاگنا بھی ان ہی کی طرح ہے۔ اس کے جسم کی مشینری بھی اسی طرح چلتی ہے اسی قانون کے مطابق یہ زندہ رہتا ہے اور اسی کے مطابق مر جاتا ہے۔ لہذا جس قدر معاملات اس کی طبعی زندگی سے متعلق ہیں وہ اس کی انسانی زندگی نہیں بلکہ حیوانی زندگی کا حصہ ہیں۔ لیکن اس نے اس حصۂ زندگی میں بھی اپنے لئے اس قدر مصیبتیں پیدا کرلی ہیں کہ وہ مسائل جو حیوانات کی زندگی میں کوئی معنی ہی نہیں رکھتے، اس کے لئے زندگی کی اہم ترین مشکلات (Problems) بن گئے ہیں جنگل کے جانوروں کو یہ سوچنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی کہ آج کھائیں گے کیا اور رات کو رہیں گے کہاں؟ ہم بیمار پڑیں گے تو دوائی کون لا کر دے گا۔ اور مر گئے تو بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ان میں سے کسی کو اس کی فکر نہیں ستاتی۔ لیکن یہ حضرت "اشرف المخلوقات"

ہیں کہ ان کی زندگی کی ساری تگ و تاز ان ہی گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ہو جاتی ہے اور یہ اس پر بھی سلجھنے میں نہیں آتیں۔ ذرا غور کرو سلیم! آج ساری دنیا ان ہی خود پیدا کردہ مسائل کے حل کرنے میں مصروف ہے اور مسائل ہیں کہ جس قدر حل کرو اور پیچیدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے کسی حد تک کھانے پینے کے مسئلہ کا حل پا لیا ہے۔ وہ اسے انسانیت کا منتہائے کمال سمجھتے ہیں اور زندگی کی معراج۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو لوگ اتنا بھی نہیں کر پائے، اُن کے مقابلے میں یہ لوگ اپنی اس کاوش پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو سلیم! کہ کیا اس سے انسانیت کے مسائل حل ہو گئے؟ کیا انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہ مسائل انسانی زندگی کے اس حصہ سے متعلق ہیں جو انسان اور حیوان میں مشترک ہے۔ لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہو کہ اس سے حیوانی زندگی کے مسائل حل ہو گئے! انسانی زندگی کو تو اس نے ابھی چھوا تک بھی نہیں۔ وہ مقام اس سے آگے ہے۔ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے معاشی پہلو (طبعی زندگی سے متعلق مسائل) کا حل بھی پیش کرتا ہے اور اس کی انسانی زندگی کے نشو و نما اور ارتقاء و بالیدگی کا نظام بھی متشکل کرتا ہے۔ خدا کا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ)، ان تمام مسائلِ حیات کو محیط ہے۔

میں نے تمہیں پچھلے خط میں بتایا تھا کہ خدا کے قانونِ تخلیق کی ایک شق یہ ہے کہ ہر شے میں کچھ امکانی قوتیں ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہیں۔ اور ان مضمر قوتوں کے نشو و نما کے بعد انہیں تکمیل تک پہنچانا، ان اشیاء کا مقصودِ حیات ہے (اسے قانونِ ربوبیت کہا جاتا ہے)۔ بڑ کے ایک ننھے سے بیج کو دیکھو۔ اس میں کتنی عظیم القدر قوتیں مضمر ہوتی ہیں، اس میں سے کونپل پھوٹتی ہے۔ کونپل پودا بنتی ہے۔ پودا بڑھ کر پیڑ بنتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ایک تناور بڑ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس میں پھل لگتا ہے جس کے اندر سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ویسے ہی ننھے ننھے بیج ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر بیج اسی قسم کا بڑ بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ عالمِ آفاق میں یہ لامتناہی سلسلہ جاری و ساری ہے۔

بڑ کے بیج کا بڑ بن جانا، اس کا مقصودِ حیات ہے۔ یہی اس کی صلاحیتوں کا پیمانہ ہے، اسی کو اس کی تقدیر

کہتے ہیں وہ اگر اس انتہا تک نہیں پہنچتا، تو اپنے مقصدِ حیات میں ناکام رہ جاتا ہے۔ اس کی مضمر قوتیں تمام و کمال شہود نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ اپنے آخری مقام سے آگے بھی نہیں بڑھ سکتا کیونکہ اس میں اس سے آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ آخری مقام اس کی منزلِ مقصود ہے۔ اُس کی سعی و کاوش کا رُخ اسی آخری مقام کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی تمام تگ و تاز اسی نہج پر ہوتی ہے۔ وہ اسی کے لئے متشکل کیا گیا ہے قُل کُلٌّ یعمل علیٰ شاکلتہٖ

پھر اس پر بھی غور کرو سلیم! کہ مختلف اشیاء کی امکانی وسعتیں مختلف ہوتی ہیں۔ تمہاری کوٹھی کی باڑ کس قدر خوبصورت ہے۔ لیکن اس بیل میں نہ پھول آتے ہیں نہ پھل۔ پتوں کی تر و تازگی اس کی آخری منزل ہے۔ اس کے ساتھ ہی چنبیلی کی شاخیں ہیں کہ بہار میں ہر شاخ عطر بیز اور عنبر فشاں بن جاتی ہے لیکن اس کی منزل بھی پتوں اور پھولوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس سے آگے بڑھو تو آم کے پیڑ ہیں۔ سبحان اللہ! سبحان اللہ!

انگبیں کے ہیں سربمہر گلاس

(میرا خیال ہے سلیم! غالبؔ کی رسائی سروَلی تک ہی ہوئی ہوگی۔ اسی لئے تشبیہ 'شہد' تک رک کر رہ گئی۔ اگر کہیں چونسہ بھی مل جاتا، تو معلوم میرزا صاحب کیا کیا کہتے اور اس پر بھی اطمینان نہ ہوتا کہ تشبیہ تام ہے۔ آم کو "انگبیں کے گلاس" کہنا، میرے نزدیک آم کی بے حرمتی ہے، اور اگر میرزا کی روح معاف کر دے تو مجھے یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ اپنی بے ذوقی کا ثبوت۔ کہاں آم، کہاں شہد، کہاں راجہ بھوج کہاں نتوا تیلی۔ آم کے متعلق تو سوائے اس کے کہ آدمی یہ کہہ کر خاموش ہو جائے کہ "اما تو چیزے دیگری" اور کوئی چارہ کار ہی نہیں) ان سے آگے ببول ہے کہ بچارے کا منتہائے کمال چند کانٹے ہیں جو قیس عامری کے لباس برہنگی کی بخیہ گری کرتے یا اس کی صحرا نوردیوں میں سامانِ آبلہ شکنی بنتے ہیں۔ لیکن پتے ہوں یا پھل، پھول ہوں یا کانٹے۔ کامیاب درخت وہی کہلاتا ہے جو اپنے انتہائی مقام تک جا پہنچے۔ جو راستہ میں سوکھ جائے، وہ کاٹ کر جلا دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی مضمر قوتیں بہ تمام و کمال نشو و نما نہیں پاتیں۔ اس کی ممکناتِ زندگی تزکیہ یاب نہیں ہوتیں۔ (Un-developed) رہ جاتی ہیں قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا جو بیج نشو و نما پا گیا اس کی کھیتی پک گئی۔ جو مٹی کے تودے کے نیچے

دب کر رہ گیا وہ نامراد رہا۔ لہٰذا قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کی پہلی شق یہ ہے کہ ہر شے کی مضمر قوتیں اس کی آخری منزل تک نشو و نما پا کر مشہود ہو جائیں۔ چونکہ انسان کی خلقت بھی اسی قانونِ تخلیق کے مطابق ہوئی ہے۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا۔ اس لئے جس انسان کی مضمر صلاحیتیں بہ تمام و کمال نشو و نما پا گئیں، وہ شق اول کے اعتبار سے کامیاب ہو گیا۔ جس کی صلاحیتیں دب کر رہ گئیں وہ ناکام رہا۔ زندگی کی علامت‘ ذوقِ نمود۔ اور اس کا معراج‘ اس کے جوہروں کی برومندی اور ثمرباری ہے۔ رشکِ صد فردوس ہے وہ معاشرہ جس میں یہ شادابیاں اور سیرابیاں ہمیشہ قائم و دائم رہیں۔ تجری من تحتہا الانہار خلدین فیہا ابدا، اور جہنم کی آگ ہے وہ ماحول جس میں یہ سرسبز شاخیں جل کر، متحجر ہو جائیں وقودھا الناس والحجارہ۔

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو اور دیکھو کہ ایک ننھا سا بیج کس طرح تناور درخت بن جاتا ہے۔ بیج کو میز پر رکھ چھوڑو۔ اس میں قیامت تک آثارِ نمود دکھائی نہیں دیں گے۔ اس کے لئے اسے مٹی میں ملانا ہوگا۔ مٹی میں نمی کا ہونا بھی ضروری ہے، پھر اسے حرارت بھی درکار ہے۔ اس کے بعد ہوا بھی۔ آب و خاک و باد و نار کے امتزاج سے بیج میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے ان عناصر کا باہمی تعاون ہی نہیں ہونا بلکہ اس سے بھی ایک درجہ آگے ”ائتلاف“ کی شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ تمام عناصر اپنے آپ کو بیج کے اندر جذب کر دیتے ہیں، اور جسے ہم کونپل کہتے ہیں، وہ درحقیقت ان ہی عناصر کی تربیت یافتہ شکل ہوتی ہے۔ ان تمام عناصر کو الگ الگ رکھئے کسی میں بالیدگی پیدا نہیں ہوگی۔ جب یہ اپنے آپ کو ایک دوسرے میں جذب کر دیں گے تو ہر ایک میں جوشِ نمو ابھر آئے گا۔ جسے ہم پھل کہتے ہیں وہ تنہا بیج کی ارتقا یافتہ صورت نہیں ہوتی۔ نہ معلوم اس میں کس قدر مٹی کے نمک، پانی، ہوا اور حرارت کے مرکبات باہمد گر مدغم ہوتے ہیں۔ پھل، گویا ان سب کی ارتقا یافتہ شکل کا نام ہے۔ جو سینکڑوں گردشوں کے بعد ظہور میں آتی ہے۔

لہٰذہ، قانونِ تخلیق (فطرت اللہ) کی دوسری شق یہ ہے کہ کوئی قوت انفرادی طور پر ارتقائی منازل طے کر کے نشو و نما نہیں پا سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ دوسری قوتیں بھی اپنے آپ کو اس کے اندر جذب کر دیں۔

اور اس طرح یہ تمام قوتیں ایک دوسرے میں سمو کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جائیں۔ نشو ونما (Development) کا راز ربط باہمی میں ہے۔

انسانی زندگی میں اس ربطِ باہمی کا نام اجتماعی نظام یا معاشرہ ہے۔ جس نظم کے ماتحت یہ اجتماعی نظام وجود میں آتا ہے، قرآن کی اصطلاح میں اُسے الدین کہا جاتا ہے۔ قانونِ تخلیق کی اس شق کے مطابق، افرادِ انسانیہ انفرادی طور پر اپنی مضمر صلاحیتوں کو نشو ونما دے ہی نہیں سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مختلف افراد اپنی اپنی صلاحیتوں کو ایک کُل میں سمو دیں۔ (الّف بین قلوبکم) اور اس عملِ ائتلاف سے نشو و ارتقا کی منازل طے کرتے چلے جائیں۔ اس کا نام اُمّت، یا ملّت یا جماعت ہے۔ یہ کُل ان افراد کی قوتوں میں سے اپنے لئے کچھ نہیں لیتا۔ اس کا دراصل الگ وجود ہی نہیں ہوتا، جس طرح مشین پرزوں کے مجموعہ کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ لیکن مشین کی مجموعی قوت، یا تخلیقی نتیجہ (Creative Outcome) پرزوں کی مجموعی قوت سے زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مشین میں قوت کی یہ زیادتی کہاں سے آجاتی ہے۔ لیکن اس کے وجود سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ دراصل نتیجہ ہوتی ہے اس نظم (Order.) کا جس میں وہ پرزے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ ان پرزوں سے اس نظم کو الگ کر دیجئے۔ ان کی تمام قوت معدوم ہو جائے گی۔ وہ نظم جو افراد (کے پرزوں) کو جماعت (کی مشین) کی صورت میں متشکل کر دیتا ہے الدین کہلاتا ہے۔ "دیندار" وہ افراد ہیں جو نظمِ باہمی سے جماعت (مشین) کی صورت میں مربوط ہو جائیں اور اس طرح ان کی ہر حرکت ایک خاص نتیجہ پیدا کرے۔ پرزوں کی اس ہم آہنگی (ایک قانون کے تابع نقل و حرکت) کو اسلام کہتے ہیں۔ جب چار چار گھوڑے اکٹھے چلیں، اس طرح کہ ان کے قدم ایک ساتھ اٹھیں اور ایک ساتھ جھکیں تو اسے تسالم کہتے ہیں۔ اسی سے اسلام کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی وارکعوا مع الراکعین۔ جھکنے والوں کے ساتھ جھکنا۔

میں نے پرزوں اور مشین کی مثال محض سمجھانے کی خاطر دی ہے۔ ورنہ افراد کے نظم و ضبطِ باہمی کا تعلق پرزوں کے ربط و ترتیب سے مختلف اور بلند ہوتا ہے۔ پرزوں کا ربط زیادہ سے زیادہ تعاون کہلاتا ہے، لیکن مُسلم

افراد کا ربط باہمی، ائتلاف کہلاتا ہے (الّف بین قلوبکم) یعنی اس طرح ایک دوسرے میں ضم ہو جانا۔ جس طرح ایک بادل دوسرے بادل میں سمو جاتا ہے

تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

قانونِ خداوندی سے ہم آہنگی اور یک نگہی کی یہ آخری منزل ہے جسے تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یا ایها الذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللّٰه لعلکم تفلحون

فلاحت، (لعلکم تفلحون) "کھیتی کے بار آور" ہونے (بیج کے درخت بن کر ثمر بار ہو جانے) کے لئے اس قسم کا ارتباط وائتلاف ناگزیر ہے۔ اس میں ہر فرد، دوسرے افراد کی ربوبیت (پانی کے قطرہ کے موتی بن جانے) کا سامان بن کر خود اپنی نشوونما کا ذریعہ بن جاتا ہے جس طرح مٹی اور پانی، حرارت اور ہوا، بیج کی ربوبیت کا ذریعہ بن کر درحقیقت خود اپنی نشو وارتقاء کا موجب بنتے ہیں۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس میں محسوس ہی نہیں ہونے پاتا کہ کون کس کی ربوبیت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ تمام افراد اپنی اپنی مضمر صلاحیتوں کو ایک مشترک منزل کے حصول کے لئے روبہ عمل لاتے چلے جاتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر فرد کی صلاحیتیں نشوونما پا کر خود بخود (Develop) ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی کا نام ساعی کا مشکور ہو جانا ہے (کان سعیکم مشکورا) "شکر" کے معنی ہیں بکری کے تھنوں کا اس طرح دودھ سے بھر جانا کہ نظر آئے کہ دودھ اب ٹپکا کہ ٹپکا۔ افراد کی محنتیں (سعیکم) اسی طرح "مشکور" (Fully Develop) ہوتی ہیں۔

قانونِ تخلیق خداوندی (فطرت اللہ) کی یہ دوسری شق ہے۔ اس کے بغیر امکانی صلاحیتیں کبھی نشوونما نہیں پا سکتیں۔

* * *

اب ایک قدم اور آگے بڑھو۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بیج کی نشوونما کے لئے، مختلف اور متضاد قوتوں کے باہمی امتزاج و ادغام کی ضرورت ہے۔ پانی اور حرارت۔ ہوا اور مٹی۔ سب کا باہمی امتزاج۔ لیکن اس کے ایک اور پہلو پر بھی

غورکرو، آغوشِ خاک، بیج کے لئے سامانِ زیست ہے۔ لیکن وہی مٹی اگر ذرا زیادہ مقدار میں بیج کے اوپر آجائے تو اس سے بیج کا گلا گھٹ جاتا ہے اور وہیں دب کر رہ جاتا ہے۔ پانی، کونپل اور پودے کے لئے ذریعۂ حیات ہے۔ لیکن اگر پانی ذرا بھی اپنی حد سے بڑھ جائے تو پودے کی کشتیٔ حیات اس میں غرق ہو جاتی ہے۔ حرارت کے بغیر رگِ تاک میں آثارِ حیات معدوم ہوتے ہیں۔ لیکن . . یہی حرارت اگر ایک قدم آگے بڑھ جائے تو ہری بھری کھیتیوں کو جھلس کر رکھ دیتی ہے۔ ہوا، ہر پودے کے لئے نفسِ حیات ہے لیکن اسی ہوا کی تیزی اسے جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان متضاد عناصر کا باہمی ارتباط و امتزاج ہی ضروری نہیں۔ بلکہ اس امتزاج کے لئے ایک خاص توازن و تناسب بھی لاینفک ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑا۔ نہ صرف نشوونما رک گئی بلکہ بیج کی تمام امکانی قوتیں سلب ہو کر رہ گئیں۔

اعتدال اور تناسب کے ساتھ ہی ایک چیز موقع اور محل بھی ہے۔ پودے کی برومندی کے لئے کبھی حرارت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، کبھی ٹھنڈک کی، کبھی پانی کی ضرورت ہوتی ہے کبھی خشکی کی۔ موسم اور بے موسم کی کاشت اسی فرق کا مظہر ہوتی ہے۔ لہٰذا قانونِ تخلیق کی تیسری شق یہ ہے کہ مختلف قوتوں میں خاص تناسب قائم رہے اور جس وقت جس قوت کی خاص طور پر ضرورت ہے اس وقت وہی قوت اپنے خاص توازن کو لئے ہوئے بروئے کار آئے۔

انسانی زندگی میں متضاد قوتوں کا تصادم، ایک تو ہر فرد کے اپنے سینے میں ہوتا ہے اور دوسرے مختلف افراد میں باہمدگر متضاد قوتوں کی کشمکش جو انسان کے اپنے سینے میں موجزن ہوتی ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ گہری اور شدید ہوتی ہے جو دو افراد کے درمیان وجہ کشاکش ہوتی ہے۔ افراد کی متضاد قوتوں کی کشاکش محسوس اور مشہود ہوتی ہے، اس لئے انہیں اس کا علم بدیہی طور پر ہو جاتا ہے۔ برعکس اس کے جن قوتوں کی رزمگاہ انسان کا اپنا سینہ ہوتا ہے وہ بڑی غیر محسوس اور یکسر غیر مرئی ہوتی ہیں، اس لئے ان کا تضاد بدیہی طور پر نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دوسروں کے فریب کے مقابلہ میں خود اپنے نفس کے فریب میں بہت جلد آجاتا ہے اور بہت دیر تک اس سے نکلنے نہیں پاتا۔

متضاد قوتوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے عدم توازن سے۔ اگر ان میں توازن قائم رہے تو ان کی باہمی کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور وہ باہمی امتزاج و ائتلاف سے وجۂ بالیدگیٔ نفس بن جاتی ہیں۔ یعنی خود اپنے نشو و نما کا ذریعہ۔ اس توازن کو قائم رکھنے کا نام "حسنِ عمل" ہے۔ سلیم! تم جانتے ہو کہ "حسن" کسے کہتے ہیں؟ حسن، صحیح صحیح تناسب Proportion کا نام ہے۔ کسی شے کے مختلف اجزا میں جس قدر صحیح تناسب ہوگا۔ وہ اتنی ہی حسین کہلائے گی۔ اور جب وہ تناسب اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ جائے گا تو وہ شے جمالیاتی معراج تک جا پہنچے گی۔ تاج محل کا حُسن، کہ جسے دیکھ کر تم نے کہا تھا کہ جی چاہتا ہے اسے گلے لگالوں اور خوب زور سے بھینچوں، اس کے تناسب کے سوا اور کیا ہے؟ اس میں تناسب اپنی انتہا تک پہنچ گیا ہے جس کی وجہ سے اس کا حسن بے مثال ہو گیا ہے۔ دلی کی جامع مسجد کہ جس کے متعلق حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ وہ تو بیگم ہے، اسی صحتِ تناسب سے حسنِ مجسّم بن گئی ہے۔ یہی تناسب جب انسان کی مضمر قوتوں میں رونما ہوتا ہے تو اُسے قرآن "حسنات" سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کی ضد "سیئات" ہے جس کے معنی تناسب کا بگاڑ ہیں۔ جب ان قوتوں میں ٹھیک ٹھیک تناسب پیدا ہو جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہے۔ جب توازن بگڑ جائے تو اُسے شر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسانی قوتوں میں سے کوئی قوت نہ بجائے خویش خیر ہے نہ شر۔ انسان کی امکانی قوتوں میں سے ہر قوت، حصولِ مقصدِ حیات کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے ان تمام قوتوں کی کامل نشو و نما لاینفک۔ اس نشو و نما کے بعد، جب ان قوتوں میں باہمی تناسب پیدا ہو جائے تو وہ وجۂ ربوبیت بن جاتی ہیں۔ اس کا نام خیر ہے۔ جب ان کا تناسب بگڑ جائے تو وہ باعثِ تخریب ہو جاتی ہیں اسے شر کہا جاتا ہے۔ گویا ہر شے کی ایک شر کی کیفیت ہوتی ہے اور ایک خیر کی حالت۔ خیر کی حالت وہ ہے جب اس میں توازن و اعتدال ہو۔ شر کی حالت وہ جس میں توازن بگڑ جائے۔ ایک گلاس پانی باعثِ حیات ہے۔ یہ اس کی خیر کی کیفیت ہے لیکن وہی پانی جب اپنے اعتدال سے بڑھ جائے اور انسان اس میں ڈوب جائے تو موجبِ ہلاکت ہو جاتا ہے۔ یہ

---

[1] اس اجمال کی تفصیل میرے مقالہ "اسبابِ زوالِ اُمّت" میں آچکی ہے۔

پانی کی شرّی کیفیت ہے۔ لہذا پانی اپنی ذات میں نہ خیر ہے نہ شر۔ اس میں دونوں پہلو موجود ہیں۔ یہی حالت کائنات کی ہر شے کی ہے۔ خدا کا قانون یہ سکھاتا ہے کہ ہمیشہ اشیائے کائنات کے خیر کے پہلو سے متمتع ہو اور شر کے پہلو سے مجتنب رہو۔ غور کرو سلیم! "قل اعوذ برب الفلق۔ من شر ما خلق" میں پناہ مانگی ہے "من شر ما خلق" اشیائے کائنات کے شرّی پہلو سے۔ کائنات اور انسان کی مختلف قوتوں میں صحیح تناسب قانونِ خداوندی کے ماتحت پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی آفاقی اور انسانی قوتیں قانونِ خداوندی کے مطابق سرگرمِ عمل ہوں گی، تو ان کا خیر ہی کا پہلو مشہود ہوگا (بیدك الخیر) انسان کے صحیح اختیار کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ معاشرہ میں خیر کے پہلو کو سامنے لائے (خیر اور اختیار ایک ہی بات ہے)

جب افراد کے اندر، مضمر قوتوں کی نشوونما بطریقِ احسن ہوتی ہے اور ان میں صحیح صحیح تناسب بھی پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے انسان کی اپنی ذات پر جو کیفیت مرتب ہوتی ہے اسے قرآن نے "اطمینانِ قلب" سے تعبیر کیا ہے اطمینان، کسی سلبی کیفیت (Negative (Condition) کا نام نہیں۔ یہ ایک ایجابی صفت (Positive Virtue) ہے۔ مثلاً جس انسان کی تندرستی ٹھیک ہو اور اسے کسی قسم کا فکر بھی دامن گیر نہ ہو، اس میں ایک عجیب قسم کے بھاری بھرکم، ثقاہت اور متانت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جسے یہ نصیب ہوتی ہے وہ اس کے سرور سے کیف اندوز ہوتا ہے اور دوسرے لوگ صرف اس کے مظاہر سے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اسی طرح جس انسان کی مضمر قوتیں پورے نشوونما کے بعد، متناسب و متوازن ہو جائیں اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے دوسرے انسانوں سے نمایاں طور پر متمیز کر دیتی ہے۔ اسی کو قرآن مومن کا امتیازی نشان قرار دیتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ یہ کیفیت انفرادی طور پر پیدا نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انسانی مضمر قوتوں کی نشوونما انفرادی طور پر ناممکن ہے۔ اس کے لئے اسے اجتماعی نظام کی ضرورت ہے۔ جب اطمینانِ قلب کو کسی انفرادی عمل کا نتیجہ بتایا جائے وہ خواب آور افسون ہوتا ہے۔ اور تصوف میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

جس طرح ایک فرد کی زندگی کی مضمر قوتوں میں ٹھیک ٹھیک تناسب ناگزیر ہے، اسی طرح افراد کے مجموعہ یعنی معاشرہ (اجتماعی زندگی) میں مختلف افراد کی صلاحیتوں میں تناسب نہایت ضروری ہے۔ جب کسی معاشرہ میں یہ تناسب قائم ہو جاتا ہے تو اسے "اصلاح" کی حالت کہتے ہیں اور جب یہ تناسب بگڑ جاتا ہے تو اسے حالت "فساد" سے تعبیر کرتے ہیں، اصلاح کے معنی ہیں ہمواری۔ اور فساد کے معنی ناہمواری۔ "مصلحین" معاشرہ کے ان افراد کا نام ہے جن میں اس قسم کا تناسب و توازن قائم رہتا ہے۔ مفسدین انہیں کہتے ہیں جن میں یہ توازن موجود نہیں ہوتا۔ اصلاح کا نتیجہ اجتماعی ربوبیت ہے۔ یعنی اس معاشرہ میں تمام افراد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں کے کامل نشوونما کا سامان موجود ہوتا ہے (اس قسم کا معاشرہ خود ہی اس نشوونما کا ذریعہ بن جاتا ہے) اس کے برعکس "مفسدین" کے معاشرہ میں بڑی ناہمواریاں ہوتی ہیں اور اجتماعی ربوبیت کے بجائے ہر فرد سب کچھ اپنے لئے سمیٹنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔

دوسری چیز موقعہ اور محل کا سوال ہے۔ یعنی ان قوتوں کی نشوونما کے بعد، اس چیز کا صحیح صحیح فیصلہ کہ کس موقعہ پر کس قسم کی قوت کا روبعمل آنا ضروری ہے۔ قرآن، اس قسم کی قوتِ تمیز کو "بصیرت" سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی لئے وہ مردانِ مومن کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اولی الایدی والابصار (صاحبان قوت و بصیرت) ہوتے ہیں۔

⁂

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو۔ لیکن جتنا کچھ اس وقت تک کہا گیا ہے پہلے اسے اچھی طرح سے ذہن نشین کرلو، پھر بات آگے چلے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں کہانی کہتا چلا جاؤں اور تم بابا فتّے خاں کی طرح سوتے ہی میں "ہوں ہوں" کرتے رہو۔ تم سلیم! بابا فتّے خاں پر تو ہنسا کرتے تھے لیکن اگر غور کرو تو دنیا میں اکثریت فتّے خانوں ہی کی پاؤ گے۔ سو رہے ہیں اور "ہوں، ہوں" کر رہے ہیں۔ بات سمجھنے والے بہت کم دکھائی دیں گے۔ اور پھر جب تم بات بھی ایسی چھیڑ دو جو دنیا جہان سے نرالی ہو تو اس پر کان دھرنے والے کتنے مل سکیں گے؟ ایک وہ تھے جو کہتے تھے کہ ؎

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

اور ایک ہم ہیں کہ کہانی کہہ رہے ہیں، اور اوّل تو اسے سننے والے ہی نہیں ملتے، اور جو سُن کر "ہنکارا" بھر رہے ہیں اُن کے متعلق بھی شبہ ہے کہ نہ معلوم جاگ رہے ہیں یا سوتے ہی ہیں" ہوں ہوں " کیے جا رہے ہیں! بہرحال تمہارا تقاضا ہوتا ہے تو میں کہانی شروع کر دیتا ہوں۔ اب سننا نہ سننا تمہارا کام ہے۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ خدا کے جس قانون تخلیق (فطرت اللہ) کے مطابق انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس کے مطابق

(i) مقصود تگ وتاز یہ ہے کہ ہر انسان کی امکانی وسعتوں (Human Faculties) کی پوری پوری نشو ونما (Development) ہو جائے۔

(ii) یہ نشو ونما انفرادی طور پر ناممکن ہے۔ اس کے لئے نظامِ اجتماعی لاینفک ہے۔

(iii) اور نظامِ اجتماعی میں ان کی صحیح نشو ونما اسی صورت میں ممکن ہے جب ان میں ٹھیک ٹھیک تناسب قائم ہو اور یہ بھی معلوم ہو کہ کس موقع پر کس قسم کی قوت روبہ عمل آنی چاہیئے۔

اب آگے بڑھو۔ عالمِ آفاق (باہر کی دنیا) میں خدا کا قانون اس طرح کارفرما ہے کہ کائنات کی متضاد قوتوں میں کبھی تصادم واقعہ نہیں ہوتا۔ ان میں ٹھیک ٹھیک تناسب بھی قائم رہتا ہے اور جہاں جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے اور جتنی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ قوت اتنی ہی مقدار میں بروئے کار آجاتی ہے کل لہ قانتون کے یہی معنی ہیں۔ "سقاء قنیت" اس مشکیزے کو کہتے ہیں جو اس طرح احتیاط سے سیا جائے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی از خود نہ ٹپکے اور اس کا منہ اس تدبیر سے باندھا جائے کہ جہاں جس قدر ضرورت ہو، وہاں اتنا ہی پانی اس میں سے باہر آئے۔ اس تصریح کے بعد، سلیم! غور کرو کہ قرآن نے جب عالمِ آفاق کی مختلف اشیاء کے متعلق فرمایا ہے کہ کل لہٗ قانتون (سب کی سب خدا کے قانون کے لئے سقاء قنیت کی طرح ہیں)، تو اس نے کارگہ عالم کے نظم ونسق کا کیسا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ ہر شے، اپنے جوہرِ مضمر کی کامل نشو ونما سے اس مشکیزے کی طرح

لٹکی ہوئی جو پانی سے لبالب بھرا ہو اور اپنی قوتوں کو اس انداز سے محفوظ رکھے ہوئے کہ ایک قطرہ بھی بے موقعہ و محل ضائع نہ ہو، اور جہاں ضرورت ہو، وہاں اس طرح لب کشا، کہ ہر ایک، اپنے اپنے ظرف کے مطابق سیر ہو جائے

کل لہٗ قانتون

لیکن سلیم! انسان کی دنیا میں یہ قانون اس طرح نافذ العمل نہیں ہے۔ انسان کو آزادی حاصل ہے۔ اسے صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس نے راہ اور بے راہ روی اپنے فیصلے سے اختیار کرنی ہے۔ اس باب میں انسان نے اپنی عقل کی رو سے کیا فیصلہ کیا، یہ داستان دلخراش بھی ہے اور تبسم ریز بھی۔ اس نے یہ سمجھ لیا کہ انسان کے اندر بعض قوتیں شر کا موجب ہیں اس لئے ان کا علاج یہ ہے کہ انہیں دبا دیا جائے۔ اگر تم غور کرو سلیم! تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آ جائے گی کہ انسان کی ساری تاریخ اسی لفظ "دبانے" (Suppression) ہی کی تفصیل ہے۔ انفرادی دنیا میں یہ "دبانا" رہبانیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ رہبانیت کیا ہے؟ ان قوتوں کے دبانے (اور دبا دبا کر بالآخر انہیں، بزعم خویش فنا کر دینے) کا فلسفہ اور عمل۔ لیکن یہ انسان کی بھول تھی۔ انسان کے اندر نہ تو کوئی ایسی قوت ہے جو بجائے خویش شر انگیز ہے اور نہ انسانی قوتیں دبانے سے فنا ہوتی ہیں۔ انہیں ایک طرف سے دبائیے تو معلوم کتنے غیر معلوم "چور دروازوں" کے راستے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ لہٰذا رہبانیت (جو آگے چل کر خانقاہیت اور تصوف کے نام سے منصۂ شہود پر آئی)، انسان کی غلط نگہی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ تو تھا انسان کی انفرادی زندگی کے متعلق۔ اس کی اجتماعی زندگی میں یہی "دبانے" کا عمل، استبداد و ملوکیت کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ استیلاء پسند انسانوں نے جب دیکھا کہ فلاں فلاں قوتیں ان کے مفاد کی راہ میں حائل ہیں، تو انہوں نے ان قوتوں کو دبانے اور دبا کر فنا کر دینے کی تدابیر سوچنی شروع کر دیں۔ (قانونِ خداوندی کے بجائے) انسانی ہاتھوں کا تراشیدہ نظامِ حکمرانی اسی "دباؤ کے عمل" کی منظم شکل ہے۔ نام مختلف ہیں، صورتیں بھی متنوع ہیں۔ لیکن روح ہر جگہ وہی کارفرما ہے۔ اس مقصد کے لئے انسان نے "عہدِ جاہلیت" میں لوہے کے شکنجے وضع کر رکھے تھے۔ اب تہذیب و تمدن کا دور ہے اس لئے آہنی شکنجوں کی جگہ آئینی شکنجوں نے لے لی ہے

مقصد دونوں کا ایک ہی ہے۔ تم نے پڑھا ہوگا سلیم! جب ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کر کے خلیفہ کو گرفتار کرلیا تو یہ مسئلہ پیش ہوا کہ خلیفہ کے ساتھ کیا کیا جائے۔ ہلاکو خاں نے کہا کہ اسے قتل کر دیا جائے لیکن اس کے مشیروں نے اس سے کہا کہ مسلمانوں میں خلیفہ کا مقام بہت بلند ہوتا ہے اور اس کی شخصیت بڑی مقدس۔ ہم نے سنا ہے کہ اگر خلیفہ کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گر جائے تو زمین شق ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس خلیفہ کی خونریزی خطرہ سے خالی نہیں۔ اس پر ہلاکو متردد ہوا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو۔ چنانچہ حل یہ سوچا گیا کہ خلیفہ کو بڑے بڑے نمدوں میں لپیٹ کر کچل دیا جائے تاکہ اس کے مقدس خون کا کوئی قطرہ زمین پر گرنے نہ پائے۔ انسان کے دورِ جاہلیت اور زمانۂ تہذیب میں، سلیم! بس اتنا ہی فرق ہے۔ "دباؤ" کے استبدادی شکنجے اب بھی وہی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اب کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جسے کچلا جائے اُس کے خون کے قطرے ٹپکتے دکھائی نہ دیں۔

قرآن نے آکر کہا کہ یہ "دبانے کا عمل" یکسر غلط ہے۔ نہ رہبانیت کا دباؤ درست ہے نہ ملوکیت کا۔ **قد خاب من دسّٰها** جس نے انسانی قوتوں کو دبایا وہ تباہ ہو گیا۔ اسے یہ قوتیں دبانے اور کچلے جانے کے لئے نہیں دی گئیں۔ انسان یوں ہی اتفاقی طور پر وجود میں نہیں آگیا کہ اس میں کارآمد اشیاء کے ساتھ ساتھ کچھ مضر عناصر بھی رہ گئے ہوں جنہیں تباہ کرنا ضروری ہے۔ اس کی تخلیق، خدا کے قانونِ تخلیق کے مطابق عمل میں آئی ہے اور خدا کا قانون ایسا ناقص نہیں کہ وہ مفید کے ساتھ مضر اور خیر کے ساتھ شر کو بھی لگا رہنے دے۔ اور اس کے بعد اس کی ایسی صفائی (تزکیہ) کی ضرورت پڑے کہ مضر کو مفید اور شر کو خیر سے الگ کر دیا جائے۔ تزکیۂ نفس کا یہ تصور تمہارا خود تراشیدہ اور رہبانیت کا پیدا کردہ ہے۔ تزکیۂ نفس کے معنی انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہے **وقد افلح من زکّٰها** اسی کی کھیتی پروان چڑھتی ہے جو ان قوتوں کو کامل نشوونما دیتا ہے۔ فساد اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تم ان کا تناسب بگاڑ دیتے ہو۔ معاشرہ (Society) کے مختلف افراد کی صلاحیتوں میں صحیح صحیح توازن (Balance) قائم رکھنا ہی معاشرہ کا حسن ہے۔ قیام تناسب کا نام احسان ہے (یعنی حسن قائم کرنا) افراد کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کا رخ اس طرف پھیر دینا جہاں ان صلاحیتوں کی کمی ہے۔ اور اس طرح معاشرہ میں ہمواری پیدا کر دینا۔ اسلامی معاشرہ

میں مرکز امت اسی قسم کی ہمواریاں پیدا کرتا ہے اور اس طرح تمام افراد معاشرہ کی مضمر قوتوں کی ربوبیت کا سامان پیدا کرتا ہے اور اس طرح تمام افراد معاشرہ کی مضمر قوتوں کی ربوبیت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ نہ بڑھی ہوئی قوتیں بیجا مصرف سے موجب تخریب بنتی ہیں، نہ پیچھے رہ جانے والے اعضا سامانِ ربوبیت کی کمی سے مرجھا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ کیا ہوتا ہے، یوں سمجھو کہ ایک (Blood Bank) ہوتا ہے، جو ان افراد سے خون لیکر جہاں اس کی زیادتی سے رگیں پھٹ جانے کا احتمال ہو، ان جسموں میں داخل کر دیتا ہے۔ جو کمی خون کی وجہ سے کمزور ہو رہے ہوں۔ اس سے اول الذکر افراد کے مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے اور ثانی الذکر میں احسان (یعنی کمی کو پورا کر کے تناسب کا قیام) اس طرح سے معاشرہ کی تشکیل عدل و احسان کی رو سے قائم ہو جاتی ہے۔ ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان

⁂

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(i) انسان کو کیسے معلوم ہو کہ اس کے اندر کون کون سی قوتیں مضمر ہیں جن کا تزکیہ (نشوونما) ضروری ہے۔

(ii) ان قوتوں میں تناسب کس طرح قائم رکھا جائے۔

(iii) اور یہ کیسے معلوم ہو کہ کس موقعہ پر کس قوت کا مظاہرہ ضروری ہے۔

شق (i) کیلئے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے کوئی خارجی معیار (Objective Standard) ہو جس سے وہ ان قوتوں کا اندازہ کرتا جائے۔ وہ معیار، قرآن کی رو سے، ذاتِ خداوندی (اللہ) ہے۔ اللہ کی جو صفات قرآن میں مذکور ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک کو صفاتِ ذاتی (Personal Attributes) کہیے اور دوسری کو صفاتِ اخلاقی (Ethical Attributes) مثلاً ھو الاول میں صفتِ اولیت پہلی قسم کی ہے یہ صفات بہت تھوڑی سی ہیں۔ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ اللہ کے رنگ میں رنگے جاؤ اور اللہ کے رنگ سے زیادہ متناسب اور متوازن رنگ ور

دینا ہوگا۔ یہ وہ تمام قوتیں ہیں جو انسان کے اندر مضمر ہیں اور جن کی نشوونما بدرجۂ اتم (Maximum Development) اس کی زندگی کا مقصود۔ یہ ہے وہ خارجی معیار جس کے مطابق یہ دیکھنا چاہیئے کہ انسان کے اندر کن کن صفات (قوتوں) کی نشوونما کا امکان ہے اور ان کی نشوونما کس حد تک ہو رہی ہے۔ اللہ اس آئیڈیل کا نام ہے۔ جس میں یہ تمام صفات اپنے انتہائی نقطہ تک تکمیل یافتہ ہیں اور ایک ایسے تناسب، توازن سے ہوئی ہیں جس سے بہتر تناسب تصور میں بھی نہیں آسکتا۔ لہ الاسماء الحسنیٰ۔ باقی رہا یہ کہ انسان اپنی ذات اور اپنے معاشرہ میں ان قوتوں میں تناسب کس طرح قائم رکھے، سو اس کا ذریعہ قرآنی اوامر و نواہی ہیں۔ یعنی کس حد تک بڑھا جائے اور کہاں پہنچ کر رکا جائے ان ہی کا نام حدود اللہ ہے۔ اسی کو قرآنی نظامِ حیات کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آئے گا کہ کسی مقام پر کونسی صفت (قوت) روبعمل آنی چاہیئے۔ سو اس کے لئے قرآن کے ان مقامات پر غور کرنا ضروری ہے، جن میں امم سابقہ اور انبیائے گزشتہ کے احوال و کوائف مذکور ہیں۔ ان سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ کس موقعہ پر خدا کی کونسی صفت ظہور میں آتی ہے۔ اسی سے یہ متعین کرنا ہوگا کہ کون سے مقام پر ہماری کس قسم کی قوت کو روبکار آنا چاہیئے۔ جب کسی معاشرہ کا انداز اس کے مطابق ہو جائے تو اس وقت کہا جائے گا کہ اس معاشرہ کی تشکیل فطرت اللہ (خدا کے تخلیقی قانون) کے مطابق ہے۔ یہی وہ معاشرہ ہوگا جس میں ہر فرد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہوگی اور انہیں ٹھیک ٹھیک مقام پر، صحیح اندازہ کے مطابق صرف میں لایا جائے گا۔ جب انسانی معاشرہ ان خطوط پر متشکل ہوگا تو اس کا فطری نتیجہ (یعنی قانونِ تخلیق کے مطابق نتیجہ) یہ ہوگا کہ واشرقت الارض بنور ربھا (زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے گی) اور یہی وہ نور ہوگا جس کی روشنی میں انسانیت اپنے بلند مقامات کی طرف رواں دواں چل پڑے گی ویسعیٰ نورھم بین ایدیھم وبایمانھم۔

لہٰذا سلیم! سب سے پہلے اللہ کے اسماء حسنیٰ کا قرآنی مفہوم سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کہ قرآنی تعلیم کی بنیاد یہی ہے۔ اسی لئے قرآن نے "اللہ پر ایمان" لانے پر اس قدر زور دیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانا درحقیقت اپنے آپ کا صحیح صحیح اندازہ لگانا اور اپنی منزلِ مقصود کو پہچاننا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھو تو اسماء حسنیٰ بحدودِ بشریت کے اندر

انسان کی اپنی صفاتِ حسنہ (مضمر جوہروں کے متناسب امتزاج) کا بیان نظر آئیں گے۔ اسی لئے حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ

محمدؐ بھی ترا۔ جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا

اگر کبھی فرصت مل گئی سلیم! تو تمہیں کم از کم اسمارِ حسنیٰ کا قرآنی مفہوم تو سمجھا چھوڑوں گا۔[1]

شاید کہ خود را باز آفرینی!

امید ہے سلیم! ان تصریحات سے فطرت اللہ کے متعلق اور گوشے بھی نکھر کر تمہارے سامنے آ گئے ہوں گے اور اب اس عنوان پر تمہیں کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہ رہی ہوگی۔

والسلام
اگست ۱۹۵۱ء

---

[1] خدا کے تصور کے متعلق تفصیلی خط آگے آتا ہے۔

سلیم کے نام انیسواں خط

(انسان کو اخلاقی ضوابط کا پابند کسطرح بنایا جا سکتا ہے؟)

تم نے بالکل سچ کہا سلیم! کہ اخلاق و دیانت کے سب وعظ اسی وقت تک ہیں جب تک انسان کو بددیانتی کا موقعہ نہیں ملتا۔ آج جو شخص بددیانتی اور رشوت ستانی کا سب سے بڑا مخالف اور ناقد ہے، اختیارات ہاتھ میں آجانے کے بعد وہ بھی انہیں جیسا ہو جاتا ہے جن پر وہ اس قدر شدید نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ پرانی کہاوت میں اسے عصمت بی بی از بیچارگی" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

تم نے سلیم! بات تو چھوٹی سی اور بظاہر پیش پا افتادہ کہی۔ لیکن اس کے نتائج و عواقب پر غور کرو تو وہ بہت دوررس ہیں۔ ساری دنیا کے انسانوں پر غور کرو۔ کوئی قوم، حتیٰ کہ کوئی فرد ایسا نہ ملے گا جو یہ کہتا ہو کہ جھوٹ بولنا اچھا ہے۔ چوری ضرور کرنی چاہیئے۔ لوگوں پر ظلم کرنا، دوسروں کا حق دبا لینا، غریبوں کو ستانا نہایت مستحسن کام ہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں کہے گا۔ لیکن اس کے باوجود دنیا میں ہر جگہ ہوتا یہی دکھائی دے گا۔ دنیا کی تاریخ پر غور کرو ساری تاریخ اسی تضادِ قول و عمل سے بھری پڑی ہے۔ انسان نے ہمیشہ اخلاقی ضوابط کی تعریف کی ہے۔ لیکن عمل اس کے خلاف کیا ہے[1] یہی کچھ شروع سے ہوتا چلا آیا ہے۔ یہی آج ہو رہا ہے۔ اخلاقیات کے لئے کسی وعظ کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ جس بات کو ہر شخص از خود مان رہا ہے جسے وہ بلا دلیل و براہین صحیح تسلیم کر رہا ہے، اس کے لئے

---

[1] یہ انسان کی عمومی حالت کا ذکر ہے مستثنیات کا نہیں۔

اسے وعظ ونصیحت کی کیا ضرورت ہے؟ تم کسی سے کہو کہ سچ بولنا بہت اچھا ہے۔ وہ بلا تامل کہہ دے گا۔ بے شک؟ لیکن جب اسے ضرورت پڑے گی، بلاتوقف جھوٹ بول دے گا۔ تاریخ اس پر شاہد ہے۔ اور ہمارا تجربہ اس پر گواہ کہ تنہا اخلاقی ضوابط (Ethical Codes) انسان میں کوئی اصلاح نہیں پیدا کر سکے نہ پہلے کر سکے تھے، نہ آج کر رہے ہیں۔ انسان نے ہمیشہ اخلاقی ضوابط کو سراہا ہے اور ہمیشہ ان کے خلاف عمل کیا ہے۔ تمہارے اخلاقیین (Moralists) کی کوئی مقدس آرزو اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتی۔ سقراط (Socrates) کا خیال تھا کہ انسان برائی اس لئے کرتا ہے کہ اسے علم نہیں ہوتا کہ وہ برائی ہے۔ نیکی اور برائی میں تمیز ہو جانے کے بعد کوئی شخص برائی کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ انسان کی تاریخ، سقراط کے اس حسن ظن کو کس قدر جھٹلا رہی ہے؟ کسے معلوم نہیں کہ جھوٹ برا ہے اور سچ اچھا۔ لیکن اس تمیز کے بعد کتنے ہیں جو جھوٹ سے اجتناب کرتے ہیں اور سچ کا التزام۔

میں یہ لکھ رہا ہوں اور تمہارے تبسم زیر لبی کو بھی کنکھیوں سے بھی دیکھتا جا رہا ہوں جو تمہارے ان خیالات کی غمازی کر رہا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ "انسان کی فطرت" ہی بد واقع ہوئی ہے! میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ "انسانی فطرت" کا تصور ہی غلط ہے۔ انسان کی کوئی فطرت نہیں۔ نہ نیک نہ بد۔ خامۂ قدرت نے اس کی لوح جبیں کو بالکل خالی رکھا ہے کہ وہ خود اپنے قلم سے جو کچھ چاہے اس پر لکھ لے۔ لہٰذا، مذکورۂ صدر حقائق وشواہد سے اس نتیجہ پر پہنچ جانا کہ انسانی فطرت ہی بد واقع ہوئی ہے، ایسی عمارت کی تعمیر ہے جس کی بنیاد ہی نہ ہو۔ اس قسم کے اعلانات (Verdicts) درحقیقت اخلاقیین کے اعتراف شکست کے مرادف ہیں۔ اس حقیقت کو تو وہ چھپا نہیں سکتے کہ ان کے اخلاقی مواعظ انسانی اصلاح میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اب بجائے اس کے کہ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ اس معاملے میں ان کی اپنی غلطی کہاں ہے، وہ اپنی شکست پندار کو اس فریب میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی بد واقع ہوئی ہے۔ اس باب میں سب سے بڑی شکست عیسائیت کو ہوئی۔ عیسائیت (حضرت مسیح کی نہیں بلکہ سینٹ پال کی عیسائیت) کا مدار ہی اخلاقی مواعظ پر تھا۔ اس لئے کہ سینٹ پال

کی عیسائیت کمزوروں اور محکوموں کا مذہب تھی اور منفعلانہ اخلاق[1] کے نام پر اپیلیں کمزور کیا کرتے ہیں۔ جس شخص کے پاس اپنی حفاظت کا سامان موجود ہے اور مدافعت کی قوت حاصل، وہ چور اور ڈاکو سے رحم کی درخواست نہیں کرتا وہ ان کے حملے کا جواب بندوق کی گولی سے دیتا ہے۔ جس کے پاس مدافعت کا سامان اور غلبے کی قوت نہیں ہوتی وہ دوسروں سے ڈرتا ہے اور اُن کے رقیق جذبات سے اپیلیں کر کے رحم کی درخواستیں کرتا ہے۔ عیسائیت میں اس کا نام رہبانیت کی زندگی ہے (رہب کے معنی ہی خوف کے ہیں)، اس طرح ڈر ڈر کر زندگی بسر کرنے کا مسلک حضرت مسیحؑ کی تعلیم نہیں تھی۔ یہ سینٹ پال کی بہت بڑی سازش کا نتیجہ تھا۔ تمہیں معلوم ہی ہے سلیم! سینٹ پال یہودی تھا عیسائیوں کا سخت مخالف اور ایذا رساں۔ جب حضرت عیسیٰؑ کی یہ انقلابی جماعت اس کی سختیوں سے نہ دبی تو یہ عیسائی ہو گیا اور اس کے بعد اس نے حضرت عیسیٰؑ کے انقلاب آفریں نظام زندگی (دین) کو رہبانیت میں بدل کر اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کیا۔ (یہی وہ حربہ تھا جو اسلام کے خلاف یہودیوں اور عجمیوں نے استعمال کیا تھا۔) جب اس طرح دین کی انقلاب سامانی رہبانیت کی پند آفرینی میں بدل گئی تو شر کی قوتیں بدلگام ہو گئیں۔ اب ان مبلغین اخلاقیات نے دوسروں کو (اور شاید اپنے آپ کو بھی) یہ کہہ کر دھوکا دے لیا کہ انسان کی فطرت ہی بد واقع ہوئی ہے جو اس پر اخلاقی مواعظ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ہر انسانی بچہ اپنی پیدائش سے اپنے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کو ساتھ لاتا ہے۔ عیسائیت کی طرح، یہی حالت ہندوؤں کے ضابطۂ اخلاق کے ساتھ ہوئی۔ انہوں نے انفرادی طور پر تو یہ کہدیا کہ ہر انسان اپنے موجودہ جنم میں، اپنے سابقہ جنم کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے یعنی وہ گناہوں کی کثافت اور آلائش کو اپنی پیدائش کے ساتھ ہی لاتا ہے۔ اس میں بھی عیسائیت کے اس عقیدے کی جھلک صاف نظر آتی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اور اجتماعی طور پر انہوں نے انسانی تاریخ کو مختلف زمانوں (جگوں)

---

[1] محکومیت اور مغلوبیت ہمیشہ منفعلانہ اخلاق کی تعلیم دیتی ہے۔ دشمن سے بھی پیار کرو۔ چور اگر تمہارا کوٹ اتار لے تو صدری اتار کر خود دیدو۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دو۔ شر کا مقابلہ مت کرو۔ خدا کی بادشاہت کمزوروں اور ناداروں کے لئے ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں تقسیم کر دیا۔ گذشتہ زمانہ ست جگ (سچائی کا دور) قرار پا گیا (کیونکہ وہ گزر چکا تھا) اور موجودہ زمانہ کل جگ (جھوٹ کا دور)۔ بات وہی ہے۔ یعنی اپنے آپ کو ملزم ٹھہرانے کے بجائے انسانی فطرت یا زمانے کے چکر کو ملزم قرار دیدیا جائے۔ یہی کچھ مجوسیت میں ہوا۔ انہوں نے دنیا میں خیر و شر کو دو مستقل قوتیں قرار دیدیا اور اس کے بعد اپنے آپ کو یہ فریب دے لیا کہ شر کی قوتوں پر پند و نصائح کا اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ شر مستقل طور پر اپنا وجود رکھتا ہے جسے معدوم نہیں کیا جاسکتا۔ بدھ مت والے اور آگے بڑھے تو (عیسائیت کی رہبانیت کی طرح) کہہ دیا کہ یہ دنیا جیل خانہ ہے۔ نجات اس میں ہے کہ انسان اسے چھوڑ کر بھاگ جائے۔ مادہ خالص شر ہے۔

آج سلیم! ساری دنیا میں اخلاقی مبلغین کا یہی نقشہ ہے۔ کہیں انسانی فطرت کو بد قرار دیا جاتا ہے کوئی اس زمانہ کو کل جگ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہے۔ کوئی اسے قرب قیامت اور چودھویں صدی سے تعبیر کر کے مطمئن ہو جاتا ہے اور پھر اپنی مایوسیوں کے آسرے اور زندگی کے سہارے ڈھونڈھنے کے لئے اس قسم کی پناہ گاہیں تراشتا ہے کہ اس کے بعد ایک دور آئے گا جس میں آنے والا عالم بالا سے ظہور پذیر ہوگا اور اس کے ہاتھوں شر کا خاتمہ اور اخلاق کی فتح ہوگی۔

انسان شروع سے اسی فریب میں مبتلا چلا آ رہا ہے، اور اسی فریب میں مبتلا چلا جا رہا ہے۔ بالادست قوتوں کی یہ کتنی بڑی سازش تھی کہ انہوں نے زیردست انسانوں کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ تم "نیک بنو برائیوں کو چھوڑ دو" کی مالا جپتے رہو دنیا خود بخود سدھر جائے گی۔

اب تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا سلیم! کہ

(i) جب انسان اپنی فطرت میں بد نہیں تو پھر دنیا میں یہ فساد کیوں ہے؟ اور

(ii) جب اخلاقی مواعظ بیکار ہیں تو پھر اس فساد کی اصلاح کی کیا صورت ہے؟

قرآن ان ہی سوالات کا جواب دیتا ہے، سلیم! یا یوں کہو کہ وہ آیا ہی ان سوالات کا جواب دینے اور ان مشکلات کا حل بتانے کے لئے تھا۔ اسے یاد رکھو کہ قرآن کسی کو فریب میں مبتلا نہیں رکھتا۔ وہ حقائق...

(Realities) سے منہ نہیں موڑتا۔ وہ ان کا کھلے بندوں مقابلہ کرتا ہے (It faces realities) وہ کہتا ہے کہ دنیا میں انسان بستے ہیں اور انسان جیسے کچھ ہیں ہمارے سامنے ہیں۔ وہ انسانی کمزوریوں کو مانتا ہے۔ وہ اس کی جاذبِ نگاہ چیزوں کو ایک ایک کرکے شمار کراتا ہے۔

زین للناس حب الشھوٰت من النساء والبنین والقناطیر المقنطرة من
الذھب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث۔ ذالک متاع الدنیا
واللہ عندہ حسن الماٰب۔ (۳/۱۴)

یعنی انسان کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے لئے ازدواجی زندگی۔ بال بچے۔ چاندی اور سونے کے ذخیرے۔ چُنے ہوئے گھوڑے، مال، مویشی، کھیتی باڑی وغیرہ وجہ خوشنمائی ہیں۔ اس لئے انسان ان کی طرف کھنچتا ہے۔ یہ کوئی بُری بات نہیں۔ لیکن ان چیزوں کو مقصود بالذات نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ یہ انسان کی قریبی زندگی (حیاتِ طبعی) کی نشوونما کے ذرائع ہیں۔ اگر انسان ان ہی کو مقصودِ حیات قرار دے لے تو زندگی میں توازن نہیں رہتا۔ وہ منزلِ مقصود جس میں حسن و توازن ہے قانونِ خداوندی کی رو سے متعین ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ جب اس قسم کی مخلوق (انسانوں) کو باہم مل جل کر رہنا ہو تو اسے کس انداز سے رہنا چاہیئے کہ اس کے معاشرے میں فساد پیدا نہ ہو اور وہ ان تمام اخلاقی ضوابط کا پابند ہو کر رہے جنہیں مبلغینِ اخلاق اس پر مسلط کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کوشش میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ سنو! سلیم! کہ یہ بہت غور سے سننے کی باتیں ہیں۔

یہ تو تم جانتے ہو کہ تحفظِ ذات (Preservation of Self) ہر ذی حیات کا طبعی تقاضا ہے۔ یعنی جہاں بھی زندگی (Life) ہے اس کا تقاضا اپنے آپ کی حفاظت ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لے کر انسان تک۔ ہر نفس میں تحفظِ ذات کا تقاضا موجود ہے۔ یعنی ہر ذی حیات اپنی حفاظت اور بقا کے لئے انتہائی جدوجہد کرتا ہے۔ حیوانات کی سطح تک یہ تقاضا جبلی طور پر (By Instinct) پورا

ہوتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کی دنیا میں جبلت سے آگے عقل بھی ساتھ آجاتی ہے۔ یعنی انسانی زندگی میں تحفظ خویش، عقل کا فریضہ[1] ہے۔ وہ مامور ہی اس لئے ہے کہ وہ اس فرد کا تحفظ کرے جس کی وہ عقل ہے۔ میری عقل، میری حفاظت چاہے گی۔ آپ کی عقل آپ کا تحفظ، یعنی ہر فرد کی عقل اس فرد کی حفاظت چاہے گی۔ اسے کسی دوسرے فرد کی حفاظت سے سروکار نہیں۔ یہ چیز اس کی ذمہ داری سے باہر ہے۔ اس کا نام انفرادی زندگی ہے۔ یعنی ہر فرد کی الگ الگ زندگی۔ یہ ہوئی پہلی بات۔ اب دوسری بات یہ دیکھنی ہے کہ عقل اپنے اس فریضے کی ادائیگی کے لئے کرتی کیا ہے؟ اس نکتے کی وضاحت کے لئے شروع میں ذرا فنی سی بات بیان کرنی ناگزیر ہے۔ اس سے اکتا نہ جانا۔ غور سے سننا، کیونکہ آگے چل کر اسی سے تمہاری بات کا جواب سامنے آجائے گا۔

اس کائنات کو طبیعیاتی دنیا (Pnysical Universe) کہتے ہیں۔ "طبیعاتی" کا مطلب عام فہم الفاظ میں یوں سمجھو کہ جو چیزیں انسان کے دائرۂ حواس (Senses) میں آجائیں انہیں طبیعیاتی (Physical) کہا جاتا ہے۔ انیسویں صدی تک کی سائنس یہیں تک پہنچی تھی۔ اب سائنس کے مزید انکشافات نے یہ بتایا ہے کہ کائنات میں کوئی شئے طبیعیاتی (Physical) ہے ہی نہیں۔ ہر شئے ماوراء الطبیعیاتی (Super-physical) ہے۔ جب کوئی ماوراء الطبیعیاتی عنصر اتنا ہیولیٰ (Mass) اکٹھا کرلے کہ وہ محسوس (Perceptible) ہوجائے تو اسے طبیعیاتی (Physical) کہہ دیتے ہیں۔ اس مفہوم کو اگر میں انگریزی کے ایک فقرے میں لکھ دوں تو تم زیادہ آسانی سے سمجھ جاؤ گے۔

> When super-physical gathers so much mass that it becomes perceptible by our sensory organs, it is called physical.

---

[1] ان صفحات میں عقل کے صرف اس گوشے سے بحث کی گئی ہے جس میں اس کا فریضہ تحفظ ذات ہوتا ہے۔

ہٰذا اس محسوسات کی دنیا میں کسی شے کے وجود (Existence) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہیولیٰ اکٹھا کرے (Gathers mass) اور پھر اسے یکجا (**Integrate**) رکھے۔ انگریزی فقرے میں یوں سمجھو کہ

Physical existence means gathering of mass and keeping it integrate.

عقل انسانی نے یہی دیکھا ہے کہ وجود (Existence) کو قائم رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ جمع (Collecting or gathering mass) فَاَوْعٰی (Withholding or keeping it integrate) جمع کرنا اور پھر اسے سمیٹ کر رکھنا۔ اسے تحفظ ذات کی یہی تدبیر یاد ہے اس لئے وہ ہر وقت اس میں مصروف رہتی ہے۔ قرآنی الفاظ میں جَمَعَ فَاَوْعٰی (۷۰/۱۸) [1]

غور کرو سلیم! جب کسی معاشرے کی صورت یہ ہو جائے کہ اس میں ہر فرد سب کچھ سمیٹنے اور سمیٹ کر اپنی ذات تک محدود رکھنے کی فکر میں سرگرداں ہو تو اس معاشرے میں فساد (ناہمواریوں) کے سوا اور کیا ہو گا! یہ دوسری بات ہو گئی پھر دہرا لو کہ

پہلی بات یہ تھی کہ عقل کا فریضہ یہ ہے کہ وہ فرد متعلقہ کے تحفظ ذات کی فکر کرے۔

اور دوسری بات یہ کہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے عقل نے سیکھا صرف یہ ہے کہ سب کچھ جمع کیا جائے اور اسے اپنی ذات کے لئے سمیٹ کر رکھ لیا جائے۔

اب ایک قدم آگے بڑھو (جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں) تحفظ ذات کا تقاضا حیوانات میں بھی ہے لیکن حیوانات کل (Tomorrow) کا تصور نہیں رکھتے۔ یہ صرف انسان ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ فردا کا تصور بھی

---

[1] من ادبر و تولی و جمع فاوعیٰ۔ ان الانسان خلق ھلوعا (۷۰/۱۸-۲۰)

رکھتا ہے[1]۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عقلِ انسانی، آج کی فکر سے فارغ ہونے کے بعد کل کی فکر شروع کر دیتی ہے، اور چونکہ انسان کو اس کا علم نہیں کہ اس کی موت کب واقع ہوگی اس لئے اس کی "فردا" لامتناہی ہو جاتی ہے۔ یعنی عقلِ انسانی کے نزدیک مستقبل کی فکر کی کوئی حد مقرر نہیں۔ الھٰکم التکاثر حتیٰ زرتم المقابر۔ بڑھاپے میں انسان کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی موت قریب آ رہی ہے۔ اس سے امکان تھا کہ انسانی عقل اپنے مستقبل کی فکر کو مختصر کر دے۔ لیکن یہاں اسے اولاد کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا سلیم! کہ جب ابلیس نے آدم کو یہ کہکر بہکایا تھا کہ آؤ تمہیں بتاؤں کہ حیاتِ خلد (ہمیشہ کی زندگی) کا راز کیا ہے تو اس نے اس کا ذریعہ اولاد ہی بتایا تھا[2]۔ یعنی انسان اپنی موت کے بعد اپنی اولاد کی شکل میں زندہ رہنے کی ہوس رکھتا ہے لہٰذا تحفظ نفس کے بعد، اولاد کے تحفظ کی فکر اس کا دامن پکڑ لیتی ہے۔ اور اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ حیوانات میں نہ کل کا تصور ہوتا ہے اور نہ ہی (کچھ وقت کے بعد) اولاد کی فکر۔ لہٰذا ان کی انفرادی زندگی، ان کی ذات تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن انسان اپنے بعد، اپنی اولاد کے لئے زیادہ سے زیادہ جمع کرنے اور اسے سمیٹ کر رکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور اس طرح جمع فاوعیٰ کا سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔

یہ تیسری بات ہو گئی۔ یعنی

(۱) تحفظِ ذات عقل کا تقاضا ہے

(۲) عقل نے تحفظِ ذات کے لئے سیکھا ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ جمع کیا جائے اور اسے سمیٹ کر رکھا جائے۔

(۳) اور یہ سلسلہ ایک فرد کی اپنی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی فکر کے بعد اپنی اولاد کی فکر

---

[1] ذات (Personality or Self) کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حافظہ کی رو سے ماضی سے وابستہ ہوتی ہے اور مقصد (Purpose) کی رو سے مستقبل سے بندھی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں نہ رہیں تو انسان حیوان کے درجہ پر جا پہنچتا ہے۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن جلد دوم، "عنوان" آدم" جس میں قرآنی قصۂ آدم کا مفہوم واضح کیا گیا ہے۔

میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔ اب سوچو سلیم! جب عقل انسانی کا فریضہ ہی یہ ہو کہ وہ سب کچھ فردِ متعلقہ کے لئے جمع کرے اور اسے سمیٹ کر رکھے تو وہ کسی کے کہنے پر اپنے اس فریضے کو چھوڑ کس طرح سکتی ہے؟ یہ وجہ ہے کہ ہر فرد اخلاقی ضوابط کا اقرار کرنے کے باوجود موقع ملنے پر اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کر، وہی کچھ کرنے لگ جاتا ہے جو دیگر افراد کر رہے ہوتے ہیں۔ عقل کا تقاضا ہی یہی ہے کہ وہ یہ کچھ کرے۔ اخلاقی اصولوں کا اقرار، اس تقاضے کو روک نہیں سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ خالی اخلاقی مواعظ، انسان کو ضابطۂ اخلاق کا پابند بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اسے سن رکھو سلیم! کہ کوئی شخص تنہا عقل کی رو سے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ اسے غریب کی مدد کیوں کرنی چاہیئے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، دوسرے کی مدد کرنا عقل کے احاطے سے باہر کی چیز ہے۔ باہر ہی کی نہیں، بلکہ یہ چیز اس کے تقاضے کے خلاف اور اس کے فریضے کی نقیض ہے۔ عقل، صرف اسی فرد کے مفاد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ اسے دوسرے افراد کے مفاد کے تحفظ سے کچھ واسطہ نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے الفاظ میں؛ انفرادی عقل ہمیشہ "خود بیں" ہوتی ہے "جہاں بیں" نہیں ہو سکتی۔ عقل کی دلیل صرف اپنے فائدے تک محدود ہوتی ہے۔ تمہیں یاد ہے سلیم! جب تم نے ارشد سے کہا تھا کہ تم نے جھوٹ کیوں بولا؟ تو اس نے کیا جواب دیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ "مجھے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ تھا۔" یہ جواب ارشد ہی کا نہیں۔ تم صبح سے شام تک لوگوں کو یہی کہتے سنو گے "میں کیوں جھوٹ بولوں؟ مجھے جھوٹ بولنے سے کیا حاصل ہو گا؟" "مجھے کیا ضرورت تھی جو میں جھوٹ بولتا؟" "میں غلط بیانی کیوں کرتا۔ اس سے مجھے کیا مل جاتا؟"[1] یہاں تک کہ اگر تم عدالت میں یہ کہو کہ فلاں شخص نے جھوٹ بولا ہے، تو اس کے بعد تمہیں یہ بھی بتانا پڑتا ہے کہ جھوٹ بولنے سے اس کا فائدہ کیا تھا۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ عقل کے پاس "کیوں" کا کیا جواب ہے!

---

[1] غور کیجیے۔ ہم کس بے تکلفی سے کہہ دیتے ہیں کہ میں جھوٹ کیوں بولوں۔ میرا اس میں کیا فائدہ ہے؟ یعنی یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اگر جھوٹ بولنے میں میرا فائدہ ہو تو میں بے شک جھوٹ بول دوں گا۔ یعنی ہم میں سے ہر شخص اعلان کرتا ہے کہ وہ اس وقت تک ہی سچا ہے جب تک اسے جھوٹ بولنے میں فائدہ نظر نہیں آتا۔ کتنا بڑا جرم ہے جس کا اقرار ہم غیر شعوری طور پر اس بے تکلفی سے کرتے رہتے ہیں۔

صرف یہ جواب کہ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوگا۔ لہٰذا عقل کسی ایسی بات کو اختیار ہی نہیں کر سکتی جس میں اسے اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔ اگر سچ بولنے میں فائدہ ہے تو عقل سچ بولنے پر آمادہ کرے گی۔ اگر اسے جھوٹ بولنے میں فائدہ نظر آتا ہو تو وہ جھوٹ بولنے پر اُکسائے گی۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ کوئی شخص تنہا عقل کی رو سے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ غریب کی مدد کیوں کرنی چاہیئے۔ عقل زیادہ سے زیادہ یہ جواب دے گی کہ غریب کی مدد اس لئے کرنی چاہیئے کہ اگر (خدا نکردہ) کل کو میں خود غریب ہو گیا تو دوسرے میری مدد کریں گے۔ دیکھ لو! اس میں بھی وہی بات پوشیدہ ہے۔ یعنی اپنا فائدہ۔ عقل سے کہو کہ اپنے فائدے کو الگ کر کے بتلائے کہ غریب کی مدد کیوں کرنی چاہیئے؟ سچ کیوں بولنا چاہیئے؟ عقل اس کا کوئی جواب نہیں دے سکے گی۔ عقل کے فیصلوں کا معیار صرف اپنا فائدہ اور نقصان ہوتا ہے۔ وہ سود و زیاں کے چکر سے نکل ہی نہیں سکتی۔

لیکن اس سے سلیم! یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ چیز عقل کے خلاف بطور جرم عاید کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ چیز عقل کا عین فریضہ ہے۔ وہ یہ سب کچھ اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کرتی ہے۔ اب اس سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ جس معاشرے کا کاروبار تنہا عقل کے سپرد کر دیا جائے اس میں انسان کی حالت کیا ہوگی؟ یہی جو آج ہو رہی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس خرابی کا علاج کیا ہے؟ عقل کا تقاضا انفرادی مفاد کا تحفظ ہے اور اس سے معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ عقل کو چھوڑتے ہیں تو پاگل کہلاتے ہیں، بلکہ یوں کہئے کہ اپنے مفاد کی حفاظت کرنے والی عقل کو چھوڑنا انسان کے بس کی بات ہی نہیں۔ لہذا کیا جائے تو کیا کیا جائے؟

تم نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ تمہارے ہاں سرکاری ہسپتال کا کمپونڈر، خلیق احمد، بڑا عمدہ آدمی تھا، دن بھر مریض آتے رہتے۔ وہ انہیں قیمتی سے قیمتی دوائیاں (نسخوں کے مطابق تیار کر کے) نہایت خندہ پیشانی سے مفت دیتا رہتا تھا، اس میں امیر و غریب، ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ وہ دوائی دینے سے پہلے کبھی نہیں پوچھتا تھا کہ مریض کی جیب میں پیسے بھی ہیں یا نہیں؟ نسخہ تیار کرتے وقت کبھی نہیں سوچتا تھا کہ اس میں ایسی قیمتی دوائی

کیوں ڈالی جائے؟

اس کے بعد میں نے سنا کہ اسی خلیق احمد نے ملازمت چھوڑ کر چوک میں اپنی دوکان کر لی اور اب یہ عالم ہے کہ مریض درد سے کراہ رہا ہے لیکن اس کی نگاہ اس کی جیب پر ہوتی ہے کہ اس میں دوائی کی قیمت دینے کے لئے کچھ ہے بھی یا نہیں۔ وہی خلیق جو پہلے امیر اور غریب میں کوئی تمیز نہیں کرتا تھا اور سب کو ایک جیسی دوائی دیتا تھا، اب مریض کی جیب کے مطابق دوائی دیتا ہے۔ اب اس میں وہ خوبیاں نہیں رہیں جو پہلے تھیں۔ بلکہ سنا ہے کہ نسخوں میں قیمتی دوائیاں ڈالتا ہی نہیں۔

تم نے سوچا سلیم! کہ خلیق احمد میں اتنا بڑا فرق کیوں آگیا؟ اب اس کی خوبیاں کہاں چلی گئیں۔ بات ادنیٰ تعمق سمجھ میں آجائے گی۔ جب وہ سرکاری ہسپتال میں تھا تو اس کے رزق کی ذمہ داری ہسپتال نے لے رکھی تھی۔ اس لئے وہ دن بھر بڑی خندہ پیشانی سے دوائیاں بانٹتا رہتا تھا۔ لیکن اب اسے اپنے اور اپنی اولاد کے تحفظ ذات کی فکر خود کرنی پڑتی ہے۔ اب اسے اپنا رزق ان ہی دوائیوں سے پیدا کرنا ہے۔ اس لئے اب وہی خلیق، چوک کے دکانداروں میں سے ایک دکاندار بن گیا دکاندار!

تم نے دیکھا سلیم! کہ اگر انسان کے تحفظ ذات کے اسباب و ذرائع کے فراہم کرنے کی ذمہ داری کوئی اور لے لے تو پھر انسان میں ذاتی مفاد پرستی کی جگہ دوسروں کے مفاد کا خیال نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ایسے لوگ بھی تو ہیں کہ خلیق کی طرح اُن کی تنخواہیں بھی مقرر ہیں لیکن وہ اس کے باوجود ناجائز طریقے سے روپیہ بٹورنے سے باز نہیں آتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ (خواہ شعوری طور پر انہیں اس کا علم ہو یا نہ ہو) ایسے لوگوں کو یقین نہیں ہوتا کہ ان کی تنخواہ، ان کی عقل کے تقاضے کے مطابق، ان کی تمام عمر اور ان کی اولاد کے کامل تحفظ ذات کے لئے کفایت کر سکتی ہے۔ اس لئے وہ زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتے ہیں۔ اگر انہیں یقین ہو جائے کہ انکی اپنی اور اُن کے متعلقین کی ذات کی حفاظت کی پوری پوری ذمہ داری کسی اور نے لے رکھی ہے تو اس کے بعد انہیں ناجائز طریقے سے کچھ حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی رمیں جانتا ہوں کہ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے

پاس اتنا کچھ ہے کہ وہ ان کی اور ان کی اولاد کی ذات کے تحفظ کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کی ہوس زراندوزی کی تسکین نہیں ہوتی۔ سو اوّل تو اس قسم کی ذہنیتیں (Abnormal) ہوتی ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھنے کا جذبہ انہیں چین نہیں لینے دیتا۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی ہوس، غیر شعوری طور پر ہمارے معاشرتی اور معاشی نظام کا نتیجہ ہے جس میں کسی انسان کو کسی وقت بھی اپنے مستقبل کے متعلق پورا پورا اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہی عدم اطمینان اور فقدان یقین ہے جس کی وجہ سے انسان اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔

لہٰذا، دو باتیں ہمارے سامنے آ گئیں۔

ایک تو یہ کہ ہر فرد معاشرہ کی اپنی اور اس کے متعلقین کی ذات کی حفاظت کے لئے سامان و ذرائع (یعنی بنیادی ضروریات زندگی) کی ذمہ داری کسی اور پر ہونی چاہیئے۔ اور

دوسرے یہ کہ اس ذمہ داری کے متعلق افراد معاشرہ کو پورا پورا یقین ہونا چاہیئے کہ اس میں کبھی کوتاہی نہیں ہو گی۔ یہ سہارا کبھی دغا نہیں دے گا۔ لَا انفِصَامَ لَهَا (یہ رسّی کبھی ٹوٹے گی نہیں)

اب یہ بات واضح ہے سلیم! کہ اگر کہیں ایسا معاشرہ قائم ہو جائے تو اس میں عقل کا وہ تقاضا خود بخود پورا ہو جائے گا۔ جس کی خاطر وہ انفرادی مفاد کے تحفظ کے لئے اس طرح سرگرداں و حیراں پھر رہی تھی اور اس مفاد کے حصول کے لئے جائز و ناجائز، سب کچھ کر رہی تھی۔ جب عقل اس طرح مطمئن ہو جائے تو انسانی معاشرے کی بیشتر خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔

قرآن اس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جسے وہ الصلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اسی نظام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر[1] (نظام صلوٰۃ فحشاء و منکر سے

---

[1] اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے۔ جب پوچھا جاتا ہے کہ لوگ نماز تو پڑھتے ہیں لیکن اس کے باوجود برائیوں اور بے حیائیوں سے نہیں رکتے، تو جواب میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ سچے دل سے نماز نہیں پڑھتے لیکن ان نمازیوں سے پوچھئے تو وہ مسجد میں کھڑے ہو کر گواہی دیتے ہیں کہ ہم سچے دل سے نماز پڑھتے ہیں!

روکتی ہے) ان دو الفاظ پر غور کرو سلیم! فحش کے عام معنی تو حد سے تجاوز کرنا ہے۔ لیکن اس کے ایک معنی، "بہت زیادہ بخل" کے بھی ہیں۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے

الشیطٰن یعدکم الفقر و یأمرکم بالفحشاء (٢/٢٦٨)

شیطان تمہارے دل میں تنگدستی کا خوف پیدا کر کے تمہیں بخل کی تعلیم دیتا ہے۔

یہاں فحشار کے معنی بخل ہیں، یعنی دولت جمع کر کے اپنی ذات تک سمیٹ رکھنا۔

دوسرا لفظ منکر ہے جس کا مادہ نکر ہے۔ اس کے اہم معانی عقلِ فریب کار (Intelligence mixed with cunningness) کے ہیں۔ تنھٰی کے معنی روکنا ہیں۔ نھیۃ عقل کو کہتے ہیں۔ یعنی خود بھی ایک مقام پر پہنچ کر رُک جانے والی اور دوسروں کو بھی روک دینے والی۔

لہٰذا الصلوٰۃ وہ نظام معاشرہ ہے جس میں افرادِ معاشرہ، دولت کو سمیٹ کر اپنی ذات تک محدود رکھنے (بخل) اور عقلِ فریب کار کی تحریک پر دوسروں کو دھوکا دینے اور ان سے غیروں کا سا سلوک کرنے (منکر) سے رک جائیں۔ اور یہ رکنا عقل و بصیرت کے خلاف نہ ہو۔ بلکہ خود عقل کا تقاضا ہی یہ ہو جائے۔ یعنی عقل مطمئن ہو جائے کہ اس رُک جانے میں اس کا (تحفظ ذات کا) فریضہ پورا ہو رہا ہے۔ ان الصلوٰۃ تنھٰی عن الفحشاء والمنکر

لیکن یہ حصہ قرآنی نظام کا ایک گوشہ ہے۔ اس میں افرادِ معاشرہ ان تمام امور سے رک جاتے ہیں جن سے انفرادیت کی انسانیت کش ناہمواریاں وجود میں آتی ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ اٰتو الزکوٰۃ ہے 'اقیموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ' جس کے معنی افرادِ معاشرہ کے نشوونما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کے ہیں۔ یہ دونوں مل کر قرآنی نظام کا دائرہ مکمل کر دیتے ہیں۔ وہ نظام جس میں ہر فردِ معاشرہ عقل خود بیں کی نفسا نفسی سے رک کر، دوسرے افراد کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے اسباب و ذرائع فراہم کرنے میں مصروف ہو جاتا ہے اس میں عقل مطمئن ہو جاتی ہے کہ اس کے تقاضے بطریق احسن پورے ہو رہے ہیں، اس لئے اسے ناہمواریاں پیدا کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

تم نے سلیم! بی اے میں اکونامکس تو پڑھی تھی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اکونامکس (معاشیات) کی رو سے

اشیائے استعمال کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک "بلا معاوضہ اشیا" (Free goods) اور دوسرے "بامعاوضہ اشیاء" (Economic Goods) فری گڈس وہ ہیں جو ہر فرد معاشرہ کے لئے بلا معاوضہ یکساں طور پر کھلے ہیں۔ مثلاً ہوا، سورج کی روشنی، پانی کے چشمے وغیرہ۔ اکونامک گڈس وہ ہیں جنہیں انسان خرید کر استعمال کرتا ہے۔ حیوانات کی دنیا میں اکونامک گڈس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ سب فری گڈس ہوتے ہیں۔ یہ لعنت انسان کی دنیا پر ہی مسلط ہے کہ اس میں اشیاء خورد و نوش اکونامک گڈس میں شامل ہیں۔ قرآن جس نظام ربوبیت کا داعی ہے اس میں ضروریات زندگی کا شمار فری گڈس میں ہوتا ہے۔ قرآن نے جو نقشہ جنت کا کھینچا ہے، قرآنی معاشرہ اس کا عکس ہوتا ہے۔ ابلیس (عقل بے باک) کے فریب میں آنے سے پہلے، آدم جس جنت میں تھا اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا گیا ہے کہ وہاں آدم سے کہہ دیا گیا تھا کہ وکلا رغداً حیث شئتما۔ تم جہاں سے جی چاہے سیر ہو کر کھاؤ پیو۔ اس میں اشیائے خورد و نوش پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ سب فری گڈس میں شامل ہیں۔ صرف اشیائے خورد و نوش ہی نہیں بلکہ تمام بنیادی ضروریات زندگی (لباس۔ خوراک۔ مکان) تمام افراد معاشرہ کے لئے میسر ہوں گی جنت آدم کے متعلق دوسری جگہ ہے کہ ان لک الا تجوع فیھا ولا تعریٰ۔ وانک لا تظمؤ فیھا ولا تضحیٰ (۲۰/۱۱۸) "تیرے لئے اس میں وہ سب کچھ میسر ہے جس سے تو نہ بھوکا رہے نہ ننگا۔ نہ پیاسا رہے نہ دھوپ میں۔" لیکن اگر تو اس سے نکل گیا تو تجھے ان چیزوں کے حصول کے لئے بڑی پریشانی اٹھانی پڑے گی (فتشقیٰ)

احتیاطاً یہاں اس چیز کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اس معاشرے میں یہ چیزیں مفت نہیں مل جائیں گی جنت اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس میں مفت خوروں (مترفین) کا کوئی کام نہیں۔ مترفین صرف اس معاشرہ میں زندہ رہ سکتے ہیں جس میں معاشرتی ناہمواریاں ہوں۔ اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خون پر پرورش پائے۔ "جنت" (قرآنی معاشرے) میں سعی و عمل ہر شخص کے لئے ہوگا لیس للانسان الا ما سعیٰ وہاں کا اٹل قانون ہے وہاں ہر فرد کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام دیا جائے گا۔ لیکن کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہے گا۔ وہ بھی محروم نہیں رہیں گے جو کسی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہیں۔ اس نظام کے نتائج اس قدر یقینی اور محکم ہوں گے

کہ اس باب میں اضطراب وتذبذب کی کہیں گنجائش نہیں ہوگی۔ ومن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمساک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لہا" جس نے غیر خداوندی نظامہائے حیات سے منہ موڑ کر، نظام خداوندی کو اپنا نصب العین بنا لیا۔ اس نے ایک محکم آسرے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔" یہ ہے وہ نظام جس میں عقل اپنے فریضے کی طرف سے مطمئن ہو جاتی ہے اور اسے معاشرے میں فساد پیدا کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ طریقہ جس سے انسان اخلاقی ضوابط کا پابند رہ سکتا ہے۔ یعنی ایک متوازن نظام ربوبیت کا قیام جس میں ضروریات زندگی فری گڈس میں شامل ہوں (یہ اس نظام کی ابتدائی خصوصیت ہے۔ آگے بڑھ کر یہ نظام، افراد معاشرہ کی تمام صلاحیتوں کی کامل نشوونما کا ذمہ دار بنتا ہے)

جب ضروریات زندگی فری گڈس میں شامل ہوں یا وہ روپے پیسے سے خریدنے کی بجائے اشیاء کے مبادلے (Barter System) سے حاصل ہو جائیں تو اس وقت معاشرے کا کیا نقشہ ہوتا ہے اس کا ہلکا سا تصور ہماری گاؤں کی زندگی سے ہو سکتا تھا۔ آج کے گاؤں کی زندگی سے نہیں جو اس باب میں اب شہروں سے پیچھے نہیں بلکہ آج سے تیس چالیس سال پہلے کی گاؤں کی زندگی سے۔ تم نے سلیم! گاؤں کی وہ زندگی نہیں دیکھی۔ اس میں گاؤں والے کہا کرتے تھے کہ ہم تو صرف نمک کے لئے شہر والوں کے محتاج ہیں اور بس۔ بات تھی بھی ٹھیک۔ غلہ (گیہوں۔ چاول دالیں) ان کے گھر کا ہوتا تھا۔ دودھ۔ گھی۔ مکھن۔ سب کچھ گھر کا۔ گڑ۔ شکر کا میٹھا بھی گھر کا۔ ساگ۔ پات (سبزی، ترکاری) بھی خود پیدا کردہ۔ خربوزہ۔ ککڑی موسم کے عام پھل (آم۔ جامن) بھی اپنے ہاں کے اور تیل بھی وہیں کے۔ تیلی کے ہاں سرسوں بھیجی اور تیل نکلوا لیا۔ کپاس کات کر سوت جولاہے کے ہاں بھیجا۔ کپڑے بن گئے۔ ڈھور، ڈنگر مر گیا تو چمار نے کھال صاف کر دی اور موچی نے جوتے بنا دیئے۔ کمہار نے وہیں سے مٹی لی اور ضروریات کے برتن تیار کر دیئے۔ بڑھئی نے درخت کاٹا اور لکڑی کا سامان بنا دیا۔ تیلی۔ موچی۔ لوہار۔ بڑھئی۔ جولاہے۔ دھوبی۔ نائی کسی کو پیسہ ٹکا نہیں دیا جاتا تھا۔ ہر فصل میں ان کا حصہ ہوتا تھا۔ اس لئے جو کچھ ایک زمیندار کے ہاں میسر ہوتا تھا وہ سب کچھ ان کے ہاں بھی موجود رہتا تھا۔ زمیندار

(یعنی کاشتکار) ان کی ضروریات زندگی کا سامان بہم پہنچا دیتے تھے۔ اور یہ ان کی ضروریات کی چیزیں تیار کر دیتے تھے۔ یہ تھا نقشہ سلیم! آج سے تیس چالیس سال قبل کے گاؤں کا۔ اس زندگی میں سلیم! (بالعموم) کوئی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ کوئی "بے ایمانی" نہیں کرتا تھا۔ اس لئے کہ جھوٹ بولنے (یا بد دیانتی کرنے) میں "انہیں فائدہ کچھ نہیں تھا"۔ انسان کی زندگی کی ہر ضرورت پوری ہوتی جاتی تھی (اور اس کا انہیں محکم یقین تھا کہ ایسا ہوتا رہے گا) اور زائد از ضرورت چیز کا مصرف کچھ نہیں تھا۔ تیلی کے ہاں سرسوں بیجی۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ تیل کی چوری کرتا۔ اس کے اپنے ہاں (ان ہی زمینداروں کی دی ہوئی) سرسوں موجود تھی جو اس کی ضرورت کے لئے کافی تھی اور زائد از ضرورت تیل کا مصرف کچھ نہیں تھا۔ یہ تھی وجہ کہ اس زندگی میں لوگ عام طور پر سچے اور دیانتدار ہوتے تھے وہ زندگی بڑے اطمینان اور سکون کی تھی جس میں ہر شخص کو ایک دوسرے پر بھروسا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب دہی اشیائے زندگی پیسوں سے بکنے لگیں تو اس زندگی پر بھی وہ تمام لعنتیں (رفتہ رفتہ) مسلط ہو گئیں جو تمہاری شہری زندگی کا طرۂ امتیاز ہیں۔ اب تمہارا دہی زمیندار، من بھر کپاس شہر میں لاکر دس روپے میں فروخت کرتا...... اور دس روپے کی پاؤ بھر ململ خرید کر واپس جاتا ہے (وقس علیٰ ہٰذا) اب تیلی بھی تیل نکالنے کی اُجرت پیسوں میں طلب کرتا اور تیل چوری بھی کرتا ہے۔ کیونکہ اب زائد از ضرورت تیل کے گاہک موجود ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ گاؤں کا سچ جھوٹ سے اور دیانتداری بد دیانتی سے بدلتی چلی گئی۔ تا آنکہ آج شہر اور گاؤں دونوں میں ظھر الفساد فی البر والبحر کا نقشہ پیدا ہو گیا۔ (اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم مشینوں سے فائدہ اٹھانے کی بجائے پرانی دیہاتی زندگی کی طرف لوٹ جائیں۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہ اگلی سطروں سے واضح ہو جائے گا)

میں نے ایک چھوٹی سی مثال سے تمہیں سمجھایا ہے کہ اخلاق کی پابندی کس طرح نظام معاشرہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتا ہے جس میں افراد معاشرہ کو "جھوٹ بولنے اور بد دیانتی کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے" اس طرح وہ اخلاقی ضوابط کے پابند ہو جائیں گے۔ یعنی ایک متوازن نظام ربوبیت سے۔

اخلاق کا مادہ خلق ہے۔ خلق کے معنی کسی چیز کا اندازہ یا پیمانہ مقرر کرنا ہے جس سے توازن قائم ہوتا ہے خلیق کہتے ہی متوازن کو ہیں۔ قرآن نے جب نبی اکرمؐ کے متعلق فرمایا ہے کہ انک لعلیٰ خلق عظیم تو اس سے مطلب ہی یہ تھا کہ انفرادی طور پر حضورؐ کی ذات میں انسانی صلاحیتیں پورے پورے توازن کے ساتھ موجود ہیں۔ اور اجتماعی طور پر حضورؐ نے اس نظام کو متشکل فرمایا جس میں معاشرہ میں پورا پورا توازن ہے۔

بہرحال ہم نے دیکھ لیا سلیم! کہ اخلاقی ضوابط کی پابندی وعظ و نصیحت سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے نظام ربوبیت کا قیام ضروری ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام کی تشکیل کس طرح ہو سکتی ہے؛

یہ ظاہر ہے کہ

(۱) عقل اپنے فریضے (یعنی تحفظ ذات کے لئے اسباب و ذرائع کی فراہمی) کی طرف سے اسی صورت میں مطمئن ہو سکتی ہے جب اسے تحفظ ذات کا یقین ہو جائے۔

(ب) عقل کو اس امر کا یقین اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ نظام معاشرہ افراد کے تحفظ کے اسباب و ذرائع فی الواقعہ بہم پہنچا رہا ہے۔ خالی وعدے اس کے اطمینان کا باعث نہیں بن سکتے خواہ وہ کتنے ہی حسین و جاذب نگاہ کیوں نہ ہوں۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ نظام اس قسم کے یقین دلانے کی پوزیشن میں اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ اچھی طرح قائم ہو جائے اور اس کے بوئے ہوئے بیج پھل دینے لگ جائیں۔

یہ ہے سلیم! اصل دشواری۔ عقل اس بھروسے پر کہ "بیج بو دیا ہے۔ پھل لگنے دو" اپنا مسلک چھوڑ نہیں سکتی۔

اور یہ نظام پھل لگنے سے پہلے عقل کا اطمینان کرا نہیں سکتا۔ لہذا بات کیسے بنے؟ اس نظام کی ابتدا کیسے ہو۔ تخم ریزی میں عقل دیکھتی ہے کہ کچھ ملنا تو ایک طرف، جو کچھ پاس تھا وہ بھی مٹی میں مل رہا ہے (عقل صرف مفاد عاجلہ کو دیکھ سکتی ہے)۔

اس سے ظاہر ہے کہ آغازِ کار عقل کی رو سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا دیکھنا یہ ہوگا کہ کیا عقل کے سوا کوئی اور قوت بھی ہے جس کی رو سے اس نظام کی ابتدا ہو سکتی ہے۔

یہی اصل سوال ہے سلیم! یہی وہ مقام ہے جہاں سے دو اہم مناہج زندگی کی تفریق شروع ہوتی ہے۔ یہیں سے زندگی کے دو مختلف فلسفے سامنے آتے ہیں۔ مغرب کے مادئیین (Materialists یا Positivists) کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا صرف یہی محسوسات کی دنیا ہے۔ مادی عناصر کی باہمی ترکیب سے کسی نہ کسی طرح زندگی ابھر آئی۔ اور زندگی نے ارتقائی منازل طے کر کے انسان میں عقل پیدا کر دی۔ لہٰذا عقل کے علاوہ انسان کے پاس کوئی اور ذریعۂ علم نہیں۔

دوسرا فلسفۂ زندگی یہ ہے کہ دنیا صرف محسوسات کی دنیا نہیں۔ بلکہ اس سے ماوراء اور دنیا بھی ہے۔ زندگی، انسانی ذات اور مادہ کی پیداوار نہیں۔ ان کا سرچشمہ مادہ سے ماوراء کہیں اور ہے۔ یہ سرچشمہ وہ ہے جہاں سے خود مادہ کو اس کا وجود عطا ہوا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے انسان کے لئے ذریعۂ علم صرف عقل ہی نہیں۔ عقل کے ماوراء ایک اور سرچشمۂ علم بھی ہے جسے وحی کہتے ہیں۔ چنانچہ جب ابلیس (عقل خود بیں) نے آدم کو جنت سے نکالا ہے جس میں اس کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی کفالت خود بخود ہو رہی تھی (یعنی خدا کا نظامِ ربوبیت) تو آدم سے یہی کہا گیا تھا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اسی جنت کو دوبارہ حاصل کر لو (یعنی پھر سے اس نظام کو قائم کر لو) تو تنہا عقل کی رو سے ایسا نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لئے ماوراء عقل، ہدایتِ آسمانی کی ضرورت ہوگی فاما یاتینکم منی ھدی (میری طرف سے راہنمائی ملتی رہے گی)، فمن تبع ھدای (پس جو کوئی اس ضابطۂ قوانین کے مطابق نظام قائم کرے گا) فلا یضل ولا یشقی (تو وہ نہ ہی ان چیزوں کی تلاش میں مارا مارا پھرے گا اور نہ ہی اسے جگر پاش مشقتیں اٹھانی پڑیں گی)، ومن اعرض عن ذکری (لیکن جو اس نظام سے اعراض برتے گا) فان لہٗ معیشۃ ضنکا (تو اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی) (۲۰/۱۲۳-۲۴)

یہ بالکل کھلے ہوئے اور واضح راستے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے متضاد۔ مخالف سمتوں میں جانے

والے۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ صرف فردِ متعلقہ کی حفاظت کا انتظام کرے لیکن وحی کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے جو افراد سے بلند ہے۔ اس کے نزدیک تمام نوعِ انسانی کے افراد یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر انسان اُس سے ایک جیسے فاصلے پر (EQUIDISTANT) واقعہ ہوا ہے۔ اس میں نہ رنگ و خون کی تفریق ہے نہ ملک و قوم کی تمیز۔ اُس کے پیشِ نظر ربّ العالمینی (ربوبیتِ نوعِ انسانی) ہے، نہ کہ کسی خاص فرد کی ربوبیت۔ یہ ہے فرق عقل کی راہ نمائی میں اور وحی کی راہ نمائی میں

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ　　در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

وحی چونکہ اسرارِ حیات کی شارح ہوتی ہے اس لئے وہ بتاتی ہے کہ تمام نوعِ انسانی اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے۔ افراد کی تقسیم خود ہماری پیدا کردہ ہے۔ وہ اس حقیقت کو بطور مسلّمہ پیش کرتی ہے اور جو اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں اُن سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ عالمگیر نظامِ ربوبیت کو بھی ایک حقیقتِ ثابتہ سمجھتے ہوئے اس کی عملی تشکیل کے لئے گامزن ہو جائیں۔

یہ ہے وہ مقام جہاں اس نظام کی ابتدا کرنے والوں السابقون الاولون کو اس نظام کے نتائج دیکھے بغیر ان کے یقینی ہونے پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اسے "ایمان بالغیب" کہتے ہیں (یعنی اس نظام کے ان دیکھے نتائج پر ایمان)، غور کیجئے۔ قرآن کی ابتدا "رب العالمین" (ربوبیتِ عامہ) سے ہوتی ہے اور اس کے بعد ایمان بالغیب یومنون بالغیب کا مطالبہ۔ اس لئے کہ کسی نظام کے نتائج دیکھے بغیر، اس کے قیام کے لئے جانگسل مشقتیں اٹھانا اور جگرپاش مصیبتیں برداشت کرنا السابقون الاولون (Picneers) کے ایمان محکم کے بغیر ممکن نہیں۔ چونکہ اس نظام کے قیام میں مترفین (دوسروں کی کمائی پر جینے والوں) کو اپنی موت نظر آتی ہے اس لئے وہ اس کی مخالفت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے۔ یہ خارجی مشکلات ہوتی ہیں دوسری طرف عقل قدم قدم پر عناں گیر ہوتی ہے کہ اپنی جان کیوں جوکھوں میں ڈال رہے ہو۔ خارجی اور داخلی مخالفتوں کے اس صبر آزما ہجوم میں، یہ صرف ان مومنین الصابرین کے کوہ شکن ایمان کی قوت کا کرشمہ ہوتا ہے کہ اُن کے پائے استقامت میں ذرا

لغزش نہیں آنے پاتی۔ ان حوصلہ شکن اور ہمت آزما مراحل کے بعد، یہ نظام متشکل ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کے درخشندہ نتائج اور تابندہ ثمرات اس طرح گوہر بار ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر دوسرے لوگ جوق در جوق اس کے سایۂ عاطفت میں آنے شروع ہو جاتے ہیں (یدخلون فی دین اللہ افواجا) اس طرح یہ نظام عالمگیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس نظام کے متشکل اور اس کے نتائج برآمد ہو جانے کے بعد وہی عقل جو پہلے اس مسلک کو اپنے ناموس کا حریف اور اپنے مفاد کے نقیض سمجھتی تھی، اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ جس نظام کو وہ اپنی تنگ نگہی اور کوتاہ دامنی کی وجہ سے "مفادِ غیر" کے تحفظ کا نظام سمجھ رہی تھی وہ اس کے اپنے مفاد کا ایسا کفیل ہوتا ہے کہ تنہا عقل اپنے مفاد کے تحفظ کا اس قسم کا یقینی انتظام کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اب وہی ایمان جو پہلے ایمان بالغیب تھا، علیٰ وجہ البصیرت ایمان بن جاتا ہے۔ اس طرح عقل اور ایمان ایک دوسرے کے رفیق بن جاتے ہیں۔ یہی وہ طریقِ کار ہے جس کے متعلق اقبالؔ کہتا ہے کہ

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ
عشق را با زیرکی آمیز دہ

جو عقل اس طرح "ادب خوردۂ دل" ہو جاتی ہے اسے وہ "عقلِ جہاں بیں" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است

جب اس طرح انسان دیکھ لیتا ہے کہ زندگی کسی ایک فرد کے اندر محبوس نہیں بلکہ کائنات میں پھیلی ہوئی ہے تو وہ یہ بھی دیکھ لیتا ہے کہ اس کا یہ پھیلاؤ صرف عرض (Space) ہی میں نہیں بلکہ طول (Time) کی سمت بھی ہے اس لئے جس چیز کا نام عقل نے "موت" رکھا تھا وہ اس کے نزدیک انقطاعِ حیات نہیں ہوتی۔ وہ دیکھ لیتا ہے کہ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو مسلسل آگے بڑھے جا رہی ہے۔ جسے موت کہا جاتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ جوئے رواں، دامنِ صحرا سے صحنِ گلستاں میں داخل ہو کر باغ کی فصیل کے باہر کھڑے ہونے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جہاں وحی، مفادِ خویش کی جگہ "ربّ العالمین" (ربوبیتِ عامہ) کا تصور دیتی ہے

اور اس طرح نگاہ کا رخ فرد (Individual) سے انسانیت (Humanity) کی طرف پھیر دیتی ہے۔ وہاں وہ زندگی کو طبیعی عناصر کی چاردیواری سے نکال کر اقطار السمٰوٰت والارض سے آگے لیجاتی ہے۔ بنا بریں جس چیز کا نام انسانی نشوونما (سامانِ زیست) رکھا جاتا ہے وہ صرف جسم کی پرورش تک ہی محدود نہیں رہتی۔ بلکہ جسم سے آگے بڑھ کر اصلِ حیات (نفس یا ذات) کی نشوونما کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتی ہے۔ لہٰذا نظامِ ربوبیت میں انسان کی طبعی زندگی کے اسباب و ذرائع کی فراہمی کے ساتھ ساتھ، نفسِ انسانی کے نشوونما و ارتقا کا سامان بھی بہم پہنچایا جاتا ہے یہ ہم دیکھ چکے ہیں سلیم! کہ نفسِ انسانی کی خصوصیت کبریٰ تھی "اختیار و ارادہ" یعنی حقیقی فیصلوں کی قوت۔ وہ قوت ع

جو یہ کہتی ہے خرد سے کہ بہانے نہ تراش

اس لئے اس قوت کی نشوونما کے معنی ہوں گے انسانی اختیارات کی دنیا کی وسعت۔ اس کے مضمر جوہروں کی بالیدگی۔ اسے قرآن نے خیر کہا ہے (جس کا ترجمہ ہمارے ہاں "نیکی" کیا جاتا ہے) خیر اور اختیار ایک ہی مادہ سے ہیں۔ اس نظام کو قائم کرنے والی جماعت کو امّۃ یدعون الی الخیر (۳/۱۰۴) کہا گیا ہے (یعنی خیر کی طرف دعوت دینے والی جماعت اس نظام کی طرف دعوت دینے والی جماعت جس میں انسان کے اختیارات کی وسعتیں بڑھتی جائیں. لیکن اس خیال سے کہ کہیں یہ اختیارات بے لگام نہ ہو جائیں۔ یہ بھی بتا دیا کہ ان اختیارات کا سرچشمہ وحی خداوندی ہے۔ اسی لئے دوسری جگہ خود قرآن کو بھی خیر کہا ہے (۲/۱۰۵)

* * *

یہ ہے سلیم! وہ نظام جس کے اندر انسان خود بخود اخلاقی ضوابط کی پابندی اختیار کر لیتا ہے۔ اس نظام کے بغیر، اخلاقی ضوابط کی پابندی کی کوئی اور شکل نہیں۔ انسان نے اس کا خود تجربہ کر کے دیکھ لیا ہے۔ اس کی پانچ ہزار سالہ زندگی کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ تنہا اخلاقی مواعظ انسان کو اخلاقی ضوابط کا پابند نہیں بنا سکتے والعصر ان الانسان لفی خسر زمانے کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ انسان تنہا عقل کی رو سے بنائے ہوئے نظام کے اندر کبھی کامیابی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسے اخلاقی ضوابط کا پابند بنانے اور

اس کی مکمل نشو و نما کرنے کا ایک ہی طریق ہے۔ یعنی وحی کے مطابق نظام ربوبیت کا قیام (الا الذین امنوا وعملوا الصالحات) یہ وہ نظام ہے جس میں تمام افراد معاشرہ ایک دوسرے کی تعمیری نشو و نما میں مصروف سعی و عمل رہتے ہیں (وتواصوا بالحق) اور یہ لوگ اس پروگرام کو محض مفاد عاجلہ کی خاطر اختیار نہیں کرتے کہ تھوڑے سے عرصے کے بعد اسے چھوڑ دیں۔ وہ اسے اپنی ساری زندگی کا مسلسل پروگرام بنا لیتے ہیں (وتواصوا بالصبر) یہی وہ نظام تھا جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قرآنی اصولوں کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متشکل فرمایا تھا۔ اِس نظامِ زندگی کے علاوہ سلیم! انسانی نشو و نما کا کوئی اور نظام نہیں، جس طرح کائنات میں ایک قانون کے علاوہ دوسرا قانون نہیں (ان الدین عند اللہ الاسلام ۳/۱۹) قانون خداوندی کی رو سے نظامِ حیات ایک ہی ہے، دو نہیں۔ وحدتِ قانون (Unity of Law) ہی وہ بنیاد ہے جس پر ساری کائنات کا دارومدار ہے۔ اس لئے انسانی معاشرے کا نظام (الدین) بھی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ وحدتِ قانون کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کی مثل دوسرا قانون نہ ہو۔ سلیم! ذرا پوچھو دنیا کے علمائے فطرت (Scientists) سے وہ تمہیں بتائیں گے کہ کس طرح سائنس کی ساری عمارت اسی ایک اصول پر قائم ہے۔ یہی اصول دین میں بھی کارفرما ہے یعنی نظام زندگی ایک ہے۔ اس کی مثل دوسرا نہیں۔ اسی لئے قرآن نے یہ چیلنج دیا ہے کہ اس کے پیش کردہ نظام کی مثل کوئی دوسرا نظام مرتب کر کے دکھاؤ؟

یہ ہے سلیم! انسان کو صحیح راہ پر چلانے کا طریقہ۔ یعنی اس نظام کا قیام جس میں ہر فردِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی اور سامان نشو و نما کی ذمہ داری خود نظام کے سر پر ہو۔ جس معاشرے میں کوئی ایک فرد بھی رات کو بھوکا سو گیا یا کسی ایک فرد کی صلاحیتیں بھی کامل طور پر نشو و نما پانے سے رک گئیں۔ وہ معاشرہ انسانوں کو اخلاقی ضوابط کا پابند نہیں بنا سکتا۔ ساری دنیا نے آزما کر دیکھ لیا۔ خود مسلمان بھی تیرہ سو سال سے دیکھ رہا ہے۔ نظام ربوبیت کے بغیر اخلاقی ضوابط کی پابندی ناممکن ہے۔ اگر عقل کو زبردستی اخلاقی ضوابط کی کسی ایک شق کا پابند بنا بھی دیا جائے تو وہ دوسری طرف سے سرک کر نکل جانے کی راہیں تلاش کرے گی۔ لہذا سلیم! تمہاری مقدس آرزوئیں مُلّا کے

دلپذیر وعظ۔ حکومت کے "پرودسے" (PARODAS) سب بیکار ہیں۔ جب تک عقل کو اپنے تقاضوں (تحفظ ذات) کے پورا ہو جانے کا کامل یقین نہیں آ جاتا وہ اخلاقی مواعظ پر کان دھر ہی نہیں سکتی۔ جب تک انسان کو اس کی ضروریات سے بے نیاز نہ کر دیا جائے وہ جھوٹ بولتا رہے گا۔ قرآنی حکومت سے مراد، سلیم! اس نظام ربوبیت کے قیام کے سوا کچھ نہیں۔

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است

لیکن اس سے مفہوم صرف "روٹی" کا مہیا کر دینا نہیں۔ مقصود حیات اس سے آگے ہے لیکن اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

* * *

اس مقام پر سلیم! تمہارے دل میں ایک اور خیال بھی پیدا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا جواب بھی ساتھ کے ساتھ ہی دیدوں ورنہ تمہیں ایک اور خط لکھنا پڑے گا۔ تم پوچھو گے یہ کہ ایک طرف یہ بنایا جا رہا ہے کہ انسان کی عقل تمام خرابیوں کی جڑ ہے جس سے سب فتنے اٹھتے ہیں۔ یہی تمام فساد کی موجب ہے۔ لیکن دوسری طرف دیکھیں تو قرآن ایک ایک صفحے پر عقل و فکر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہے۔ وہ فہم و بصیرت سے کام نہ لینے والوں کو بدترین خلائق قرار دیتا اور جہنم کا ایندھن بتاتا ہے۔ اس لئے ان دونوں صورتوں میں تطابق کی کیا شکل ہے؟

یہ سوال بڑا اہم ہے سلیم! اور اس کا جواب نہایت ضروری۔ ذرا غور سے سنو۔ (میں بھی اس وقت تمہاری عقل ہی کو اپیل کر رہا ہوں)

انسان کی ایک دنیا تو وہ ہے جس میں اسے خارجی کائنات (Outer Universe) سے کام پڑتا ہے۔ اشیائے کائنات کی ماہیت کا معلوم کرنا۔ قوانین فطرت کا مطالعہ۔ فطرت کی قوتوں کی تسخیر۔ فرش کے ذروں سے لیکر آسمان کے ستاروں تک، تمام اشیائے فطرت کے خواص و اثرات کا علم حاصل کرنا ان میں ربط و ضبط پیدا کر کے جدید اشیاء کا وجود میں لانا اس سے آگے بڑھیے تو خود انسان کا مطالعہ بہ حیثیت ایک

خارجی شے (Objective Study) اس کی طبعی ساخت و پرداخت۔ اس کے رجحانات و میلانات اس کے ماضی کی تاریخ۔ اقوامِ عالم کے عروج و زوال کے اسباب۔ اس کے حال کے مسائل (Problems) وغیرہ وغیرہ۔ کائنات کے یہ گوشے ایسے ہیں جن میں غور و فکر نہایت ضروری ہے۔ اگر زندگی کے ان دوائر میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے تو انسان، حیوانی سطح سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ بلکہ یہ توہم پرستیوں کی وجہ سے، درجۂ حیوانیت سے بھی نیچے جا گرتا ہے۔ قرآن، کائنات کے ان تمام گوشوں پر غور و فکر کرنے کی سخت تاکید کرتا ہے۔

لیکن زندگی کا ایک گوشہ اور ہے۔ یہ گوشہ وہ ہے جس میں ایک انسان کا معاملہ دوسرے انسانوں سے پڑتا ہے۔ اسے انسانوں کی معاشرتی یا تمدنی یا اجتماعی زندگی کہا جاتا ہے۔ زندگی کے اس گوشے میں ایک انسان کے مفاد دوسرے انسانوں سے ٹکراتے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد کی عقل کا تقاضا اس کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس لئے اس میدان میں عقلوں کی جنگ (Battle of Wits) شروع ہو جاتی ہے یہ ہے وہ گوشہ جس میں اگر انسانی عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے تو قدم قدم پر تصادم شروع ہو جاتا ہے اور تمام معاشرہ میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں "عقل بیباک" کو ابلیس کہا جاتا ہے۔

قرآن کہتا یہ ہے کہ جب انسانوں کے معاملات سامنے آئیں تو ان کی عقل کو وحی کے تابع رکھو۔ وحی کے اصول انسانوں کے مفاد میں موافقت پیدا کر کے، ان کے باہمی تصادم کو مٹا دیتے ہیں جب عقل کو اس طرح وحی کے تابع رکھا جائے (یا یوں کہو کہ عقل سے وحی کی روشنی میں کام لیا جائے) تو عقل کی آنکھ حقیقت کو دیکھ لیتی ہے۔ اور اس کے بعد اسے نظر آجاتا ہے کہ اس طریقِ عمل سے، معاشرہ میں فساد برپا کئے بغیر، اس کے مفاد کا تحفظ ہو گیا ہے، اس طرح وحی کی روشنی میں انسانی عقل، خود انسان کی داخلی دنیا کا مطالعہ بھی اسی طرح (Objectively) کر لیتی ہے جس طرح وہ خارجی دنیا کا مطالعہ کرتی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ان اشارات سے تم سمجھ گئے ہو گے سلیم! کہ عقل کے یہ مختلف گوشے کیا ہیں اور اس

کا صحیح مقام کیا؟ اور وہ کونسی عقل ہے جس سے کام لینے کی اس قدر تاکید کی جاتی ہے اور وہ کونسی ہے جسے آزاد چھوڑنے سے اس طرح روکا جاتا ہے۔ اقبال "عقلِ بے باک" کو عقلِ خودبیں کہہ کر پکارتا ہے اور اس عقل کو جو وحی کے تابع کام کرتی ہے، عقلِ جہاں بیں سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ

عقلِ خودبیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

* * *

ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے۔

میں نے اس خط میں "زر" اور "زمین" سے پیدا ہونے والے مفاسد کا ذکر کیا ہے۔ نظامِ ربوبیت میں "زن" (Sex) سے پیدا ہونے والے مفاسد کا علاج کس طرح ہو جاتا ہے۔ اسے کسی دوسرے وقت لکھوں گا بلکہ میرا خیال ہے کہ اسے تمہارے اس سوال کے ساتھ ہی نپٹانے کی کوشش کروں گا کہ "حرام اور حلال" کا قرآنی فلسفہ کیا[1] ہے؟ یہ خط بہت لمبا ہو گیا ہے۔ مجھے بالآخر دنیا میں کچھ اور کام بھی تو ہیں۔ تمہاری تو یہ حالت ہے کہ

مہرباں ساقیٔ محفل کو جو دیکھا ہے روش
یہی ضد ہے کہ ہر اک جام ہمیں تک پہنچے

اور یہاں یہ عالم کہ

اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب

اس لئے تمہارے سب تقاضے بیک وقت کس طرح پورے کئے جا سکتے ہیں! اچھا خدا حافظ!

اپریل۔ سنہ ۱۹۵۲ء

---

[1] افسوس ہے کہ یہ خط اس مجموعے میں شامل نہیں ہو سکا۔

سلیمؒ کے نام ۲۰ بیسواں خط

(خدا کا تصور)

ارے بابا! تم تو چاہتے ہو کہ بس اللہ میاں کو تمہارے سامنے لاکر کھڑا کر دیا جائے تو پھر تمہارا اطمینان ہو۔ غنیمت یہ ہے کہ تم جناب کلیم اللہؑ کی طرح رب ارنی انظر الیك (یا اللہ! مجھے اپنا آپ دکھا کہ تجھے نگاہ کامیاب ہو سکے) ہی کہتے ہو، بنی اسرائیل کی طرح یہ نہیں کہتے کہ لن نؤمن لك حتی نری اللہ جهرة (ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو اپنے سامنے نہیں دیکھ لیں گے)، یہی فرق ہے ایک قلب سلیم اور ذہن سرکش میں۔

سلیم! پہلے تو یہ سمجھ لو کہ دنیا جب بھی خدا کے متعلق بات کرے گی، وہ بات درحقیقت خدا کے متعلق نہیں ہوگی بلکہ خدا کے متعلق انسانی تصورات (Our ideas about God) کی بات ہوگی۔ اس لئے کہ انسانوں کے خودساختہ مذہب نے خدا کا انفرادی تصور دیا ہے۔ یعنی ہر فرد کے ذہن میں خدا کا الگ الگ تصور۔ اور انفرادی تصور ہمیشہ داخلی (Subjective) ہوتا ہے۔ اس لئے ہر فرد کا خدا الگ ہوتا ہے۔ اس قسم کے (Subjective God) کے تصور میں حقیقی توحید آ ہی نہیں سکتی۔ غریب کا خدا اور قسم کا ہوگا۔ امیر کا اور قسم کا۔ مایوس کا خدا اور قسم کا ہوگا، کامیاب کا خدا اور قسم کا۔ فاتح و منصور کا خدا اور قسم کا ہوگا، مفتوح و محکوم کا اور قسم کا۔ اور آگے بڑھئے تو جیمس جینز (James Jaans) کا خدا اور قسم کا ہوگا، وائٹ ہیڈ کا اور قسم کا۔ حتی کہ ایک ہی فرد کی مختلف حالتوں میں مختلف خدا ہوں گے۔ بیماری کی حالت کا خدا اور قسم کا ہوگا۔

تندرستی کی حالت کا خدا اور قسم کا۔ صفراوی غلبہ کی حالت میں خدا اور قسم کا ہوگا۔ بلغمی مزاج میں اور قسم کا۔ افراد سے آگے بڑھئے تو قبائلی خدا (Tribal God) کی باری آتی ہے۔ ایک جابر و سرکش قوم کا خدا اور قسم کا ہوگا۔ اور مظلوم و مقہور قوم کا خدا اور قسم کا۔ ٹھگوں کا خدا اور قسم کا ہوگا اور کبیر پنتھیوں کا اور قسم کا۔ بنی اسرائیل کے دورِ شوکت و سطوت کا خدا اور قسم کا تھا اور زوال و انحطاط (بیت المقدس کی بربادی اور اس کے بعد "مسیح کی بھیڑوں") کے زمانہ کا خدا اور قسم کا۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ اگر تم نے دیکھنا ہو کہ فلاں دور میں فلاں قوم کا تمدن کیسا تھا تو یہ دیکھو کہ اس دور میں اس قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا وضع کر رکھا تھا۔ اسی تفصیل کی سمٹی ہوئی شکل ہے۔ انسان اپنے سے باہر کسی مجرد (Abstract) شے کا تصور کر ہی نہیں سکتا اس لئے ذہن انسانی کا تراشیدہ خدا، ہمیشہ انسانی جذبات و عواطف کا پیکر ہوتا ہے۔ جس قسم کے امیال و عواطف اور جذبات و احساسات، اسی قسم کا خدا۔ کہنے کو تو یہ کہا جاتا ہے کہ "خدا نے انسان کو اپنی شکل پر ڈھالا ہے" لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان خدا کو خود اپنی شکل پر ڈھالتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے ہاتھ، پاؤں، سر، آنکھیں، ناک، کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں، خدا کے بڑے بڑے ہوں گے۔ انسان کے دو ہاتھ ہوتے ہیں خدا کے دس ہوں گے۔ انسان اپنی مٹھی میں ذرا سی چیز دبا سکتا ہے۔ ایشور اپنی مٹھی میں جوالا مکھی پہاڑ لے سکتا ہے انسان دو چار گھونٹ پانی پی سکتا ہے، دیوتا پورے کا پورا سمندر چڑھا لیتے ہیں۔ یا یہ کہ انسان غصے میں آ کر کسی ایک انسان کے تھپڑ مار دیتا ہے، خدا غصے میں آ کر قوم کی قوم کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ وقس علیٰ ہذا

تم نے دیکھا سلیم! کہ اس قسم کے (Subjective God) کا تصور کس قدر کمزور بنیادوں پر قائم ہوتا ہے اور کس طرح انسانی تصورات کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ جب (Allan Grant) یا اسی قسم کے دیگر مغربی مصنفین یہ کہتے ہیں کہ خدا ذہن انسانی کے تدریجی ارتقاء کا پیدا کردہ ہے، تو ان کا مطلب اسی قسم کے (Subjective God) سے ہوتا ہے جس کا تصور "مذہب" پیش کرتا ہے۔ اس قسم کا خدا چونکہ ذہن انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ذہن انسانی کی ارتقائی منازل کے ساتھ ساتھ

بدلتا رہتا ہے۔

اب آگے بڑھو سلیم! اس قسم کے (ذہن انسانی کے پیدا کردہ) خدا کی صورت میں ایک دقت اور بھی ہوتی ہے۔ تم نے خود ہی یہ قصہ سنایا تھا کہ جب عمر بخش اور۔۔۔ خداداد کا مقدمہ چل رہا تھا تو دونوں، نماز کے بعد، اپنی اپنی کامیابی کی دعائیں مانگا کرتے اور دونوں خدا کے حضور منتیں مانا کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے کہ تم دیکھ لینا کہ میرا سچا خدا میری کس طرح مدد کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ان دونوں کا "خدا" ایک ہی تھا تو اس کے لئے یہ مقام کس قدر کشمکش کا ہوگا۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں اس سے مدد مانگ رہے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ بہرحال ایک ہی کے حق میں ہو سکتا تھا (اور ایک ہی کے حق میں ہوا) اگر یہ فیصلہ اس کے حق میں ہوا تھا جس نے زیادہ دعائیں مانگیں اور زیادہ منتیں مانی تھیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دونوں (فریقین) "خدا" کو اپنی اپنی طرف جھکانا چاہتے تھے۔ "خدا" اس کی طرف جھک گیا جس نے زیادہ دعائیں مانگیں، یا زیادہ چڑھاوا چڑھا دیا۔ اس شکل میں سلیم! سوچو کہ معاملہ کی صورت کیا ہوئی! دنیا میں ہزاروں انسان ایسے ہوتے ہیں جن کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ بعض اوقات پوری کی پوری قوم، دوسری قوم کے خلاف نبرد آزما ہو جاتی ہے اور ہر قوم اپنی کامیابی کے لئے خدا سے دعائیں مانگتی ہے (تمہیں یاد ہوگا کہ گزشتہ جنگ میں ہٹلر بھی خدا کا نام لے کر حملہ کیا کرتا تھا اور چرچل بھی خدا کی مدد سے اس کا جواب دیا کرتا تھا) یعنی ہزاروں بلکہ لاکھوں انسان بیک وقت "خدا کو ایک طرف کھینچتے ہیں اور لاکھوں انسان دوسری طرف۔ اس لئے کہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ اس کا "خدا" اس کے ساتھ ہے۔ وہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں (ذہن انسانی کا تراشیدہ) "خدا" کیا کرتا ہے؟ اگر وہ کچھ نہیں کرتا اور دنیا کے معاملات یوں ہی چلے جا رہے ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے "خدا" کے ماننے سے حاصل کیا ہے؟ ہر شخص خدا کو اس لئے مانتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا خدا مشکلوں اور مصیبتوں میں اس کی مدد کرے گا۔ لیکن اگر اس کا خدا اس کی مدد نہیں کرتا تو وہ ایسے خدا کو مان کر کیا کرے گا؟ اور اگر خدا مدد کرتا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عمر بخش اور خداداد (ہٹلر اور چرچل) میں سے

کس کی مدد کرتا ہے؟ اگر وہ اس کی مدد کرتا ہے جو سب سے زیادہ منتیں مانتا ہے تو یہ وہی کھینچا تانی کا سلسلہ ہوگیا جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ مذہب (یعنی ذہن انسانی کے تراشیدہ خدا) کے سلسلے میں، پہلی منزل (First stage) یہی منتوں اور چڑھاووں کی ہوتی ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو عصرِ سحر (Magic Age) آتی ہے جس میں خاص قسم کی رسومات، خاص قسم کے ورد اور وظائف (منتر جنتر) سے "خدا" کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اس شخص کی مرضی کو پورا کرے۔ "صبح کے وقت ندی میں کھڑے ہو کر، سوا لاکھ مرتبہ، یہ کچھ پڑھو، مقدمہ میں کامیابی لازمی ہے۔" یعنی اگر تم نے ایسا کر دیا تو خدا مجبور ہوگا کہ مقدمہ کا فیصلہ تمہارے حق میں کرائے۔ اس کے برعکس اگر یہی کچھ، یا اس سے زیادہ زوردار چلّہ فریق ثانی نے کر دیا تو خدا کو اس کے حق میں فیصلہ کرانا پڑیگا۔

یہ کیفیت ہوتی ہے سلیم! اس وقت جب خدا خود انسانی ذہن کا تراشیدہ (Subjective) قرار پا جاتا ہے۔ انسانوں کا خود ساختہ مذہب اسی قسم کے خدا کا تصور پیش کرتا ہے۔ اور یہی ہے وہ خدا جس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ محض انسانی تصورات کی تخلیق ہے۔ یعنی یہ اعتراض کہ انسان نے اپنے لئے خود خدا بنا لیا ہے۔ خدا در حقیقت موجود نہیں ہے۔ لیکن دین (قرآن) خدا کے متعلق ایک جداگانہ تصور عطا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا، ذہن انسانی کا تراشیدہ نہیں، بلکہ وہ خارج میں (Objectively) موجود ہے۔ وہ اس وقت بھی موجود تھا جب کوئی تصور کرنے والا ذہن نہیں تھا اور اس وقت بھی موجود ہوگا جب کوئی تصور کرنے والا ذہن نہیں ہوگا۔ وہ موجود ہے اور اپنی خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔ اس کی یہ خصوصیات (جنہیں صفات (Attributes) کہا جاتا ہے) مستقل بالذات اور موجود فی الخارج ہیں۔ وہ نہ عمر بخش کی آرزوؤں کے مطابق بدلتی ہیں نہ خداداد کی تمناؤں کے مطابق ڈھلتی ہیں۔ نہ انہیں ہٹلر کھینچ کر اس کی جگہ سے ہٹا سکتا ہے نہ چرچل لیس باما نیکم ولا امانی اھل الکتاب (نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق۔ نہ اہل کتاب کی خواہشات کے)

اب یہ ظاہر ہے کہ جب خدا، ذہن انسانی کا پیدا کردہ نہیں تو ذہن انسانی اس کے متعلق کچھ بھی نہیں

بتا سکتا۔ ذہن انسانی تو اسی چیز کے متعلق کچھ بتا سکتا ہے جس کا وہ تصور کر سکتا ہے۔ یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس خدا کے متعلق ذریعہ معلومات کیا ہے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے۔ یعنی وہ علم جو ذہن انسانی کا پیدا کردہ (Subjective) نہیں بلکہ خارج سے عطا شدہ (Objective) ہے۔ یہ علم خود خدا کی طرف سے حضرات انبیاء کرامؑ کو براہ راست ملتا ہے (یعنی ملتا تھا۔ کیونکہ اب تو سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا) اور اس کے ذریعے خدا اپنا تعارف کراتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھو کہ خدا نے اپنے متعلق جس قدر معلومات بہم پہنچانی تھیں اس خارجی ذریعہ علم (وحی) کی رو سے از خود بہم پہنچا دیں۔ جس قدر اپنا تعارف کرانا تھا اس کے ذریعہ کرا دیا۔ اب دنیا میں قرآن، اسی تعارف خداوندی کا خریطہ ہے۔ اسی تعارفی تفاصیل کو صفاتِ خداوندی (Attributes) کہتے ہیں۔ یعنی حقیقتِ مطلق (Absolute Reality) کے مختلف گوشے (Facets) ان ہی کو قرآن کی اصطلاح میں اسماء الحسنیٰ کہا جاتا ہے اور یہی مستقل اقدار (Absolute Values) ہیں۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے سلیم! کہ اس خدا سے میرا کیا تعلق ہے؟ میں اسے کیوں مانوں؟ اس پر ایمان کیوں لاؤں؟ ایک شخص کہتا ہے کہ خدا ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں ہے۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ نہ ماننے والے میں کیا کمی رہ جاتی ہے، جو ماننے والے میں پوری ہو جاتی ہے۔ اگر خدا ہے تو ہوا کرے۔ اگر نہیں ہے تو نہ سہی۔ مجھے اس سے کیا واسطہ؟ یہ سوالات بڑے اہم ہیں اور جب تک ان کا اطمینان بخش جواب وجۂ طمانیت قلب نہیں ہوتا، ایمان کی ضرورت اور اہمیت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے اسے ذرا غور سے سنو۔ میں آج تک تمہارے اس سوال کو ٹالتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ موضوع کس قدر مشکل اور دقیق ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ میں نے بات شروع کی اور تم بدکے اور اگر بدکے نہیں تو سو ضرور جاؤ گے۔ لیکن اب جو تم نے اس قدر اصرار کیا ہے تو غور سے سنو۔ اس لئے کہ انسانی زندگی پر اس کا اثر بڑا گہرا ہوتا ہے۔ خدا کا ماننا اور نہ ماننا یوں ہی ہنسی کی بات نہیں کہ یوں ہو گیا تو کیا اور ووں ہو گیا تو کیا؟ اس یوں اور ووں میں زندگی کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ ساری کی ساری کائنات کی بساط الٹ جاتی ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد زندگی کی تمام حرکتیں گردش کرتی ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون

کا یہی مفہوم ہے)

لو اب سنو!

دنیا میں ہر شخص کے سامنے زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے بشرطیکہ وہ بالکل حیوانوں کی سی زندگی بسر نہ کر رہا ہو۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ بننا چاہتا ہے۔ اس کے لئے ہر شخص اپنے سامنے کوئی نہ کوئی نصب العین، کوئی نہ کوئی منزل، کوئی نہ کوئی نمونہ (Pattern) رکھتا ہے۔ کوئی امیر بننا چاہتا ہے تو اس کے سامنے کسی بہت بڑے دولتمند کا نمونہ ہوگا۔ کوئی صاحب علم بننا چاہتا ہے تو اس کے پیش نظر کسی ذی علم ممتاز ہستی کی مثال ہوگی۔ کوئی بہت بڑا (Industrialist) بننا چاہتا ہے تو وہ اپنے سامنے یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے ارباب صنعت و حرفت اور کارخانہ داروں کی زندگی رکھے گا کوئی شجاعت اور بہادری میں نام پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے بڑے بڑے فاتح جرنیلوں کے کارنامے ہوں گے۔ لیکن یہ سب مقاصد اضافی (Relative) ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص، آدمی (Man) بننا چاہے تو اسے اپنے سامنے کونسا نمونہ (Pattern) رکھنا چاہیئے۔

آدمی کی ایک حثیت تو وہ ہے جسے حیوانی سطح (Animal Level) کہا جاتا ہے۔ وہی جس کے متعلق تم اکثر اکبر کا مصرع پڑھا کرتے ہو کہ ع

ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں[1]

اس کی حیوانی زندگی، خالص مادی پیکر آب و گل کی زندگی ہے، جس کا مقصد تحفظ ذات (Preservation of Self) اور تولید نسل (Procreation) ہے۔ اس کے لئے نہ اسے کسی نصب العین کی ضرورت ہے نہ کسی تمثیلی نمونہ کی۔ لیکن جس چیز کو آدمیت کہا جاتا ہے وہ اس حیوانی زندگی سے الگ شے ہے۔ قرآن میں تخلیق آدم

---

[1] کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست فکر ہر کس بقدر ہمت اوست (اکبر)

کی مختلف کڑیوں پر غور کرو سلیم! پہلے اس کی حیوانی تخلیق کے مختلف مدارج کو گنایا گیا ہے (بدا خلق الانسان من طین) تخلیق انسانی کی ابتدا مٹی سے ہوئی۔ یہ ہوئی جمادات کی زندگی (ثم جعل نسلہ من سللۃ من ماء مھین) پھر اس کی نسل کو بذریعہ تولید آگے بڑھایا۔ یہ حیوانات کا درجہ آگیا (ثم سواہ) پھر اس میں خاص توازن پیدا کیا۔ یہ حیوانات سے اگلی ارتقائی منزل آئی جہاں اس نے انسان بننا ہے۔ اس کے بعد کہا (و نفخ فیہ من روحہ) پھر اللہ نے اس میں اپنی (روح) توانائی کو پھونک دیا۔ اب یہ انسان تخاطب کے قابل ہو گیا (وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ) اس کے بعد تمہیں سماعت، بصارت اور قلب عطا کر دیا۔ غور کرو سلیم! ان تمام مدارج تخلیق میں نفخ روح کا وہ مقام ہے جہاں سے آدمیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسی کا نام انسانی ذات (Personality) ہے۔ اسی کو اقبال خودی کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ لہٰذا آدمی نام ہے "روح خداوندی" کے مظہر کا۔ یعنی خدائی صفات کا حامل۔ یہ صفات وہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ تمام صفات ہر فرزند آدم ہر آدمی کے اندر بطور ممکنات زندگی (Realisable Possibilities) موجود ہیں۔ پیدائشی اعتبار سے ہر انسان میں یہ صفات مستتر (Potent) ہوتی ہیں۔ ان صفات کو بارز (Actualised) کرنا یا مشہود (MaNifested) بنانا مقصود آدمیت ہے۔ اسی کو خودی کی نمود یا تکمیل ذات کہا جاتا ہے خدا کی ذات میں یہ صفات اپنی انتہائی حقیقی شکل (Realised Form) اور مکمل ترین صورت میں موجود ہیں۔ نہ صرف مکمل ترین صورت میں بلکہ ایسے توازن و تناسب کو لئے ہوئے جس سے بہتر اور مکمل توازن کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اسی لئے ان صفات (اسماء) کو حسنٰی (بہترین توازن، حسن کارانہ انداز کی حامل) کہا گیا ہے۔ اسی انداز سے اپنی صفات کو تکمیل تک پہنچانا مقصد حیات انسانی ہے۔

اب تم خود فیصلہ کر لو سلیم! کہ کسی انسان کو آدمی بننے کے لئے اپنے سامنے کونسا نمونہ (Pattern) رکھنا ہو گا؟ جواب ظاہر ہے کہ یہ نمونہ خدا کی صفات کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ انسان جن صفات کا پیکر ہے، وہی صفات اپنی مکمل ترین شکل میں، اس کی تکمیل ذات کیلئے نمونہ بن سکتی ہیں صبغۃ اللہ

ومن احسن من اللہ صبغۃ (۱۳۸/۲)، اللہ کا رنگ جس کے رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کوئی نہیں "یہ ہے وہ نمونہ (Pattern) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے ہر انسان کا مقصود حیات ہونا چاہیئے۔ اسے کہتے ہیں سلیم! قرآن کی اصطلاح میں۔ اللہ پر ایمان لانا "یہ ہے وہ ایمان جس کا مطالبہ تمام نوع انسانی سے کیا گیا ہے، خواہ وہ پہلے اپنے طور پر خدا کو مانتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی لئے" صبغۃ اللہ کی آیت سے پہلے یہ آیت ہے۔ فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا اگر یہ لوگ اس انداز سے اللہ پر ایمان لائیں جس انداز سے تم ایمان لاتے ہو۔ تو پھر سمجھو کہ یہ زندگی کی صحیح راہ پر گامزن ہو سکیں گے۔

لہٰذا اللہ پر ایمان کے معنی ہوئے سلیم! صفاتِ خداوندی کے حسین مجموعے (اسماء الحسنیٰ) کو (جن کا تعارف قرآن میں کرایا گیا ہے) اپنی زندگی کا نصب العین بنانا۔ یعنی وہ صفات الٰہیہ جو خود انسان کے اندر مضمر ہیں انہیں مشہود کرتے چلے جانا، یہ مضمر (Latent) یا (Potential) صفات جس قدر مشہود (Actualised) ہوتی جائیں گی، انسان "خدا کے قریب" ہوتا جائے گا۔ جب یہ تمام صفات اپنی آخری انسانی حد تک مشہود ہو جائیں گی۔ تو "انسان اپنے رب تک پہنچ جائے گا" قرآن نے انسانی زندگی کے نصب العین (Goal) کو ان ہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے وان الیٰ ربك المنتھیٰ (۴۲/۵۳) منزل ما کبریا است

غور کرو سلیم!

(i) چونکہ انسان، صفاتِ خداوندی (روح خداوندی) کا حامل ہے اس لئے اس کی تکمیلِ آدمیت کے لئے نمونہ صرف خدا کی صفات ہو سکتی ہیں۔

(ii) اور یہ صفاتِ خداوندی، ہر فردِ انسانیہ کے لئے نمونہ ہوں گی۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک ہی نمونہ (pattern) کیونکہ ہر انسان ان ہی صفات کا حامل ہے۔

اسے توحید کہتے ہیں۔ یعنی انسانی زندگی کے لئے صرف ایک نمونہ، ایک نصب العین ہونا لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ

اور یہ نصب العین اس خدا کی صفات کا ہو سکتا ہے، جس کا تعارف خود خدا نے وحی کی رو سے کرا دیا ہو (نہ کہ ذہن انسانی کا تراشیدہ خدا)، اس لئے دنیا کے ہر انسان کے لئے اس خدا پر ایمان لانا (یعنی اسے نصب العین حیات بنانا) ضروری ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ یہ اس لئے کہ وحی اپنی اصلی اور خالص شکل میں قرآن کے سوا اور کہیں موجود نہیں (دنیا کے تمام مذاہب کے متبعین اس حقیقت کے معترف ہیں کہ ان کے ہاں وحی اپنی اصلی اور غیر مخلوط شکل میں موجود نہیں۔ اس تفصیل کو تم معراج انسانیت "کے پہلے باب میں خود دیکھ چکے ہو)

اور چونکہ قرآن کے علاوہ خدا کا صحیح تعارف و تصور کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اس لئے قرآن کا پیغام تمام دنیا میں بے مثل و بے نظیر ہے۔ ذہن انسانی کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اس خدا کا تصور پیدا کر سکے جسے قرآن نے پیش کیا ہے اس لئے کہ (جیسا کہ تم اوپر دیکھ چکے ہو، ذہن انسانی کے پیدا کردہ خدا کا تصور، انفرادی اور (Subjective) ہوتا ہے۔ موجود فی الخارج (Objective) خدا کا تصور نہیں ہوتا۔

کچھ سمجھے؟

* * *

اب ایک قدم اور آگے بڑھو سلیم:

دنیا میں کوئی دو انسان جب اپنی زندگی کا نصب العین ایک ہی مقرر کر لیں یعنی ان کے سامنے نمونہ (Pattern) ایک ہی ہو، تو ان انسانوں میں قلب و نگاہ کی ہم آہنگی کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ اسی کا نام وحدتِ فکر و نظر ہے۔ لہذا جب تمام نوعِ انسانی کے سامنے ایک ہی نمونہ (Pattern) ہو تو تمام افراد انسانیہ میں وحدتِ فکر و نظر پیدا ہو جائے گی۔ بالفاظِ دیگر، توحید کا لازمی نتیجہ وحدتِ انسانیت ہے۔ اس کے سوا وحدتِ انسانیت کا اور کوئی ذریعہ ہی نہیں ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون (۲۳/۵۱)

یہ بھی ظاہر ہے سلیم! کہ جب ہم نے خدا کی صفات کو اپنے سامنے بطور نمونہ (Pattern) رکھا ہے تو ان صفات، یا اسماء الحسنیٰ (Various Aspects of Reality) کے متعلق

ہمیں پوری پوری معلومات ہونی چاہئیں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ ہم میں کون کون سی صفات نشو و نما پا رہی ہیں اور کونسی صفات ہنوز خوابیدہ یا خام ہیں۔ اس کا نام ہے تعلیم الکتاب، یعنی قرآن کا علم (یعلمھم الکتاب) علم سے مراد محض کتاب کا پڑھنا نہیں بلکہ اس کے نقوش کو دل کی گہرائیوں میں مرتسم کر لینا ہے اسے کہتے ہیں تدریس (بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون) جب کسی راستہ پر کثرت سے چلنے سے پاؤں کے نشانات پڑ جائیں تو اس راستہ کو طریق مدروس (پگڈنڈی) کہتے ہیں۔ یعنی ممارست (مشق پیہم) سے دل میں گہرے نقوش پیدا کر لینا تاکہ تعلیم کتاب تحت الشعور میں جاگزیں ہو جائے۔ خود قرآن کے بھی یہی معنی ہیں، سلیم! قراء کہتے ہیں کسی چیز کو سمٹا کر سنبھال کر، حفاظت سے رکھنا، جس طرح اونٹنی اپنے رحم میں تخم اور جنین کو رکھتی ہے۔ چنانچہ قرء کے معنی حمل کے ہوتے ہیں اور ناقۃ قارئ حاملہ اونٹنی کو کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن اس وقت قرآن بنتا ہے جب اس شجر طیب کا تخم صالح، دل کی گہرائیوں میں قرار پذیر ہو جائے۔

⁂

اس سے تم سمجھ گئے ہو گے سلیم! کہ دین میں خدا پر ایمان کی اہمیت کیا ہے! یہ وہ بنیاد ہے جس پر انسانی زندگی کی ساری کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے اور چونکہ دین نام ہی اس اسلوب و انداز کا ہے جس کے مطابق زندگی بسر کی جائے، اس لئے خدا پر ایمان کے بغیر صحیح زندگی بسر کرنے کا تصور ہی ممکن نہیں۔ جس قسم کا نمونہ (Pattern) اسی قسم کی انسانی زندگی۔ جس قسم کا نصب العین اسی قسم کے اعمال۔ اس لئے کہ عمل نام ہے حصول نصب العین کے لئے جد و جہد کا۔ یہاں ذریعہ اور مقصد (Means And Ends) میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ تمہیں یاد ہے سلیم! اگلے دنوں تم نے Ferdinand Lassalle) کا ایک اقتباس نقل کیا تھا جس میں وہ کہتا ہے کہ

> ایسا نہ ہو کہ ہمیں نصب العین کا پتہ تو دیدو لیکن اس تک پہنچنے کی راہ نہ بتاؤ،
>
> اس لئے کہ دنیا میں ذرائع اور مقاصد اس طرح باہمد گر گتھے ہوئے ہیں کہ اگر ایک کو بدل دیا جائے تو دوسرا

خود بخود بدل جاتا ہے۔ ہر مختلف راہ، مختلف منزل کی طرف نشان دہی کرتی ہے۔

اس لئے خدا پر صحیح ایمان ہی صحیح اعمال کا موجب بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے سلیم! کہ قرآن نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ اگر خدا پر صحیح ایمان نہیں ہے تو تمہارے اعمال کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے اولٓئک حبطت اعمالھم یہ ہر رنگ کی "خدا پرستی" میں "نیک عملی" کی راہیں بتانے والے "برہمو سماجی مسلمان" کیا جانیں کہ قرآن کی رو سے "خدا پرستی" کسے کہتے ہیں اور "نیک عملی" کیا ہوتی ہے[1]۔ یاد رکھو سلیم! سفر اور آوارگی دونوں میں قدم تو یکساں اٹھتے ہیں۔ لیکن ایک میں ہر قدم جانب منزل اٹھتا ہے۔ اس لئے کچھ وقت کے بعد مسافر منزل تک پہنچ جاتا ہے اور دوسرے میں فقط قدم اٹھتے ہیں، منزل کوئی بھی سامنے نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں سوائے تکان اور درماندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اولٓئک حبطت اعمالھم

* * *

اسی مقام پر اس اہم حقیقت کو بھی سمجھ لو سلیم! کہ انسان کے اندر ان صفاتِ خداوندی کی تربیت، تکمیل اور نشوو نما، معاشرہ (اجتماعی نظام) کے بغیر ناممکن ہے۔ خودی (انسانی ذات، یا انسان کے اندر صفاتِ خداوندی) کی بیداری اور نمود کا مقام ہی وہ ہوتا ہے جب انسان کا واسطہ کسی دوسرے انسان سے پڑے اور یہی وہ محک (کسوٹی) ہے جس پر انسان اس حقیقت کو پرکھ سکتا ہے کہ اس کی خودی کس حد تک بیدار ہو چکی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی خودی (Personality) اپنی ذات میں یکتا (Unique) ہے لیکن اس کی تربیت ہمیشہ اجتماعی نظام میں ہوتی ہے۔ بقول اقبالؒ

زندگی انجمن آرا و نگہ دارِ خود است
اے کہ در قافلہ بے ہمہ شو با ہمہ رو

---

[1] ہمارا ہمہ اوست کا عجمی تصوف جو "رام اور رحیم" کو ایک ہی بتاتا ہے اور ابو الکلام صاحب آزاد کے انداز کے مفسر جو کہتے ہیں کہ خدا پرستی اور نیک عملی کی عالمگیر صداقتیں ہر مذہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اسی زمرے میں شامل ہیں۔ اسی قسم کی آوازیں اب پاکستان کے بعض گوشوں سے بھی اٹھنی شروع ہو گئی ہیں۔

"یہ بے ہمہ شدن" انسانی ذات کی یکتائی ہے۔ (کیونکہ یکتائی خودی کی بنیادی خصوصیت ہوتی ہے) اور "باہمہ شدن" جماعتی زندگی ہے جس کے بغیر تربیت خودی ناممکن ہے۔ اسی لئے قرآن، انسانی تکمیل ذات کے لیے اجتماعی زندگی کو لاینفک قرار دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں ہر فرد، دوسرے فرد کی خودی کی ربوبیت (پرورش، تکمیل و نمود) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہ معاشرہ ربانیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے صرف بدن ہی ایک جگہ نہیں ہوتے۔ بلکہ قلوب باہمدگر پیوست ہوتے ہیں۔ اس معاشرے میں ہر فرد دوسرے کے لئے جیتا ہے اور اسے ہر مقام پر اپنی ذات پر ترجیح دیتا ہے۔ ویؤثرون علیٰ انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ (۵۹/۹) اس قسم کا باہمی ربط (یعنی ایسے معاشرے کی تشکیل) بھی صرف اس ایمان کے ذریعہ ممکن ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یعنی اس امر کا یقین محکم کہ تمام معاشرہ کا نصب العین ایک ہے اور ہر فرد، دوسرے فرد کی ربوبیت کو اپنا فریضہ زندگی سمجھتا ہے۔

* * *

اس مقام پر تمہارے دل میں لازماً یہ خیال پیدا ہوگا سلیم! کہ کیا خدا کا ہمارے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کی تکمیل کے لئے اس کی صفات کو بطور نمونہ سامنے رکھا ہے؟ اتنا ہی تعلق نہیں۔ یہ تو اس تعلق کا صرف ایک گوشہ ہے۔ اب دوسرا گوشہ تمہارے سامنے آتا ہے لیکن دیکھنا کہیں پھر سو نہ جانا۔ بات بڑی اہم ہو رہی ہے۔

ذات (Personality) کی خصوصیت کبریٰ (Main Characteristic) استغناء (Independence) اور حریت و صمدیت (Freedom) ہے۔ استغناء یعنی بغیر کسی خارجی سہارے کے از خود موجود رہنا۔ اپنی ذات میں کسی کا محتاج نہ ہونا۔ اور حریت کامل اختیار و ارادہ کا مالک ہونا۔ خدا جو ذات مطلق ہے وہ انتہائی شکل میں "غنی حمید" اور "صمد" ہے۔ لیکن ہر ذات (PERSONALITY) اپنی نمود کے لئے، خود اپنے اوپر خود کچھ قیود (Self-imposed limitations)

عائد کر لیتی ہے۔ خدا نے بھی اپنے اوپر کچھ "قیود" عائد کر رکھی ہیں۔ مثلاً قرآن میں ہے کتب علیٰ نفسه الرحمة (۶/۱۲) "اللہ نے اپنے اوپر اشیائے کائنات کی ربوبیت و حفاظت فرض کر رکھی ہے" یہ "کتب علیٰ نفسہٖ" (اپنے اوپر فرض کر لینا) وہی خود عائد کردہ قیود کی مثال ہے۔ ان قیود سے مقصود یہ ہے کہ کائنات کے حالات کا جس قسم کا تقاضا ہو خدا کی طرف سے۔ اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس مشکل مقام کو سمجھنے کے لئے تم یہ کہہ لو کہ خاص حالات میں خدا کی طرف سے خاص ردِ عمل (Re-action) ہوتا ہے۔ اسے قانون خداوندی کہا جاتا ہے۔ یعنی جیسے حالات، اسی کے مطابق صفتِ خداوندی کا ظہور۔ اور چونکہ صفاتِ خداوندی غیر متبدل ہیں اس لئے قانون خداوندی بھی غیر مبدل، اٹل اور عالمگیر ہوتا ہے لا تبدیل لکلمات اللہ (قانون خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی) لن تجد لسنة الله تبديلا ولن تجد لسنة الله تحويلا (قانون خداوندی میں تبدل و تحول ہرگز نہ دیکھو گے) آفاقی کائنات میں خدا کا یہ قانون ہر شے میں از خود جاری و ساری ہے۔ ان اشیاء کو اس میں کسی قسم کا دخل و اختیار نہیں کل لہٗ قانتون (سب اس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں) لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قانون خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس سے انکار کر دے فمن شاء فليؤمن ومن شاءَ فليكفر یعنی انسان کو اس پر اختیار ہے کہ جس قسم کا جی چاہے عمل کرے لیکن اُسے اس پر اختیار نہیں کہ عمل ایک قسم کا کرے اور نتیجہ دوسری قسم کا پیدا ہو۔ جیسا عمل اسی کے مطابق نتیجہ۔ اس لئے کہ جس قسم کا عمل انسان کی طرف سے ہوتا ہے اسی قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور بطور ردِ عمل ہو جاتا ہے۔ اسے قانون مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ قرآن میں دیکھو ہر مقام پر تمہیں دکھائی دے گا کہ "اگر یوں کرو گے تو خدا یوں کرے گا"۔ یعنی اگر یہ کرو گے تو خدا کا قانون یہ نتیجہ پیدا کر دے گا۔ اگر وہ کرو گے تو وہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ تمہارے ہر عمل کے مطابق خدا کی ایک خاص صفت کا ظہور ہوگا۔ مثلاً خدا کی صفت ہادی۔ راہنمائی کرنے والا ہے۔ اس کے متعلق فرمایا کہ والذين جاهدوا فينا لنهدينهم سبلنا (۲۹/۶۹) جو لوگ ہماری راہ کی تلاش میں جد و جہد کریں گے ہم انہیں اپنی راہوں کی طرف راہنمائی کر دیں گے۔ یعنی اگر کسی کی طرف سے رستہ کی تلاش کی جد و جہد ہوگی تو اُدھر سے خدا کی صفتِ ہدایت کا ظہور ہوگا۔ یا مثلاً ولو ان اهل القرىٰ

اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکٰت من السمآء والارض (۷/۹۶) "اگر بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہتے، تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے" یعنی اگر اُن کی طرف سے ایسا ہوتا تو خدا کی صفتِ رزاقیت موجیں مارتی ہوئی جلوہ بار ہو جاتی۔ ولٰکن کذبوا فاخذنٰھم بما کانوا یکسبون (۷/۹۶) "لیکن انہوں نے اس قانون کی تکذیب کی تو ہم نے انہیں اُن کے اعمال کی سزا میں پکڑ لیا" "انہوں نے یہ کیا تو ہم نے یہ کیا" یہ ہے قانون خداوندی جسے قرآن کی اصطلاح میں "مشیت" کہا جاتا ہے۔ قرآن نے تفصیلاً بتا دیا ہے اور بار بار دُہرا کر بتا دیا ہے کہ اگر چاہتے ہو کہ خدا کی فلاں صفت کا ظہور ہو تو اس کے لئے یہ کرو۔

تم دیکھ چکے ہو سلیم! کہ جس خدا کا تصور مذہب پیش کرتا تھا (یعنی ذہن انسانی کا تراشیدہ خدا) اس میں خدا ہر فرد کی آرزوؤں کے مطابق ڈھلتا ہے۔ اس لئے اس "خدا" کو ہر فرد اپنی طرف جھکانا چاہتا ہے، عمر بخش اپنی طرف، خدا دادا اپنی طرف۔ ہر مقدمے میں۔ مدعی اپنی طرف، مدعا علیہ اپنی طرف۔ مستغیث اپنی طرف، ملزم اپنی طرف تم نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ اس کھینچا تانی میں "خدا کا" کیا نقشہ بنتا ہے۔ لیکن دین میں خدا کا تصور ایک عالمگیر، اٹل، غیر متبدل قانون کا تصور ہے، جو اپنی جگہ پر قائم ہے اور کسی کی طرف نہیں جھکتا۔ ہر عمل اسی قانون کے مطابق نتیجہ خیز ہوتا ہے اور نتیجہ ٹھیک ٹھیک عمل کے مطابق مرتب ہوتا ہے، نہ کم نہ زیادہ۔ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون (۳/۱۶۰) جو انسان جس قسم کا نتیجہ چاہتا ہے وہ خود اس کے مطابق بن جائے۔ نتیجہ خود مرتب ہو جائے گا۔

رمز باریکے بحرفے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است

قانون خداوندی کے ساتھ اس قسم کی ہم آہنگی اور موافقت کو تقویٰ کہتے ہیں۔ جو کسان چاہتا ہے کہ اس کا کھیت سیراب ہو اسے اپنا کھیت پانی کے نشیب کی طرف بنانا ہو گا۔ اس لئے کہ پانی کا عام قانون، نشیب کی طرف بہنا ہے۔ جس نے اپنے کھیت کو پانی کے عالمگیر قانون سے ہم آہنگ کر لیا۔ اس کے سامنے جنّٰت تجری من تحتھا الانھار کا منظر

آجائے گا۔ جس نے اسے فراز کی طرف رکھا۔ (یعنی قانون خداوندی سے انکار کیا اور سرکشی برتی۔ اِسے کفر و عصیان کہتے ہیں۔) وہ سیرابیوں اور شادابیوں سے محروم رہ گیا۔ اس میں نہ کسی کشمکش کی گنجائش ہے۔ نہ کھینچا تانی کا امکان۔ نہ کسی کی سفارش کا کوئی سوال ہے نہ خوشامد کا۔ قانون خداوندی کے یہ طے شدہ فیصلے ہیں جسے قضا کہتے ہیں اور یہ تم جانتے ہی ہو کہ قضا بدلا نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ دعا سے بھی نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ اب تم دعا کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دو گے۔ اس کے متعلق تفصیلی گفتگو تو کسی دوسرے وقت کی جا سکے گی۔ سردست تم اتنا سمجھ لو کہ دعا کے معنی "اللہ واسطے" مانگنے کے نہیں۔ اس کے معنی "بلانے" کے ہیں۔ مثال سے یوں سمجھو کہ تمہارے پیش نظر کوئی معاملہ ہے۔ اس کے لئے تمہارے سامنے کئی ایک راہیں کھلی ہیں۔ بہت سے امکانات (Possibilities) ہیں۔ تم ان امکانات میں سے بیک وقت، صرف ایک امکان ہی کو اختیار کر سکتے ہو۔ زندگی کے ہر دوراہے پر تم صرف ایک ہی طرف مڑ سکتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوراہے پر تمہارا قدم غلط سمت کو اٹھ جائے۔ اس مقام پر تم اپنے دل میں یہ آرزو پیدا کرتے ہو کہ تمہارا قدم صحیح سمت کو اُٹھے۔ تم جس راستے کو اختیار کرو قانونِ خداوندی کے مطابق ہو۔ یعنی تم اپنے سفرِ زندگی میں قانونِ خداوندی کو بلاتے ہو کہ وہ تمہارا رفیقِ راہ بن جائے۔ اسی کو دعا کہتے ہیں۔ یعنی قانون خداوندی کو اپنی رفاقت کے لئے بلانا، اپنی جدوجہد (اعمال) کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی آرزو پیدا کرنا۔ اس لئے دعا، خدا کا قانون (قضا) نہیں بدلتا۔ بلکہ انسان اپنے اندر تبدیلی پیدا کر کے اپنے آپ کو قانونِ خداوندی (قضا) سے ہم آہنگ کر لیتا ہے۔

یہاں تک سلیم! خدا کے قانون کی محکمیت (غیر متبدل ہونے) کے متعلق گفتگو تھی۔ اب اس کی عالمگیریت پر غور کرو۔ جس طرح عالمِ آفاق میں خدا کا قانون ہر جگہ یکساں طور پر جاری و ساری ہے، اسی طرح عالمِ انسانی میں بھی اس کا قانون ہر مقام پر یکساں نتائج پیدا کرتا ہے۔ آگ، قطبِ شمالی کے اسکیمو کے لئے بھی اسی طرح وجہ تپش ہے جس طرح افریقہ کے حبشی کے لئے ہوا ساکنۂ برطانیہ کے ناک میں بھی اسی طرح جاتی ہے جس طرح تبت کے چرواہے کی

اس میں نہ جغرافیائی حدود و قیود کی کوئی تخصیص ہے، نہ رنگ اور خون کی کوئی تمیز۔ نہ دولت و ثروت کا کوئی لحاظ ہے نہ منصب و جاہ کی کوئی رعایت۔ یہ قوانین نہ قبائلی ہیں نہ قومی، نہ وطنی ہیں نہ نسلی۔ جو کیفیت ان طبعی قوانین کی ہے یہی حالت اس قانون کی ہے جو عالمِ انسانیت سے متعلق ہے۔ یہ قانون بھی تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں ہے یعنی وہ خدا جس کا تصور اوپر دیا گیا ہے، رب العالمین ہے۔ رب الناس ہے، ملک الناس ہے، الٰہ الناس ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں، کسی قوم، کسی نسل، کسی رنگ کا انسان ہو، جو بھی اس خدا کو اپنا (Pattern) بنا لے گا۔ جو بھی اس کے قانون سے ہم آہنگی اختیار کر لے گا، وہی ربانی بن جائے گا۔ یہ ہے ربانیون کی وہ جماعت، جو قومیت، وطنیت، خون، رنگ، نسل کے اضافی رشتوں سے بالا ہو کر، فی الحقیقت ایک ملتِ واحدہ بنتی ہے۔ اسی لئے قرآن اس جماعت کو فقط مؤمنین کہہ کر پکارتا ہے کیونکہ ان سب میں وجہِ جامعیت اور سببِ اشتراک، اس قانون پر ایمان ہے۔ یہی ایمان ان کی وحدت کی بنیاد ہے۔ یعنی ساری دنیا میں ایک (Pattern) کے مطابق زندگی بسر کرنے والے۔ ایک رنگ میں رنگے ہوئے، ایک قانون کو تسلیم کرنے والے انسانوں کی جماعت۔ یہ ہیں اس خدا کو ماننے والے افراد جس کا تصور، دین (قرآن) نے عطا کیا ہے۔ وہ خدا ہر فرد سے یکساں فاصلے پر ہے، جس طرح دائرے کا مرکزی نقطہ، محیط کے ہر نقطے سے یکساں فاصلے پر ہوتا ہے۔ جو انسان اسے اپنا (Pattern) بنا لے وہ اسے اپنے نزدیک پائے گا۔ **اذا سالک عبادی عنی فانی قریب** (۲/۱۸۶)۔ "میرے بندے جب میرے متعلق سوال کریں تو کہدے کہ میں اُن سے قریب ہوں۔ ان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب (**نحن اقرب الیہ من حبل الورید**) جو شخص اس کے قانون کو اپنی زندگی میں اپنا راہ نما بنا لے گا، وہ قانون ہر وقت اس کا ساتھ دے گا، وہ جس وقت اس قانون کو پکارے گا وہ قانون اس کی پکار کا جواب دے گا۔ **اجیب دعوۃ الداع اذا دعان** (۲/۱۸۶)۔ "میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں"۔ عالمگیر قانون کا یہی خاصہ ہونا چاہیئے عالمگیر ہونے کے علاوہ وہ قانون جزرسی میں ایسا ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں میں پھر جانیوالے

تصورات تک بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ اس کی نتیجہ خیزی کا یہ عالم ہے کہ قلب و جوارح کی کوئی خفیف سی حرکت بھی ایسی نہیں جس کا اثر مرتب ہونے سے رہ جائے۔ من یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرًا یرہ غور کرو سلیم! ایسے خدا پر ایمان (یعنی ایسے قانون کی محکمیت پر یقین) انسان کے دل میں کتنی بڑی خود اعتمادی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر وہ اس قانون کے مطابق کام کر رہا ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے دل میں وسوسہ انداز نہیں ہو سکتی کہ اس کی محنت رائیگاں جائے گی یا اس سے وہ نتیجہ مرتب نہیں ہوگا جو اس کے پیش نظر ہے۔ دنیا بھر کی مخالفتیں اس کے دل میں یہ خدشہ نہیں پیدا کر سکیں گی کہ وہ ناکام رہ جائے گا۔ اس لئے خوف اس کے پاس نہیں پھٹکے گا۔ حزن اس کے قریب نہیں آئے گا وہ (بظاہر) بڑی سے بڑی مایوسی کے عالم میں بھی، دل کے پورے اطمینان کے ساتھ، تبسم فشانیوں کے جلو میں کہدیگا کہ لاتخف ان اللہ معنا "مت گھبراؤ ہمیں ناکامی کیسے ہو سکتی ہے۔ جبکہ ہم قانونِ خداوندی کے مطابق چل رہے ہیں" (اسی روش کا نام قرآن کی اصطلاح میں "فی سبیل اللہ" ہے۔ یعنی قانونِ خداوندی کی راہ) ایسے انسان کو اگر سفر زندگی میں کہیں ناکامی ہوتی ہے تو وہ گھبرا کر خودکشی نہیں کر لیتا بلکہ وہیں رک جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس کا قدم کس مقام سے قانون خداوندی کی راہ سے ہٹ گیا ہے۔ چونکہ قانون خداوندی نہایت واضح صورت میں اس کے سامنے ہوتا ہے اس لئے اسے اس امر کے تعین میں بھی کچھ مشکل نہیں ہوتی کہ اس کا قدم کہاں سے غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تھا۔ وہ اس غلطی کو متعین کر کے لوٹتا ہے اور پھر اُس دوراہے پر آجاتا ہے جہاں سے اس نے صحیح راہ چھوڑی تھی (اسے توبہ کہتے ہیں) اور اس کے بعد پھر قانون خداوندی کے صراط مستقیم پر چل نکلتا ہے۔

کہو سلیم! اس خدا پر ایمان، انسان کے دل میں خدا کی صحیح قدر و قیمت پیدا کرتا ہے یا اُس خدا پر ایمان جسے انسان نے اپنے ذہن سے تراشا تھا اور جس کے حضور منتیں مان مان کر عمر بخش اور خداداد، دونوں اپنے اپنے حق میں مقدمہ کا فیصلہ چاہتے تھے۔ وہ "خدا" جب انسان کی مدد نہیں کرتا تو انسان اس کے ماننے سے انکار کر دیتا ہے (اور انکار کرنا بھی چاہیئے) لیکن یہ خدا (یعنی دین کا خدائے حقیقی جس کا ہمہ گیر قانون اس محکمیت کے ساتھ

کارفرما ہے) اگر کسی کی "مدد" نہیں کرتا، تو اس کا ماننے والا اپنے یقین کو اور پختہ کر لیتا اور سمجھ لیتا ہے، کہ ناکامی اس لئے ہوئی ہے کہ اس کے ہاتھوں سے خدا (کے قانون) کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ یعنی اس کی کامیابی اور ناکامی دونوں خدا (کے قانون) پر ایمان میں پختگی پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے سلیم! کہ اس خدا (کے قانون) پر ایمان سے وہ باہمی کشمکش بھی ختم ہو جاتی ہے جو ذہن انسانی کے تراشیدہ، انفرادی خدا کے ماننے والوں میں پیدا ہوتی ہے۔ انفرادی خدا کی صورت میں، عمر بخش اور خداداد، دونوں اپنی اپنی جگہ خدا کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لیکن خدا کے قانون پر ایمان رکھنے کی صورت میں خدا کی مدد اس کے ساتھ ہو سکتی ہے جو خدا کے قانون سے ہم آہنگ ہو۔ اگر عمر بخش اور خداداد میں باہمی تنازعہ یا مناقشہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو وہ دونوں خدا کے قانون سے الگ ہیں یا ان میں سے (کم از کم) ایک ضرور اس قانون سے مختلف راہ پر گامزن ہے۔ جو شخص خدا کے قانون سے ہم آہنگ نہیں اسے اس قانون سے مدد مانگنے کا حق نہیں۔ اور اگر وہ زبان سے اس کی مدد مانگتا بھی ہے تو بھی اسے اس کی مدد نہیں مل سکتی۔ اس قانون کی تائید و نصرت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ وہ بھی اس قانون سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اگر وہ بھی اس قانون سے ہم آہنگ ہو گیا تو دونوں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے۔ اس لئے ان کا تنازعہ خود بخود رفع ہو گیا۔ (تم نے سلیم! اسکول میں جیومیٹری کا یہ قاعدہ تو پڑھا ہی ہوگا کہ جو چیزیں کسی ایک چیز کے برابر ہوں وہ آپس میں بھی برابر ہوتی ہیں)، عمر بخش قانون خداوندی سے ہم آہنگ تھا لیکن خداداد نہیں تھا۔ اس لئے ان دونوں میں اختلاف و تنازعہ کی صورت تھی۔ جب خداداد بھی اس سے ہم آہنگ ہو گیا تو ان میں کوئی اختلاف یا تنازعہ باقی نہ رہا۔ معاملہ صاف ہو گیا

اب تمہارے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا سلیم! کہ آفاقی کائنات میں خدا کا یہ قانون نہایت واضح، مبین، محکم اور مشہود انداز میں جاری و ساری ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس قانون کی کارفرمائی کہیں نظر نہیں آتی۔ بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ مثلاً خدا کا قانون یہ ہے کہ لا یفلح الظالمون جو قوم حقوق انسانیت میں کمی کرے اس کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ظالمین پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں اور حقوق کی

رعایت رکھنے والے (دیانتدار اور عدل پسند) لوگ ہر جگہ مات کھاتے ہیں۔ آج دنیا کا یہی چلن ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے سلیم! اور بڑی توجہ سے سمجھنے کے لائق۔ اس مقام پر ٹھوکر کھا جانے سے بڑے بڑے اربابِ عقل و فکر کے پاؤں میں لغزش آجاتی ہے۔ تمہیں سمجھانے کے لئے ایک دِقت یہ بھی ہوتی ہے کہ تم سے فلسفیانہ اصطلاحات میں گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں میں نے بہزار کہا کہ زیادہ نہیں تو فلسفہ کے مبادیات سے واقفیت حاصل کر لو۔ لیکن تم نے ایک نہیں سنی۔ لیکن تم سنو بھی کیوں؟ تمہیں کوئی دِقت ہو تو سنو بھی۔ مصیبت تو میرے لئے ہوتی ہے کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ اس لئے جو بات میں چار لفظوں میں بیان کر سکتا ہوں، تمہارے لئے چار صفحے لکھنے پڑتے ہیں۔ بہرحال سنو۔ اور سمجھنے کی کوشش کرو۔

قانونِ کائنات کی بعض موٹی موٹی باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم ہر وقت کارفرما دیکھتے ہیں۔ پانی نشیب کی طرف بہتا ہے۔ آگ حرارت پہنچاتی ہے۔ زمین کی کشش ثقل سے چیزیں نیچے کی طرف گرتی ہیں۔ ہوا سے ہلکی چیز اوپر کی طرف جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس قانون کا وہ حصہ جو ان بدیہیات سے کہیں اہم نازک اور دقیق ہے ایسا ہے کہ جس کے نتائج یوں ہی دیکھتے دیکھتے سامنے نہیں آجاتے۔ نظریۂ ارتقا (Evolution) کے ماہرین سے پوچھئے۔ وہ بتائیں گے کہ کسی ایک نوع میں، ذرا سی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے قدرت کو کس طرح ہزارہا سال تک کروٹیں بدلنی پڑتی ہیں۔ ارتقائی مراحل اس قدر سست رفتاری سے طے ہوتے ہیں کہ گھڑی کی گھنٹوں والی سوئی کی طرح ان کی رفتار محسوس ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ رفتار ہے جس کے پیمانوں کے متعلق قرآن میں ہے کہ خدا کا ایک ایک یوم تمہارے حساب و شمار کی رو سے ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس لئے ارتقائی تبدیلیوں کو نہ کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے نہ کسی ایک فرد کا دماغ .... محسوس کر سکتا ہے۔ ایک فرد کیا، دس دس، بیس بیس نسلوں (Generations) تک بھی یہ تبدیلیاں محسوس شکل میں سامنے نہیں آتیں۔ تبدل و تحول کے اس قانون کو تدریج و امہال کا قانون کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی تبدیلی کی پہلی حالت سے آخری حالت تک کا درمیانی وقفہ۔ تبدیلی تو درحقیقت نقطۂ اولیں سے شروع ہو جاتی ہے لیکن ہم اسے اس وقت محسوس کرتے

ہیں جب وہ مکمل ہو کر مشہود و مرئی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ تمہیں یاد ہے، گزشتہ سردیوں میں جب تم نے پانی چولہے پر رکھا تھا اور میں نے پانچ منٹ کے بعد پوچھا تھا کہ کیا پانی گرم ہو گیا۔ تو تم نے کہا تھا کہ ابھی کہاں؟ اس پر میں نے کہا تھا کہ سلیم! بات سوچ کر کرو۔ اس پانچ منٹ میں پانی یقیناً گرم ہو گیا ہے۔ لیکن تم اس کی گرمی کو محسوس نہیں کر رہے۔ تھرمامیٹر رکھ کر دیکھو۔ اس کی گرمی محسوس ہو جائے گی۔ اسی کا نام قانون تدریج و امہال ہے۔ یعنی تبدیلی کا بتدریج واقعہ ہونا۔ عمل سے نتیجہ کے درمیان مہلت کا وقفہ ہونا۔ اسی کو تاجیل بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی تبدیلی کے ظہور کی مدتِ معینہ۔ وہ میعاد جس میں قطرہ گہر بن جائے۔

جس طرح عالمِ آفاق (Physical Universe) میں یہ قانون جاری و ساری ہے، اسی طرح عالمِ انسانی (یا عالمِ معنویات) میں بھی یہی قانون کارفرما ہے۔ عمل اور اس کے نتیجے کے درمیان انتظار کا وقفہ لازمی ہے۔ قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین)۔ اور جس طرح مادی دنیا میں انتظار کے اس وقفے کے پیمانے بہت وسیع ہیں، اسی طرح نتائجِ اعمال کے یہ وقفے بھی بہت طول طویل ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے کہ یستعجلونک بالعذاب۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر قانونِ خداوندی کے خلاف چلنے سے تباہی و بربادی آتی ہے، تو کہاں ہے وہ تباہی و بربادی؟ ان سے کہو کہ لن یخلف اللہ وعدہٗ۔ زرا انتظار کرو۔ اللہ کا قانون اٹل ہے۔ اس کے ترتیبِ نتائج میں کبھی کوتاہی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے لئے اس کے پیمانے مختلف ہیں۔ وان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون قانونِ خداوندی کے حساب و شمار میں ایک دن، تمہارے ہاں کے ہزار برس کے برابر ہوتا ہے۔ اسی میعاد کو قرآن اجل مسمی اور اجل معدود کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک اور حقیقت بھی ہے۔ عالمِ آفاق میں ہر شے قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لئے وہ اس اجل مسمی (مدتِ معینہ) کو گھٹا بڑھا نہیں سکتی۔ یا یوں کہئے کہ وہ قانون کی نتیجہ خیزی کی رفتار میں کمی بیشی نہیں کر سکتی۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں اس کا بھی امکان ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ قانون نام ہے، کسی خاص واقعہ پر، خدا کی ایک خاص صفت کا مشہود ہونا۔

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ خود انسانوں کے اندر بھی (اپنے پیمانے پر) یہی صفات موجود ہیں۔ اور اگر ان کی تربیت و پرورش ہو جائے تو یہ بھی صفاتِ خداوندی کی طرح مشہود ہوتی اور وہی نتائج پیدا کرتی ہیں۔

اگر انسانوں کا ایسا معاشرہ قائم ہو جائے جس میں افرادِ معاشرہ کی یہ صفات، تربیت پا کر، صفاتِ خداوندی کی طرح، خاص مواقع پر مشہود ہوتی رہیں تو قانونِ خداوندی کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی کی رفتار کئی گنا زیادہ ہو جائے گی یعنی جب انسانوں کی صحیح قوتیں، قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو جائیں، تو یہ قانون اپنی نتیجہ خیزی میں بہت تیز رفتار (سریع الحساب) ہو جاتا ہے۔ یہی مفہوم ہے سلیم! قرآن کی اس آیت کا کہ ان تنصروا اللہ ینصرکم۔ اگر تم قانونِ خداوندی کی مدد کرو گے تو وہ قانون تمہاری مدد کرے گا۔ یہی وہ مقام تھا جس کی طرف (جنگ بدر میں) ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا کہ "تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم خود چلا رہے تھے"۔ کیا بات کہہ گیا ہے غالبؔ کہ

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشود آں ز کمانِ محمدؐ است

قرآنی معاشرے کے افراد، اور قانونِ خداوندی کی اس رفاقت کو قرآن نے "نزولِ ملائکہ" سے تعبیر کیا ہے۔ جنگ بدر میں ان ہی ملائکہ کے نزول کا ذکر ہے۔ اور اسی طرح عام حالات میں بھی جہاں فرمایا کہ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیہم الملٰئکۃ ملائکہ وہ قوتیں ہیں جو قانونِ خداوندی کے مطابق، اعمال کو نتیجہ خیز بناتی ہیں۔ قرآنی معاشرے میں، افرادِ معاشرے کی تربیت یافتہ صفات (روحِ خداوندی) اور ان (ملکوتی) قوتوں میں باہمی توافق ہو جاتا ہے اور اس طرح اس قانون کی نتیجہ خیزی کی رفتار تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے اور نتائج بہت جلد سامنے آ جاتے ہیں۔ ایسے جلد کہ یہ جماعت، اپنے فریقِ مقابل سے، پوری خود اعتمادی سے کہہ سکتی ہے کہ یٰقوم اعملوا علٰی مکانتکم انی عامل۔ "اے میری مخالف قوم! تم جو کچھ کر رہے ہو اپنی جگہ کئے جاؤ۔ میں اپنی جگہ کام میں لگا ہوا ہوں فسوف تعلمون بہت جلد نتیجہ سامنے آ جائے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ من تکون لہٗ عاقبۃ

الدار آخرالامر کامیابی کا انعام کس کے لئے ہے۔ اس وقت تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ خدا کا یہ قانون کس قدر سچا ہے کہ اِنَّہٗ لَا یُفلِحُ الظّٰلِمُون (۶/۱۳۵) ظلم کرنے والوں کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی"۔

یہ ہے طریقہ سلیم! قانونِ خداوندی کے نتائج کو اپنے سامنے مرئی و مشہود دیکھ لینے کا۔ اسے اور واضح الفاظ میں سمجھنا ہو تو دو مثالوں کو سامنے لاؤ۔ کائنات میں خدا کی صفتِ خالقیت کا ظہور ہر آن ہوتا رہتا ہے۔ لیکن تم نظریۂ ارتقاء کے ضمن میں (اوپر) دیکھ چکے ہو کہ ان تخلیقی منازل کی رفتار کس قدر سست ہے۔ بایں ہمہ جب اُدھر سے انسانوں کی صفتِ خالقیت مشہود ہو کر باہر آتی ہے تو وہی تخلیقی عمل نہ صرف یہ کہ بے حد تیز گام ہو جاتا ہے بلکہ اس میں ندرت و تنوع بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ دھوپ میں رکھی ہوئی روئی صرف گرم ہوتی ہے، اس میں شعلہ پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہی دھوپ (انسان کے ساختہ) "آتشی شیشہ" میں سے گذاری جاتی ہے تو ایک ثانیہ میں شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ "پیامِ مشرق" میں تم نے خدا اور انسان کا مکالمہ پڑھا تھا اس میں انسان اپنی انہی شوخ و شنگ ندرت کاریوں کا ذکر کرتا ہے جب کہتا ہے کہ

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی   خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اب اس کے بعد صفتِ ربوبیت کو لو۔ ربوبیت (تربیت) کے معنی تم کئی مرتبہ سن چکے ہو۔ کسی شے کا نقطۂ اولیں سے آخری منزل تک بتدریج اوجِ کمال تک پہنچنا، جس طرح بطنِ صدف میں قطرۂ نیساں آہستہ آہستہ بتدریج، تربیت (پرورش) پاکر گہر بن جاتا ہے۔ لیکن یہ عمل بالکل غیر محسوس اور طول طویل ہوتا ہے۔ اسی لئے تو غالبؔ گرفتہ خاطر ہو کر کہتا ہے کہ ؎

دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اس لئے کہ خدا کے قانون کے مطابق ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

جس طرح صدف میں قطرے کی تربیت ایک خاص اندازے کے مطابق ہوتی ہے اسی طرح جوہرِ انسانیت (خودی) تربیت سے پختگی حاصل کرتے ہیں۔ اگر اس تربیت کو آفاقی قانون کی رفتار پر چھوڑ دیا جائے تو معلوم اس تدبیر کی تکمیل میں کتنی صدیاں لگ جائیں گی

یدبرالامر من السمآء الی الارض۔ ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف
سنۃ مما تعدون (۳۲/۵)

لیکن اگر انسان اپنی معاشرتی زندگی میں نظامِ ربوبیت قائم کر لیں اور ہر فرد، دوسرے فرد کا مربی (ربوبیت دینے والا۔ ربانی) بن جائے تو پھر، پوچھو سرزمینِ حجاز کے انجم آرا ذرات سے، کہ انسانی جوہروں کی تکمیل کس طرح برق رفتاری سے ہوتی چلی جاتی ہے اور "زمین سے آسمان" تک کا یہ سفرِ" معراج کس طرح براق کے کندھوں پر طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس شکل میں خدا کے آفاقی پروگرام کے ساتھ ان تربیت یافتہ انسانوں کا ارضی پروگرام بھی رفیقِ کار بن جاتا ہے اور یوں یہ تمام مراحل کلمحِ البصر طے ہو جاتے ہیں۔ یعنی اس نظامِ ربوبیت کے اندر ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ہر فرد کی محنت اپنا پورا پورا نتیجہ مرتب کرتی چلی جاتی ہے اور اس میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہونے پاتی

ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون (۳/۱۶۰)

اب ذرا تم سلیم! توحید کے اس پہلو کو انسانی معاشرے کے سامنے لا کر دیکھو کہ اس میں انسانی خوشگواریوں اور ارتقائی ندرت کاریوں کی کتنی جنتیں پوشیدہ ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسان امن کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ہر فرد ہر گروہ، ہر جماعت، ہر قوم، تلاشِ امن میں مارے مارے پھر رہی ہے۔ جس سے پوچھو وہ یہی کہے گا کہ امن نصیب نہیں۔ انسان اپنے ہزارہا سال کے تاریخی تجارب کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حقیقی امن صرف اس معاشرے میں مل سکتا ہے جس میں زندگی آئین و قوانین کے مطابق بسر ہوتی ہو۔ جس سرزمین میں بے آئینی کا دور دورہ ہو،

وہاں شہنشاہ سے لیکر ایک ادنیٰ مزدور تک کسی کی زندگی امن سے نہیں گزر سکتی۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قدر کوئی فضا پُر امن ہوگی اُس میں اسی قدر انسانی صلاحیتوں کے اُبھرنے اور نشو و نما پانے کے مواقع زیادہ ہوں گے۔ چنانچہ دنیا کی مختلف قوموں پر غور کرو جس ملک میں زندگی آئین کے مطابق بسر ہوتی ہے وہاں کی قومیں، دماغی صلاحیتوں میں دوسری قوموں سے آگے ہوتی ہیں۔ آئین کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو معلوم ہو کہ فلاں کام کا نتیجہ یہ ہوگا۔ اگر یہ کیا جائے گا تو اس کا مواخذہ یوں ہوگا۔ اگر ان ان چیزوں کی پابندی کی جائے گی تو اس پر کسی قسم کی کوئی گرفت، کوئی سختی، کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ اس کی جان، مال، آبرو، سب کچھ محفوظ رہے گا۔ امن کا احساس، ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینک دیتا ہے جن میں انسان کے اعصاب جکڑے رہتے ہیں۔ جس قدر زندگی آئین و قوانین کے مطابق بسر ہوگی اسی قدر انسان کو آزادی میسر ہوگی۔ یہ حالت دنیاوی آئین و قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے کی ہے جن میں کوئی محکمیت .... نہیں ہوتی۔ اگر جمہوری نظام ہے تو جب بھی اکثریت آراء ایک طرف ہو گئیں قانون بدل گیا۔ اگر شخصی حکومت ہے (خواہ بادشاہت کی خواہ آمریت کی)، تو اس میں قانون نام ہی صاحب اقتدار کے مزاج کا ہوتا ہے۔

اب اس کے برعکس اس قانون کو سامنے لاؤ جو توحید کی رو سے مرتب ہوتا ہے۔ اس قانون سے مفہوم یہ ہے کہ

(i) تمام کائنات میں ایک ہی قانون رائج ہے جو انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کرتا۔

(ii) یہ قانون، ہر دوسرے قوانین پر غالب رہتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون بھی اسے شکست نہیں دے سکتا۔

(iii) یہ قانون اس قدر محکم، اٹل، غیر متبدل اور یقینی طور پر نتیجہ خیز ہے کہ اس میں کسی قسم کی غلطی، سہو یا لغزش کا امکان ہی نہیں۔ قانون کی محکمیت کا یہ عالم ہے کہ انسانوں کو تو اجازت ہے کہ وہ جس قسم کی روش چاہیں اختیار کر لیں لیکن قانون کو یہ اجازت نہیں کہ وہ جس قسم کا چاہے نتیجہ پیدا کر دے۔ جس قسم کی روش انسان اختیار کریں گے قانون مجبور ہے کہ اس کے مطابق نتیجہ بر آمد کرے۔

(۱۷) اس میں ان انسانوں کو بھی کسی ردو بدل کی اجازت نہیں جن کے ہاتھوں سے یہ قانون نفاذ پذیر ہوتا ہے نہ اس میں کسی کی سفارش چلتی ہے نہ کسی کی رو رعایت ہوتی ہے۔ نہ کسی پر زیادتی ہوتی ہے۔ نہ کوئی بے گناہ پکڑا جاتا ہے۔

اب سوچو سلیم! کہ جس معاشرے میں اس قسم کا قانون نافذ ہوگا اس میں امن و سکون کا کیا عالم ہوگا؟ اس معاشرے میں خوف و حزن کا دخل تک نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص جو قانون کی پابندی کرے گا، ہر قسم کے خوف سے آزاد ہوگا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ من تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون جس نے قانون خداوندی کی پابندی کر لی، وہ خوف و حزن سے مامون ہوگیا۔ اللہ اکبر! کتنی بڑی ہے یہ ضمانت (Security) جس معاشرے میں انسانوں کو اس قسم کا امن نصیب ہو جائے تو ان کی خوابیدہ قوتیں کس قدر بیدار اور مضمر صلاحیتیں کتنی جلدی مشہود ہو جائیں گی! انسانی اعصاب سے بے آئینی کے خوف کا بوجھ اتار دیجئے۔ اس کی صلاحیتیں خود بخود ابھرنی شروع ہو جائیں گی۔ یہ تھا حقیقی سبب، سلیم! اس کا کہ نبی اکرمؐ نے اتنی مختصر سی مدت میں، نہ صرف تمدن کی دنیا میں، بلکہ خود انسانی قلوب کی بستیوں میں اس قدر محیر العقول انقلاب پیدا کر دیا۔ آپ نے اس باب میں کیا کیا تھا؟ انسانوں تک خدا کا قانون پہنچا دیا اور اس قانون کو اس معاشرے میں نافذ کر دیا۔ انسانوں میں سب سے بڑی شخصیت خود رسول اللہؐ کی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے اعلان کر دیا کہ میری حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ قانون کے متبع کی ہے انا اول المسلمین۔ میں خود سب سے پہلے اس قانون کی اطاعت کرتا ہوں۔ تم ہمیشہ اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھو کہ لا الہ الا اللہ قانون صرف ایک خدا کا ہے۔ کسی اور کا نہیں محمد رسول اللہ۔ اور تو اور، انسانوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہستی (محمدؐ) کی پوزیشن بھی اتنی ہی ہے کہ وہ اس قانون کا انسانوں تک پہنچانے والا ہے۔ اسے بھی کوئی حق حاصل نہیں کہ کسی پر اپنا حکم چلائے۔ خدا اپنے قانون میں کسی کو شریک نہیں کرتا ولا یشرک فی حکمہ احدا۔ جب لوگوں کو اس امر کا یقین ہوگیا کہ یہاں فی الواقعہ اطاعت قانون کی ہے اور قانون بھی ایسا جس میں کوئی انسان کسی قسم کا ردو بدل نہیں کر سکتا، تو اُن کے دل و دماغ سے وہ تمام بوجھ اتر گئے جن کے نیچے

وہ دب رہے تھے (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم) جب اس طرح بوجھ اتر گئے تو انسانی روحیں آزاد ہو گئیں اور ان کی قوتوں نے پھولنا پھلنا اور نشوونما پانا شروع کر دیا اور چند دنوں میں وہی اونٹ چرانے والے بہترین انسانی صلاحیتوں کے مالک بن گئے۔ مغرب کے مؤرخین عمر بھر تحقیق کرتے رہتے ہیں اور پھر بھی سمجھ نہیں پاتے کہ نبی اکرمؐ نے ایسا محیر العقول انقلاب پیدا کس طرح کر دیا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس معاشرے میں آئینی زندگی کا امن پیدا ہو گیا تھا اور اس امن کا لازمی نتیجہ انسانی صلاحیتوں کی نشوونما تھا۔ انسان کے اندر بے پناہ قوتیں موجود ہیں۔ جب وہ قوتیں اس طرح یک لخت ابھر کر بروئے کار آجائیں تو ان کی رو سے پیدا شدہ انقلاب کا کیا ٹھکانہ ہے۔ جن انسانوں کی صلاحیتیں یوں نمودار ہو جائیں وہ (عام الفاظ میں) انسان نہیں رہتے، کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ ان انسانوں کا مقابلہ وہ لوگ کبھی نہیں کر سکتے جن کی صلاحیتیں دبی ہوئی ہوں۔ ہم —— غلام ابن غلام ابن غلام —— اس کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں سلیم! کہ نشوونما یافتہ صلاحیتیں انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہیں؟ ہمارے نصیب میں ساری زندگی میں ایک سانس بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس میں ہم کہہ سکیں کہ ہم پر قانون خداوندی کے علاوہ اور کسی کی حکومت نہیں۔ یہ اتنی بڑی سعادت تھی کہ جب وادئ ضجنان میں حضرت عمرؓ کا گزر ہوا تو وہ سواری سے اتر کر سجدہ ریز ہو گئے۔ ساتھیوں نے پوچھا یہ کونسا مقام سجدہ تھا؟ فرمایا کہ عمرؓ اس میدان میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ ایسا سخت گیر تھا کہ مار مار کر کھال ادھیڑ دیا کرتا تھا۔ ایک وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے کہ

عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں۔

سلیم! آج سارے روئے زمین پر کوئی ایک فرد بھی ایسا ہے جو چھاتی پر ہاتھ رکھ کر عمرؓ کی ہمنوائی میں کہہ سکے کہ

میرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں۔

یہ تھی وہ حقیقی حریت اور آزادی جو آئین کی سچی پابندی نے ان لوگوں کو عطا کر دی تھی اور اسی آزادی کا نتیجہ تھا کہ اونٹ چرانے والا عمرؓ دنیا کی ممتاز ترین شخصیت قرار پا گیا۔ اور، ایک حضرت عمرؓ ہی پر کیا موقوف۔ وہ معاشرہ

پورے کا پورا اُمّتِ وسطیٰ (بین الاقوامی قوم) کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس حریت بخشی میں خود تربیتِ نبوی کا کتنا بڑا حصہ تھا، اس کی تفصیلات تم "معراج انسانیت" میں پڑھ چکے ہو۔ اس لئے اس خط میں اُن کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ دو لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ حضورؐ نے اپنی ساری عمر میں، قوانین خداوندی کے نفاذ سے الگ، کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اپنی طرف سے نہیں منوائی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حضورؐ کسی سے کچھ فرماتے تو (دنیاوی نقطۂ نگاہ سے) ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی آزادی سے، یہ پوچھ لیتا کہ یہ خدا کا حکم ہے یا آپؐ کی اپنی رائے ہے۔ اور اگر آپ فرماتے کہ نہیں یہ میری اپنی رائے ہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ دیتا کہ میں اپنے معاملہ کو بہتر سمجھتا ہوں اس لئے آپ کی رائے کو نہیں مان سکتا۔ ایسا کہنے پر نہ تو کہنے والے کے دل میں کبھی گمان تک بھی گزرتا کہ اس "عدول حکمی" کا نتیجہ کیا ہوگا اور نہ ہی اس رائے دینے والے کے دل میں اس کا خیال تک بھی آتا کہ اس نے میری بات نہیں مانی۔

یہ ہے سلیم! قرآنی معاشرہ میں توحید کے آئینی پہلو کا عملی اثر!

* * *

یہ ہے سلیم! وہ خدا جس پر ایمان لانے کا مطالبہ قرآن کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو پھر دہرا لو کہ یہ خدا کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ ایک موجود فی الخارج (Objective) ذات ہے جسے حقیقتِ مطلق (Absolute Reality) کہا جاتا ہے۔ اس خدا کا تعارف ان صفات کی رو سے ہوتا ہے جو اس نے خود وحی کے ذریعے بیان کر دی ہیں۔ اور یہ وحی آج اس آسمان کے نیچے صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس خدا کی صفات ایک طرف انسان کے لئے زندگی کا نمونہ (Pattern) بنتی ہیں اور دوسری طرف ان کا نور اس عالمگیر قانون کی صورت میں ہوتا ہے جو رگِ کائنات میں خونِ زندگی کی طرح جاری و ساری ہے۔ یہی وہ خدا ہے جس پر ایمان کا مطالبہ تمام نوعِ انسانی سے کیا جاتا ہے، بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ (از خود) خدا کے ماننے کے مدعی ہیں یا نہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت، عرب میں اہلِ کتاب بھی موجود تھے (یہود و نصاریٰ) جو خدا کو ماننے کے مدعی تھے اور ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو بلا مذہبی گروہ بندیوں کے

لیبل کے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ (عربوں کی تاریخ میں اُنہیں حنفاء کے نام سے پکارا جاتا ہے[1]) قرآن کہتا ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ ہوں، جو مذہبی گروہ بندیوں میں جکڑے ہوئے خدا پر ایمان کے مدعی ہیں۔ یا بلا گروہ بندی کی تخصیص کے خدا کو ماننے والے۔ ان کا خدا پر ایمان، اس خدا پر ایمان نہیں ہے جسے وحی نے پیش کیا ہے اور جو قرآن کے اندر ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے لئے بھی اسی طرح "قرآنی خدا" پر از سرِ نو ایمان لانا ضروری ہے جس طرح ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو خدا کے منکر ہیں۔ اس لئے کہ جہاں تک "قرآنی خدا" کا تعلق ہے ان ماننے والوں کا ایمان اور نہ ماننے والوں کا انکار یکساں ہے۔ جب تک یہ سب قرآن کے بتائے ہوئے خدا پر ایمان نہیں لائیں گے، جوہرِ انسانیت کو تباہ کر دینے والی قوتوں کے اثرات سے محفوظ نہیں ہو سکیں گے۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جب فرمایا کہ

ان الذین امنوا۔ والذین ھادوا۔ والصابؤن۔ والنصاریٰ۔ من امن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحاً فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (5/69)

جو لوگ (بلا مذہبی گروہ بندی کے لیبل کے) خدا کو ماننے کے مدعی ہیں۔ جو لوگ یہودی بن چکے ہیں یا صابی یا نصاریٰ (اور اپنے اپنے اندازوں کے مطابق خدا کو مانتے ہیں۔ ان کا یہ ایمان حقیقی خدا پر ایمان نہیں) ان میں سے جو بھی اس خدا پر ایمان لائے گا جسے قرآن نے پیش کیا ہے اور قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مستقبل کی زندگی پر اور اس کے بعد (قرآنی پروگرام کے مطابق) انسانی صلاحیتوں کو ابھارنے والے کام کرے گا۔ تو یہ وہ لوگ ہیں جو خوف و حزن سے محفوظ و مصئون رہیں گے۔

اسی حقیقت کو دوسری جگہ ان الفاظ میں دہرا دیا کہ (فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا۔ اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، پھر ایسا ہو گا کہ ان پر آگے بڑھنے کی راہیں کھل جائیں گی۔ جن نے

---

[1] اس قسم کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ یورپ کے اکثر مفکرین اپنے آپ کو کسی مذہب کا پیرو نہیں بتلاتے (نہ ہی وہ کسی مذہب کے پیرو ہیں) لیکن خدا کو (اپنے اپنے انداز کے مطابق) مانتے ہیں۔ یعنی یہ نہ یہودی ہیں نہ نصرانی۔ لیکن (اپنے خیال کے مطابق) خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس خدا کو زندگی کا نصب العین بنانے اور اس کے قانون کو ایک عالمگیر قانون تسلیم کرنے سے انکار کر دیا (کفر) یا خدا کے اس تصور کے ساتھ اپنے تصورات بھی ملا دیئے اور اسکے قانون کے علاوہ کسی اور قانون کو بھی کارفرما سمجھ لیا (شرک)، اس پر زندگی کی برومندی کی راہیں نہیں کھل سکتیں۔ یہ ہے سلیم! خدا پر ایمان اور اس سے کفر اور شرک کا مفہوم!

خط بہت لمبا ہو گیا اس لئے تمہارا یہ مطالبہ کہ خدا کی صفات (اسماء الحسنیٰ) کا کچھ اجمالی تعارف کرا دیا جائے اور یہ بھی بتا دیا جائے کہ جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہو گا جن میں ان صفات کی نمود ہو گی، اس میں انسانیت کا انداز کیا ہو گا، کسی دوسرے وقت سہی ؎

مے باقی و ماہتاب باقیست
مارا بتو صد حساب باقیست

والسلام
جولائی سنہ ۱۹۵۲ء

سلیم کے نام اکیسواں خط

...... فقط ایک بار دیکھا ہے!

ہاں سلیم! آسمان کی آنکھ نے ایک مرتبہ وہ دَور دیکھا ہے جب "زمین خدا کے قانونِ ربوبیت کے نور سے جگمگا اٹھی تھی" اور انسان نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ خوابِ زندگی کی تعبیر کیا ہے اور کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کونسی ہے؛ یہ دور وہ تھا جب محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے ہاتھوں نظامِ خداوندی کا تختِ اجلال بچھایا گیا اور انسان نے عملاً محسوس کیا کہ حقیقی آزادی کہتے کسے ہیں! اس میں شبہ نہیں کہ اس دور کا عرصہ بڑا مختصر تھا، اتنا مختصر جو تاریخ کے پیمانوں کے اعتبار سے آنکھ جھپکنے سے زیادہ نہیں کہلا سکتا لیکن اس ایجاز میں وہ تمام تفاصیل سمٹ کر آگئی تھیں جن سے زندگی مرتب ہوتی ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ نہیں کہ اس دور کی مدت اس قدر مختصر تھی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس دور کی پوری پوری اور بلا آمیزش تاریخ ہمارے سامنے نہیں آئی۔ ہماری تاریخ اس دور میں جاکر مرتب ہوئی جب خلافت ملوکیت سے اور ربوبیتِ عامہ مفاد پرستیوں سے بدل چکی تھی۔ جب قرآن جُزدانوں میں بند ہو چکا تھا اور اسلام کی جگہ ان تصورات نے لے لی تھی جو یہودیوں کے ہیکل، عیسائیوں کی خانقاہوں اور مجوسیوں کے آتشکدوں میں تراشے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ جو تاریخ ان حالات میں مرتب ہوئی ہو اس میں اُس دور کی اصلی تصویر کبھی سامنے نہیں آ سکتی تھی

جس دور میں ان تمام تصورات کی بساط اُلٹ کر معاشرہ کی بنیادیں خالص قانونِ خداوندی پر رکھی گئی تھیں۔ اُس دور کا جس قدر خاکہ قرآن نے اپنے دفتین میں محفوظ کر رکھا ہے وہی حتمی اور یقینی کہلا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس میں سے صرف وہی حصہ قابلِ قبول قرار پا سکتا ہے جو قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اس لئے کہ جو معاشرہ قائم ہی قرآن کے خطوط پر ہوا تھا اس میں قرآن کے خلاف کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ہمیشہ اس دور کی تاریخ کے لئے قرآن کو بنیادی معیار قرار دیتا ہوں۔ تم نے "معراجِ انسانیت"[1] کو دیکھا ہے اس میں نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ کے متعلق کتبِ سیر و روایات میں سے بہت کچھ موجود ہے لیکن وہی جو قرآن کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ لہٰذا ہماری تاریخ میں قرآنی نظامِ ربوبیت کا مکمل نقشہ کہیں نہیں مل سکتا۔ اس لئے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ تاریخ اس عہد میں مرتب ہوئی جب نظامِ ربوبیت کی جگہ سرمایہ پرستی اور ملوکیت کے نظام نے لے لی تھی۔ اُس وقت اگر نظامِ ربوبیت کا نقشہ سامنے لایا جاتا تو ہر شخص پکار اٹھتا کہ جو کچھ آج اسلام کے نام پر ہو رہا ہے، اُسے تو اسلامی نظام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس طرح اُس غلط نظام کے حاملین کے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہو جاتا۔ لہٰذا جو تاریخ اُس دور میں مرتب ہوئی تھی اس میں اسلام کا نقشہ اسی قسم کا ہونا چاہیئے تھا جس پر اُس دور کا نظام پورا اُتر آتا تاکہ لوگ سمجھ لیتے کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ اس تاریخ میں البتہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ٹکڑے ایسے مل جاتے ہیں جن کی تابندگی نگاہوں میں چمک پیدا کر دیتی ہے اور جو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ ہم اس فردوسِ گم گشتہ کی حسین یادگار ہیں جس سے آدمؑ نکالا گیا ہے۔ ان ٹکڑوں میں سے سلیم! چند ایک کو تم بھی وجۂ نورانیتِ قلب و نظر بنا لو۔ اس سے زیادہ میں تمہارے لئے اور کیا کر سکتا ہوں۔

حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل
آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

---

[1] میری مبسوط تصنیف جس میں سیرتِ نبی اکرمؐ کو قرآن کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔

ذرا سوچو سلیم! کہ وہ کونسی چیز ہے جس کی انسان کو سب سے زیادہ خواہش رہتی ہے۔ تم تاریخ کے اوراق کو الٹو۔ اقوامِ گذشتہ کے احوال و کوائف پر نظر ڈالو۔ دورِ حاضرہ کی مختلف تحریکوں کا مطالعہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ ایک ہی خلش ہے جس نے انسان کو شروع سے آج تک طلسمِ پیچ و تاب بنائے رکھا ہے۔ ایک ہی تڑپ ہے جس نے اس پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ وہ خلش ہے حصولِ آزادی کی آرزو کی۔ وہ تڑپ ہے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کی۔ انسان نے ہمیشہ آزادی کی دیوی کی پرستش کی ہے۔ اس کے لئے بڑے بڑے مندر بنائے ہیں۔ ہمیشہ اس کی چرنوں میں اپنی شردھا کے پھول چڑھائے ہیں۔ اس کے حضور اپنی عقیدتمندیوں کے گیت گائے ہیں۔ اس کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اس کے نام پر انسان نے اتنا خون بہایا ہے کہ اس کا عشرِ عشیر بھی کسی اور جذبے کے حصے میں نہ آیا ہوگا۔ انسان نے اسے ہمیشہ اپنی ہر متاع سے عزیز سمجھا ہے وہ اس کی حفاظت کی خاطر ہر وقت اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ جن لوگوں نے آزادی کے تحفظ کی خاطر قربانیاں کی ہیں انسان نے اُن کی یادگاریں قائم کی ہیں۔ جو اس کے حصول یا استحکام کے لئے مرے ہیں۔ انہیں ہمیشہ امر (غیر فانی) سمجھا ہے۔ یہی کچھ انسان شروع سے کرتا آیا ہے۔ اور یہی کچھ انسان آج بھی کر رہا ہے۔ لیکن سلیم! تم یہ سُن کر حیران ہو گے کہ آزادی کی خاطر یہ کچھ کرنے والا انسان آج تک اس چیز کو متعین نہیں کر سکا کہ آزادی کہتے کسے ہیں۔ بظاہر یہ بات بڑی اعجوبہ سی دکھائی دیگی، لیکن اگر تم ذرا بنگاہِ تعمق غور کرو تو تم خود محسوس کرو گے کہ آزادی کی کوئی جامع تعریف (DEFINITION) فی الواقعہ سامنے نہیں آتی۔ جنہیں یہ دعویٰ ہے کہ اُن کے ہاں بڑی آزادی ہے، وہاں بھی قدم قدم پر پابندیاں ہیں۔ پابندیوں کے بغیر انسان کی اجتماعی زندگی کا تصور ناممکن ہے۔ سرو کو لاکھ "آزاد" کہیں، اس کی ہستی اور بقا کے لئے اس کا پا بگِل ہونا ناگزیر ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھو سلیم! تو نظر آئے گا کہ انسانی معاشرہ کا بنیادی تقاضا آزادی نہیں پابندی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان آزادی کی خاطر جان دیتا ہے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پابندی اور آزادی کے ان دو متضاد اور باہمدگر نقیض تقاضوں میں موافقت اور مطابقت کی صورت

گیا ہے: یہ وہ سوال ہے جو ہمیشہ سیاسی مفکرین کے لئے الجھاؤ کا باعث رہا ہے۔ چنانچہ ایک مدت کی ذہنی کشمکش کے بعد، ہمارے زمانے کے مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آزادی کے معنی ہیں قانون کی اطاعت۔ یعنی انسان کی اطاعت نہیں بلکہ قانون کی اطاعت۔

اگر سلیم! کوئی یہ پوچھے کہ وہ کونسی چیز ہے جو انسان کو دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی تھی اور اسے صرف اسلام نے آکر دیا، تو اس کے جواب میں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے انسان کو وہ آزادی عطا کی ہے جو اسے کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی تھی۔ اس نے رسول اللہ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ ویضع عنہم اصرہم والاغلال التی کانت علیہم آپ کی تشریف آوری کا مقصد یہ ہے کہ انسانیت کے سر سے اس بوجھ کو اتار دیا جائے جس کے نیچے وہ دبی چلی آرہی تھی اور اسے ان زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے جن میں وہ جکڑی ہوئی تھی۔ انسان کو انسانوں کی خود ساختہ، اور خود عائد کردہ قیود و سلاسل سے آزاد کرانا یہ ہے قرآن کا مطلوب۔ اس کے ساتھ ہی سلیم! تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ قرآن نے اس سوال کو بھی لاینحل نہیں رہنے دیا کہ آزادی کسے کہتے ہیں۔ اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے (جب دنیا آزادی کے تصور سے قطعاً نا آشنا تھی) اس کا اعلان کر دیا کہ آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ کسی انسان سے کسی دوسرے انسان کی اطاعت نہ کرائی جائے۔ ہر شخص قانون کی اطاعت کرے اور قانون بھی انسانوں کا خود ساختہ نہ ہو بلکہ خدا کی طرف سے عطا فرمودہ ہو۔ چنانچہ اس نے اس باب میں یہاں تک کہدیا کہ اور تو اور خود رسول کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانوں سے اپنی اطاعت کرائے۔ وہ خود بھی قانونِ خداوندی کی اطاعت کریگا۔ اور دوسروں سے بھی اس قانون کی اطاعت کرائے گا۔

ماکان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس
کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون
الکتاب وبما کنتم تدرسون (۳/۷۸)

کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ خدا اسے کتاب و حکومت و نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے

> کہ تم قانونِ خداوندی کی نہیں بلکہ میری اطاعت کرو۔ اسے صرف یہ کہنا چاہیئے کہ تم سب اللہ کے اس ضابطۂ قوانین کی رُو سے ربانی بن جائے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کی تعلیم کو تم اپنے دلوں پر نقش کرتے ہو۔

لیکن سلیم! کہنے کو تو یہ بڑا آسان ہے (اور آج ساری دنیا یہی کہتی ہے کہ) اطاعت صرف قانون کی ہونی چاہیئے۔ لیکن جب یہ چیز عمل میں آتی ہے تو پھر اس میں ایسی دشواری پیش آتی ہے کہ شاید ہی کوئی مقام ایسا رہ جائے جہاں انسانوں کی اطاعت نہ ہوتی ہو، بلکہ اطاعت صرف قانون کی ہوتی ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون کا نفاذ انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ اس لئے نام تو قانون کا ہوتا ہے لیکن درحقیقت حکومت ان انسانوں کی ہوتی ہے جو قانون کو نافذ کرتے اور اس کے مطابق فیصلے دیتے ہیں۔ لہٰذا انسانی آزادی میں سب سے بڑا (اور مشکل) مرحلہ یہ ہے کہ قانون کو نافذ کرنے والے، دوسروں سے اپنی اطاعت نہ کرائیں بلکہ قانون کی اطاعت کرائیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر سمجھو کہ انسان کو صحیح آزادی حاصل ہے۔ ورنہ آزادی صرف نام کی ہوگی۔ انسانوں پر حکومت دوسرے انسان ہی کر رہے ہوں گے۔ اور اسی کا نام محکومی اور غلامی ہے۔

تم نے اندازہ لگایا ہوگا سلیم! کہ صحیح آزادی کے لئے ضروری ہے کہ قانون کا نافذ کرنے والا اپنی ذات کو قانون سے الگ رکھے۔ قانون کے نفاذ میں اس کے ذاتی میلانات و عواطف کو کوئی دخل نہ ہو۔ وہ اپنی ذاتی حیثیت کو دوسرے انسانوں سے ذرا بھی ممتاز نہ ہونے دے۔ دوسرے انسانوں کو اس کا خیال تک بھی نہ آنے دے کہ یہ (قانون کا نافذ کرنے والا) ہم سے ذرا بھی اونچا ہے۔ یہ ہے وہ کام سلیم! جو محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے کر کے دکھایا۔ جہاں قرآن نے پہلی مرتبہ انسانوں کے سامنے آزادی کا صحیح تصور رکھا، وہاں قرآن کو نافذ کرنے والوں نے بھی پہلی بار (اور اس کے بعد اس وقت تک آخری بار) دنیا کو یہ ثابت کر کے دکھایا کہ قانون کو نافذ کرنے والوں کو کس طرح اپنی ذاتی حیثیت کو قانون سے یکسر الگ رکھنا چاہیئے۔ وہ تھا قرآن کا پیغام، اور یہ تھا قرآن کو نافذ کرنے والوں کا عمل وہ بھی بے مثل و بے نظیر اور یہ بھی بے مثل و بے نظیر۔ یہی ہے وہ نکتہ سلیم! جس کی وضاحت کے لئے میں ان حضرات (علیہم السلام) کے تذکارِ جلیلہ سے چند بکھری ہوئی پنکھڑیاں، وجہِ تزئینِ اوراق بنانا چاہتا ہوں۔ انہیں

غور سے دیکھو۔ بظاہر یہ چھوٹے چھوٹے واقعات نظر آئیں گے، لیکن ان چھوٹے چھوٹے واقعات میں تمہیں وہ اصولی نکتہ (جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے) جھلمل جھلمل کرتا نظر آجائے گا۔

⁂

پہلے ذرا رسول اللہؐ کے مقام کو سامنے لاؤ۔ ان کی سب سے بڑی اور مقدم حیثیت تو یہ تھی کہ وہ خدا کے رسول تھے جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان ہی نہیں ہو سکتا تھا (نہ ہو سکتا ہے) کسی انسان کے لئے اس سے بڑھ کر عزت اور عظمت کا مقام اور کونسا ہو سکتا ہے؟ نیز آپ ایک عظیم الشان مملکت کے صدر اعظم تھے۔ اس منصب امارت میں آپ کی حیثیت یہ تھی کہ آپ کے فیصلے مرکزِ ملت کے آخری فیصلے تھے جن کے خلاف کہیں اپیل نہیں ہو سکتی تھی یعنی آپ مملکت میں (Final Authority) کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ آپ کی ایک حیثیت بشریت کی بھی تھی۔ یہ سہ گونہ حیثیتیں اس ایک ذات میں مرکوز تھیں جس نے نوعِ انسانی کو سکھانا تھا کہ حقیقی آزادی کسے کہتے ہیں۔ یعنی یہ سکھانا تھا کہ اطاعت صرف قانون کی ہو سکتی ہے، قانون نافذ کرانے والا اپنی ذات کی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ افرادِ ملت کے دلوں پر اس حقیقت کو ثبت کر دیا جائے کہ قانون نافذ کرنے والا، اپنی ذاتی حیثیت میں، ان ہی جیسا انسان ہوتا ہے۔ اسے ان پر کوئی فوقیت اور افضلیت حاصل نہیں ہوتی۔ دیکھو سلیم! حضورؐ نے اس مشکل ترین منصب کو کس طرح نبھایا۔ اور اتنی بڑی بلندیوں پر ہونے کے باوجود، کس طرح قدم قدم پر اس کا خیال رکھا کہ کسی کو اس کا احساس تک نہ ہونے پائے کہ آپ ان ہی میں سے نہیں ہیں۔

دیکھو سلیم! یہ ایک سلطنت کا فرمانروا ہے اور دیوار کے سائے تلے بیٹھا اپنا جوتا آپ گانٹھ رہا ہے۔ ایک رفیق نے کہا کہ لائیے، جوتا میں گانٹھ دوں تو ایک تبسمِ جنت فروش سے فرمایا کہ نہیں! ہر شخص کو اپنا کام آپ کرنا چاہیئے۔

یہ دیکھو مدینے کے گرد ایک حفاظتی خندق کھد رہی ہے اور عام مسلمانوں کے ساتھ اُن کا امیر مملکت بھی

مزدوروں کی طرح کام کر رہا ہے۔ مسجد کی تعمیر ہو رہی ہے اور حضورؐ بھی مٹی اور گارا اٹھا اٹھا کر لا رہے ہیں جنگل میں کھانا پکانے کا وقت آگیا ہے کسی نے کوئی کام سنبھال لیا ہے اور کسی نے کوئی۔ وہ دیکھو۔ ایندھن کے لئے سوکھی لکڑیاں کون چن رہا ہے؛ خود رسول اللہؐ!! جو لوگ کسی اپنی ضرورت یا امورِ مملکت کے ضمن میں مدینے سے باہر جاتے ہیں اور ان کے گھروں میں کوئی مرد نہیں رہتا، تو ان کے گھروں کے کام کاج خود حضورؐ جا کر کرتے ہیں۔ بکریوں کو چارہ ڈال رہے ہیں۔ اونٹنیوں کا دودھ دوہ رہے ہیں ان کے لئے باہر سے پانی لا رہے ہیں۔

دوسرے قبائل کے نمائندے اور سلطنتوں کے وفود آتے ہیں۔ انہیں پہچاننے میں دقت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا امیر المومنین سلطنت کا فرمانروا، کونسا ہے۔ اس دقت کے پیشِ نظر حباب نے مٹی کا ایک چبوترہ بنا دیا، تاکہ آپ اس پر بیٹھا کریں۔ آپ نے دیکھا تو غصے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ اپنے پاؤں سے اس نشست کو گرا دیا۔ اور کہا کہ تم بھی لگے ہو وہی امتیازات پیدا کرنے جنہیں مٹانے کے لئے میں آیا ہوں تم نے آج مٹی کا چبوترہ بنایا ہے، آنے والے اس کو تختِ سلطنت میں تبدیل کر دیں گے!

لوگ آپ کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے تو انہیں ڈانٹ کر کہا کہ تم بھی لگے وہی کچھ کرنے جو قیصر و کسریٰ کے ہاں ہوتا ہے؟ کسی نے ایک مرتبہ خطاب کرتے ہوئے کہہ دیا سیدنا! تو فرمایا کہ سید (آقا) صرف خدا کی ذات ہے میں اس کا ایک بندہ ہوں۔

کچھ لوگوں نے آپ کے وضو کا مستعمل پانی، فرطِ عقیدت سے اپنے چہرے پر ملنا چاہا تو آپ نے سختی سے روک دیا، اور فرمایا کہ تم یہ کیا کرنے لگے؟ انہوں نے کہا کہ یہ اظہارِ محبت کا طریق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے محبت ہے تو سچ بولا کرو۔ امانتوں کی حفاظت کیا کرو، اور اپنے عہد و پیمان کا خیال رکھا کرو۔ یہ ہے سچی محبت اور حقیقی تعظیم!

کسی کے ہاں دعوت میں جا رہے تھے۔ چار آدمیوں کی دعوت تھی۔ راستے میں ایک اور آدمی یوں ہی ساتھ ہو گیا۔ آپ نے میزبان کے ہاں پہنچ کر اس سے کہا کہ یہ صاحب اس طرح میرے ساتھ آگئے ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو

اسے ساتھ بٹھا لیا جائے ورنہ رخصت کر دیا جائے۔

سلیم! بظاہر یہ باتیں بڑی چھوٹی چھوٹی ہیں (اور میں نے دانستہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا انتخاب کیا ہے) لیکن ان کی اہمیت کا اندازہ لگانا ہو تو آج کسی افسر، کسی مولوی صاحب، یا کسی پیر صاحب، کی روزمرہ کی زندگی میں ان ہی جیسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دیکھو۔ دونوں کا فرق نمایاں طور پر سامنے آجائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی سیرت و کردار کا صحیح مطالعہ ہوتا ہی روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہے۔ اب ذرا آگے بڑھو۔

مقدمات سنتے تو فریقین سے کہدیتے کہ میں ایک انسان ہوں۔ میرا فیصلہ لامحالہ تمہارے بیانات ہی پر مبنی ہوگا۔ اس لئے اگر کسی نے غلط بیانی سے مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیا تو اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ حقیقتِ حال کو خدا سے نہیں چھپا سکے گا۔ دیکھا سلیم! تم نے کہ حاکم ہونے کے ساتھ ہی کس طرح عوام کے دل سے اس اثر کو زائل کر دیا کہ حاکم عام انسانوں سے کچھ الگ ہوتا ہے؟

اسی قبیل سے ایک اور واقعہ ہے۔ عربوں میں یہ رواج چلا آرہا تھا کہ وہ ایک خاص موسم میں نر کھجوروں کا گابھا مادہ کھجوروں میں لگاتے تھے جس سے پھل بہت اچھا آتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے اُن سے کہا کہ گابھا یوں نہیں یوں لگاؤ۔ انہوں نے اس کی تعمیل کی۔ لیکن ہوا یہ کہ اس سال کھجوروں میں پھل ہی نہ آیا۔ لوگ متعجب تھے کہ یہ کیا ہوا آپ نے ان سے کسی توقف یا جھجک کے بغیر کہدیا کہ میرا اندازہ یہ تھا کہ ایسا کرنے سے پھل زیادہ آئے گا۔ لیکن نتیجہ نے بتا دیا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔ اس لئے آئندہ تم سابقہ قاعدے کے مطابق ہی عمل کیا کرو۔

یہاں تک تو خیر قیاسات و آراء ہی کا سوال تھا۔ ایک صاحبِ اختیار کے لئے وہ مقام بڑا نازک ہوتا ہے جہاں اس کے ذاتی جذبات و مفاد درمیان میں آجائیں۔ ایسے مقامات میں اپنی ذات کو الگ رکھنا صحیح حریت کا ثبوت دینا ہے۔ وہ دیکھو سلیم! جنگِ بدر کے قیدی رسیوں میں باندھے ہوئے ہیں۔ ان میں حضورؐ کے چچا، عباس بھی ہیں۔ وہ سن رسیدہ ہیں اس لئے تکلیف سے کراہ رہے ہیں۔ ان کے کراہنے کی آواز سے آپؐ کے دل پر اثر ہوتا ہے۔ چہرے کی افسردگی دل کی غماز ہو جاتی ہے۔ رفقاء کی دقتِ نظر اس اندرونی کشمکش

کو بھانپ لیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چچا کے کراہنے کی آواز بند ہو جاتی ہے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا۔ عرض کیا گیا کہ (حضرت) عباس کی رسیاں ڈھیلی کر دی گئی ہیں۔ یہ سن کر غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا اور فرمایا کہ تم نے ان کی رسیاں اس لئے ڈھیلی کر دیں کہ وہ میرے چچا ہیں۔ تم نے قانون کے مقابلے میں رشتہ داری کی رعایت ملحوظ رکھ لی؟ تم نے بہت برا کیا۔ یا تو تمام قیدیوں کی رسیاں ڈھیلی کرو اور یا پھر عباس کی رسیاں بھی اسی طرح کس کر باندھو؟

اور آگے بڑھو سلیم! ان ہی قیدیوں میں آپ کے داماد (ابوالعاص) بھی تھے۔ مشورہ کیا گیا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے (ابھی تک جنگی قیدیوں کے متعلق قرآن کا حکم نازل نہیں ہوا تھا جس میں کہا گیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو یا تو زرِ فدیہ لیکر (یا تبادلے میں) رہا کر دو، یا پھر احسان رکھ کر چھوڑ دو) فیصلہ یہ ہوا کہ انہیں قتل کر دیا جائے اور ہر قیدی کا رشتہ دار اسے خود اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

سوچو سلیم! کہ یہ گھڑی کس قدر نازک تھی؟ بیٹی کا سہاگ لٹ رہا ہے اور اسے خود اپنے ہاتھوں سے بیوہ بنایا جا رہا ہے۔ لیکن چونکہ قانون کا فیصلہ تھا اس لئے اس میں نہ کوئی تامل ہوتا ہے نہ تردد۔ نہ بیٹی کی محبت عناں گیر ہوتی ہے نہ اس کے مستقبل کے مصائب دامن کش۔ (یہ الگ بات ہے کہ اسی مجلسِ مشاورت نے اپنے سابقہ فیصلہ پر نظرِ ثانی کر کے ان قیدیوں کو زرِ فدیہ لے کر رہا کر دینے کا فیصلہ کر دیا)۔

یہاں سلیم! ایک اور واقعہ سامنے آتا ہے جسے لکھتے وقت دل لرز جاتا ہے اور ہاتھ کانپ اٹھتے ہیں۔ ان قیدیوں کا زرِ فدیہ مانگا گیا۔ محمدؐ کی بیٹی (حضرت زینب) نے اپنے خاوند کا زرِ فدیہ بھیجا۔ وہ زرِ فدیہ کیا تھا کانچ کا ایک پرانا ہار۔ تمہیں معلوم ہے سلیم! کہ یہ ہار کونسا تھا؟ برسوں پہلے، جب رسول اللہؐ کی شادی حضرت خدیجہ سے ہوئی ہے تو آپ نے وہ سادہ سا ہار بیوی کو شادی کے تحفے میں دیا تھا۔ اس کے بعد جب (حضرت) زینب کی شادی ہوئی ہے تو ماں نے بیٹی کو وداع کرتے وقت وہی ہار اس کے گلے میں ڈال دیا اور آج وہی ہار بیٹی نے اپنے خاوند کی رہائی کے لئے بطور زرِ فدیہ بھیج دیا اور اس طرح تمام گذشتہ واقعات کی یاد محبوب باپ کے دل میں تازہ کر دی۔

ہار، سامنے متاعِ فدیہ کے ڈھیر میں پڑا ہے اور رسول اللہؐ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں اور گذری ہوئی داستانیں ایک ایک کرکے، سینما کے فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے آتی چلی جا رہی ہیں۔ حضرت خدیجہ جیسی بیوی جس نے اسلام کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ ایسی مومنہ، صادقہ، ایسی جاں نثار بیوی۔ ایسی پیکرِ محبت و خلوص رفیقۂ حیات۔ پچیس سالہ رفاقت کی زندگی کے تمام واقعات ایک ایک کرکے آنکھوں کے سامنے آنے گئے۔ دل میں جذبات کا طوفان اُمڈا، اس کا.... ایک قطرہ ستارۂ صبحگاہی کی طرح سرِ مژگاں چمکا اور مقدس رخساروں پر زمزم بار و کوثر فرزش ہو گیا۔ اس کانچ کے ہار کی قیمت کیا تھی لیکن اس میں گذری ہوئی زندگی کی حسین و تابناک یادوں کی ایک کائنات سمٹی ہوئی تھی۔

وہ چار سوکھے ہوئے تنکے یوں تو کیا تھے، مگر

قفس میں آہی گئی یادِ آشیانے کی

دل میں جذبات کے تلاطم سے ایک حشر بپا تھا لیکن لب بند تھے۔ بہ حیثیت امیرالمؤمنین آپ کو یہ حق حاصل تھا کہ اس زرِ فدیہ کی تقسیم جس طرح چاہتے کر دیتے۔ لیکن اس ہار کے ساتھ چونکہ اپنے ذاتی جذبات وابستہ تھے اس لئے یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی مرضی سے خود لے لیں یا بیٹی کو واپس بھیج دیں۔ ہار اب ملت کی متاع تھا اور آپ اس کے امین تھے۔

کچھ سمجھتے ہو سلیم! یہ کیا مقامات ہیں؟ اور سنو۔ فتح مکہ کے بعد، مخالفین قریش ایک ایک کرکے، سامنے پابجولاں کھڑے ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے ساری عمر آپ کو اس قدر تکالیف بہم پہنچائیں اور اس قدر تنگ کیا کہ آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور پیہم لڑائیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ آج یہ سب مفتوح و مغلوب قیدیوں کی حیثیت سے سامنے کھڑے ہیں۔ رواج، قاعدے اور قانون کے مطابق ان کی سزا موت تھی۔ لیکن یہ اسلام لے آئے تو ساری تقصیریں معاف ہو گئیں۔ ان کا کوئی جرم باقی نہ رہا۔ حتیٰ کہ ان میں وحشی بھی تھا جس نے آپ کے عزیز چچا (حضرت حمزہؓ) کو نہایت درندگی سے شہید کیا تھا۔ اور ہبّار

بن اسود بھی جس نے آپ کی بیٹی (حضرت زینبؓ) کو نیزہ سے ایسا زخمی کیا تھا کہ آپ بمشکل جانبر ہو سکی تھیں لیکن جب آپ نے سب سے کہہ دیا کہ لا تثریب علیکم الیوم (تمہارے سب جرم معاف ہیں) تو پھر اپنا ذاتی انتقام بھی باقی نہ رکھا۔ اسے بھی معاف کر دیا۔

تمہیں شاید معلوم ہے سلیم! کہ جب حضورؐ مکہ میں تھے تو قریش نے آپ کا اور آپ کے ساتھ آپ کے اہل خاندان کا اس طرح بائیکاٹ کر دیا تھا کہ آپ پر کھانے پینے کی چیزوں کے راستے بھی بند ہو گئے تھے۔ تین سال تک آپ اور آپ کے اہل خاندان اس جاں کاہ مصیبت میں رہے۔ جب آپ مدینہ تشریف لے گئے ہیں تو یمامہ کا رئیس مسلمان ہو گیا۔ اہل مکہ کا غلّہ یمامہ سے آیا کرتا تھا۔ اس نے قریش کی اس حرکت کے جواب میں غلّہ روک دیا۔ اور قریش لگے بھوکوں مرنے۔ آپ نے سنا تو یمامہ کے رئیس کو فوراً کہلا بھیجا کہ ہم نوع انسانی پر ربوبیت (پرورش) کے دروازے کھولنے کے لئے آئے ہیں۔ اُن کا رزق بند کرنے کے لئے نہیں آئے۔ اس لئے غلّہ کو مت روکو۔ قریش میں کوئی بھوکا نہ رہنے پائے۔

غور کیا تم نے سلیم! کہ کس طرح ذاتی جذباتِ انتقام کو اصول و آئین سے یکسر الگ رکھا جاتا ہے اور کسی اصولی فیصلہ کو ان سے متاثر نہیں ہونے دیا جاتا۔ یہی وہ حریت آموز تعلیم و تربیت تھی جس سے دستِ پروردگانِ نبوت میں صحیح آزادی کی روح پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان کی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ جس معاملہ میں ذرا کی اختلاف ہوتا، نہایت جرأت دبیباکی سے سامنے لے آتے۔ اُدھر ان کہنے والوں کی جرأت کی یہ کیفیت تھی اور ادھر سننے والے کی کشادہ نگہی اور وسعتِ ظرف کا یہ عالم کہ کیا مجال جو اس اختلاف پر ذرا بھی پیشانی پر بل آنے پائے۔ جنگ بدر کے موقعہ پر آپ نے اپنے لشکر کے لئے ایک مقام کو تجویز کیا۔ ایک رفیق (حضرت خباب) نے پوچھا کہ یہ فیصلہ وحی کی رو سے ہوا ہے یا آپ کی ذاتی رائے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں! میں نے خود ہی ایسا سمجھا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں اس نواح کا رہنے والا ہوں۔ یہاں کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ مقام ہمارے لئے ٹھیک نہیں۔ ہمیں فلاں مقام پر جا کر ڈیرے ڈالنے چاہئیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ درست ہے۔ تم مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔

تمہاری رائے زیادہ صائب ہے۔ اور اس کے بعد فوج کو کوچ کرنے کا حکم دیدیا۔

یہ آزادی صرف آپ کے رفقائے کار تک ہی محدود نہ تھی۔ اُس فضا میں ہر سانس لینے والے کا یہی عالم تھا۔ مدینہ میں ایک لونڈی تھی بریرہ نامی وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر الگ ہوگئی۔ اُس شخص کے کہنے پر آپ نے بریرہؓ سے کہا کہ تم اس کے پاس چلی جاؤ۔ ذرا فریقین کی پوزیشن کو سامنے رکھو۔ سلیم! کہنے والے ہیں محمدؐ رسول اللہ۔ اسلامی مملکت کے واحد فرماں روا۔ مدینہ کے حاکم۔ امیر المؤمنین۔ اور کہا جا رہا ہے ایک لونڈی سے۔ کیا اس لونڈی کی جرأت ہو سکتی تھی کہ سامنے سے لب کشائی کر سکے۔ لیکن وہاں تو تربیت ہی ایسی کی گئی تھی کہ لونڈیوں تک اپنے مقام انسانیت سے واقف ہو چکی تھیں۔ بریرہ نے کہا کہ آپ کا یہ حکم وحی کی رو سے ہے یا اپنا ذاتی ارشاد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میری اپنی سفارش ہے۔ اس پر بریرہ نے کہا کہ پھر آپ معاف فرمائیے۔ میں، اپنے معاملات کو بہتر سمجھتی ہوں میں اس کے پاس رہنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

اور آپ تبسم فشاں تشریف لے گئے۔

اسی قبیل کا ہے سلیم! وہ نازک ترین واقعہ جسے قرآن نے اپنے دامن میں محفوظ رکھ لیا ہے۔ غور سے سنو، کہ وہ کونسا واقعہ ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اسے ابدیت درکنار کر دیا گیا ہے۔

حضرت خدیجہؓ کے پاس ایک لڑکا (غلام) تھا۔ زیدؓ۔ انہوں نے وہ غلام حضورؐ کو دیدیا۔ آپ نے اسے غلامی سے آزاد کر دیا۔ اُس کے بعد اسے یہ مقام عطا فرما دیا کہ وہ آپ کا منہ بولا بیٹا مشہور ہو گیا۔ غلامی کی پستیوں سے اٹھا کر یہ مقام بلند! سبحان اللہ

تیرے سنگِ در نے بدل دیا ہے یہ پستیوں کو فراز میں
کہ ہزاروں عرش جھلک رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

لیکن (حضرت) زیدؓ کی رفعتِ مدارج یہیں تک پہنچ کر نہیں رُک گئی۔ اس سے بھی آگے بڑھی۔ حضورؐ نے ان کی شادی بنو ہاشم کے گھرانے کی ممتاز ترین خاتونِ محترم، خود اپنی پھوپی زاد بہن سے کر دی۔

ایک غلام اور اس کی شادی قریش کے بلند ترین گھرانے کی لڑکی سے! سارے عرب میں اس کی مثال نہیں تھی ان کی تاریخ اس سے ناآشنا تھی۔ سب نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ہر جگہ اس کا چرچا ہوا جگہ جگہ اس کی باتیں ہونے لگیں، لیکن آپ احترامِ بنی آدم اور مساواتِ انسانی کے جس انقلابِ عظیم کو لیکر آئے تھے اس کے پیشِ نظر آپ کو عملی مثال قائم کرنی تھی۔ آپ نے یہ بتانا تھا کہ انسان کی پیدائش محض ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ اس کی بناء پر نہ کسی کو کوئی (Advantageous position) حاصل ہونی چاہیئے اور نہ اسے کسی قسم کا (Disadvantage) ہونا چاہیئے

ان حالات میں یہ شادی ہوئی۔ لیکن سوءِ اتفاق دیکھئے کہ میاں بیوی میں ناموافقت ہو گئی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ حضرت زید نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کر لیا۔

بنو ہاشم کے گھرانے کی ممتاز ترین خاتون۔

خود رسول اللہؐ کی پھوپی زاد بہن۔

اس کے لئے یہی چیز کچھ کم، باعثِ ہتک، نہ تھی کہ اس کی شادی ایک غلام سے کر دی گئی یا جواب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ غلام اسے طلاق دے رہا ہے!

تم سوچو سلیم! کہ اس سے رسول اللہؐ کے دل پر کیا گزری ہو گی! یہ شادی سارے عرب کے رسم و رواج کے خلاف کی گئی تھی۔ خویش و اقارب کی مخالفت کے علی الرغم کی گئی تھی۔ مخالفت کرنے والے شروع ہی سے کہتے ہوں گے کہ یہ ایک انوکھی بات ہو رہی ہے۔ ایسا اَن مِل جوڑ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا! تم نے دیکھ لینا کہ یہ رشتہ نبھ نہیں سکے گا۔

اب یہ تمام مخالفین چشم براہ ہوں گے کہ کس دن یہ ناطہ ٹوٹے اور ہم کہہ سکیں کہ ——— کیوں! ہم نہ کہتے تھے؟

ان حالات میں رسول اللہؐ اُٹھے اور زید کے پاس آئے اور آ کر کہا۔ زید! امسك عليك زوجك

اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔

یہ کہنے والا کون ہے سلیم!

وہ رسول جس پر ایمان لانے سے زید کو شرف اسلام حاصل ہوا۔

وہ امیر جس کی مملکت میں زید ایک رعیت کی حیثیت سے رہتے ہیں۔

وہ محسنِ اعظم جس نے زید کو غلامی سے آزاد کیا۔

وہ جو زید کے لئے بمنزلہ باپ کے ہیں۔

وہ جنہوں نے زید کی شادی اتنے اونچے گھرانے میں کی اور اس طرح اسے سوسائٹی میں ایسا بلند مقام عطا کر دیا۔

یہ ہیں کہنے والے! اور کہا یہ ہے کہ زیدؔ، میری بہن کو طلاق مت دو۔ زید نے اس کے جواب میں کیا کہا؟ تم سوچتے ہو گے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں باقی تھی۔ لیکن اس کی گنجائش آج باقی نہیں۔ اُس وقت باقی تھی۔ زیدؔ نے یہی پوچھا کہ یہ خدا کا حکم ہے یا حضورؐ کی ذاتی سفارش ہے۔ اور جب معلوم ہوا کہ یہ آپ کی ذاتی سفارش ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ میاں بیوی کے معاملات کو میاں بیوی ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں؟ اپنے فیصلے کو بحال رکھا اور بیوی کو طلاق دیدی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے لئے ذرا تصور میں لاؤ اپنے معاشرہ کو اور سوچو کہ ایسا حادثہ کہیں آج پیش آجائے تو اس کا انجام کیا ہو؟ آج اگر اس قسم کا واقعہ کسی ایسے شخص سے پیش آجائے جس نے اُس طلاق دینے والے پر کبھی کوئی ذرا سا بھی احسان کیا تھا تو تم دیکھو گے کہ کس طرح وہیں کھڑے کھڑے ہزار گالیاں دیتا ہے اور پھر ساری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹتا ہے کہ نمک حرام، احسان فرموش، کمینہ، رذیل! ہم نے اس پر اتنے احسانات کئے اور آج ہمیں ان کا بدلہ یہ مل رہا ہے۔ سچ کہا گیا ہے سعدیؔ کہ

نکوئی با بداں کردن چنان است کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

بچھو کی فطرت میں ڈنک مارنا ہوتا ہے۔ اس سے اور توقع ہی کیا کی جا سکتی تھی؟

اور اگر کسی باپ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آجائے تو ہی وقت بیٹے کو گھر سے نکال دے اور اسے جائیداد سے عاق کر دے اور کہدے کہ ساری عمر میرے سامنے نہ آنا اور مرنے کے بعد میرے جنازے کے ساتھ کبھی نہ جانا۔ تم تو نوح علیہ السلام کے بیٹے ہو جس نے خاندان نبوت کو داغ لگا دیا تھا۔

اور اگر کسی مذہبی پیشوا (مولوی صاحب یا پیر صاحب) کے ساتھ یہ کچھ ہو تو پھر اس غیض وغضب کا اندازہ لگاؤ جس کا مظاہرہ ان کے منہ کی جھاگ اور گالیوں کی بوچھار سے ہو رہا ہو۔ طلاق دینے والے پر "خدا کی رحمت اور رسول کی شفاعت "سب حرام ہو جائے اور اسے سیدھا "جہنم رسید" کر دیا جائے۔

اور اگر کہیں خدانکردہ) ایسا معاملہ کسی حاکم (افسر) سے ہو جائے تو وہ آخرت کا بھی انتظار نہ کرے۔ اسے یہیں سیدھا جہنم پہنچا دے۔

لیکن اُس محسنؐ اُس باپ، اُس مذہبی راہ نما اُس حاکم، اور افسر نے کیا کہا؟ کہا یہ کہ جب قانون خداوندی نے تمہیں اس کا اختیار دیا ہے تو اس میں کوئی اور مداخلت نہیں کر سکتا۔ اگر تمہارا فیصلہ یہی ہے تو اس میں کوئی بات وجہ ناراضگی نہیں۔ بہت اچھا۔

اور اس کے بعد (حضرت) زید عمر بھر اُسی خوشگواری تعلقات کے ساتھ حضورؐ کے پاس رہے۔ نہ باہمی روابط میں کوئی فرق آیا اور نہ ہی دلوں میں کوئی بُعد پیدا ہوا۔ (حضرت) اُسامہ ان ہی (حضرت) زید کے بیٹے تھے جنہیں نبی اکرمؐ نے اس فوج کا سپہ سالار مقرر کیا تھا جسے آپ نے آخری مرتبہ ترتیب دیا تھا اور جس میں بڑے سے بڑے جلیل القدر صحابہ بطور سپاہی کام کر رہے تھے۔

دیکھا سلیم! تم نے قانون کی اطاعت اور قانون نافذ کرنے والے کی ذاتی حیثیت میں کس طرح فرق کیا جا رہا ہے! یہ تھی صحیح حریت جس سے انسانیت لذت یاب ہوئی تھی۔ کہو، تمہیں اس کی نظیر کہیں اور بھی ملتی ہے؟ نظر دوڑا کر دیکھو تو سہی، نگاہ کس طرح کاشانۂ چشم میں خاسر و نامراد واپس آجاتی ہے ینقلب الیک البصر خاسئًا

وھو حسیرا)

* * *

اب اسی کا ایک اور گوشہ لو۔ نظام ربوبیت کا دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ سامانِ زیست (مال و دولت میں ارباب حل و عقد اور دیگر افراد مملکت میں کوئی فرق نہ ہو۔ اگر فرق ہو تو یہ کہ اس میں ارباب حل و عقد کا حصہ سب سے کم ہو۔ یہ باتیں تو تم نے سلیم! اکثر سنی ہوں گی کہ نبی اکرمؐ بڑی غریبی کی زندگی بسر فرمایا کرتے تھے۔ گھر میں کوئی ساز و سامان نہ تھا۔ کئی کئی دنوں چولہا گرم نہیں ہوا کرتا تھا۔ کپڑوں میں پیوند لگے ہوتے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ تمہارے محلے کی مسجد کے مولوی صاحب (میں ان کا نام بھولتا ہوں اس وقت! بھلا سا نام تھا۔ خیر!) ان تمام باتوں کو کس رقت کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ وعظ میں خود بھی رویا کرتے تھے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی رلایا کرتے تھے لیکن اصل چیز جس سے یہ اتنی بڑی حقیقت نہ صرف پیوند خاک ہو کر رہ جاتی ہے بلکہ اسلام کے متعلق ایک نہایت خطرناک اور گمراہ کن تصور پیدا کر دیتی ہے وہ ہے جہاں ان کے وعظ کے مقطع کا بند آیا کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ آپ کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا گیا اور کہا گیا کہ ان میں سے ایک کو چن لیجئے تو آپ نے آخرت کو چن لیا اور دنیا کو چھوڑ دیا۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ یہ تصور کس قدر اسلام کے تصور کے خلاف ہے؟ یہ تصور، خالص عیسائیت کا خانقاہی تصور ہے جس میں زمین کی بادشاہت، قیصر کے لئے چھوڑ دی جاتی ہے اور "آسمان کی بادشاہت" خدا کے مقرب بندوں کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اسلام کا تصور زمین اور آسمان (دنیا اور آخرت) دونوں کی بادشاہتیں حاصل کرنا ہے۔ نہ یہ تصور کہ دنیا کفار کے لئے چھوڑ دی جائے اور خود غریبی اور مفلسی کی زندگی بسر کر کے آخرت سنواری جائے۔ نبی اکرمؐ کی "غریبی" کی وجہ یہ تھی کہ حضورؐ کی تمام عمر نظام ربوبیت کے قیام میں گزری۔ اس نظام کی اولیں کڑی یہ ہے کہ تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی (رزق) کی ذمہ داری نظام اپنے سر لیتا ہے۔ اس کے لئے اس نظام کا مرکز (امیر ملت) اپنے آپ کو سب سے پیچھے رکھتا ہے۔ یعنی وہ نہیں کھاتا جب تک اس کا اطمینان نہ ہو جائے کہ تمام افراد مملکت کا پیٹ بھر گیا ہے۔ وہ نہیں پہنتا جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ ہر فرد مملکت کو کپڑہ

نصیب ہو گیا ہے جس کے سر پر اتنی بڑی ذمہ داریاں ہوں وہ کس طرح مرغ پلاؤ کھا سکتا ہے اور کیسے کمخواب ابریشم پہن سکتا ہے؟ یہ تھی وجہ جس کی بنا پر رسول اللہؐ اس عسرت کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ نہ یہ کہ آپ کو دنیا سے نفرت تھی۔

نبی اکرمؐ کے بعد، جب اس نظام کی ذمہ داریاں حضرت ابو بکرؓ کے کندھوں پر آئی ہیں تو یہی کیفیت آپ کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن دیکھا کہ آپ کپڑے کی گٹھڑی سر پر اٹھائے بازار میں چلے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ کپڑا بیچنے جا رہا ہوں تاکہ اپنی اور بیوی بچوں کی روٹی کی فکر کر لوں۔ انہوں نے کہا کہ اب آپ کا سارا وقت ملت کی ملکیت ہے۔ اسے آپ اپنی ضروریات کے لئے صرف نہیں کر سکتے آپ پورا وقت اُدھر دیجئے، اور بیت المال میں سے اپنے گزارہ کے لئے لے لیجئے بڑے تامل اور توقف کے بعد آپ راضی ہوئے اب سوال پیدا ہوا کہ خلیفہ کو اپنے گذارہ کے لئے کس قدر لینا چاہیئے حضرت ابو بکرؓ نے سوچ سوچ کر کہا کہ مدینے میں ایک مزدور کم از کم کیا کماتا ہے؟ جب معلوم کیا تو فرمایا کہ بس۔ یہ ہے خلیفہ کا روزینہ۔ افراد مملکت میں سب سے کم آمدنی! اور جب پوچھا گیا کہ اس میں گزار کیسے ہوگا، تو فرمایا کہ اب خلیفہ خود کوشش کرے گا کہ ایک مزدور کی اجرت زیادہ ہو جائے۔ یعنی اُن کا معیار زندگی (Standard of Living) بلند ہو جائے۔

تم نے حضرت ابو بکرؓ کا وہ واقعہ تو سنا ہی ہوگا سلیم؛ کہ آپ نے ایک دن بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز ہو تو کھانے کے ساتھ دے دو۔ جواب نفی میں ملا۔ چند دنوں کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ کھانے کے ساتھ آٹے کا حلوہ بھی ہے۔ پوچھا کہ اُس دن تو تم نے نہ کر دی تھی۔ اب یہ میٹھا کہاں سے آ گیا۔ جواب ملا کہ بیت المال سے راشن میں جس قدر آٹا آتا ہے، میں اُس میں سے ایک مٹھی بھر آٹا ہر روز الگ نکال لیا کرتی تھی جب تھوڑا سا آٹا جمع ہو گیا تو میں نے اس کا میٹھا خرید لیا اور حلوہ پکا لیا۔ آپ اُٹھے اور جا کر راشن تقسیم کرنے والے سے کہا کہ ہمارے گھر میں جس قدر آٹا روز جاتا ہے اس میں ایک مٹھی کی کمی کر دو کیونکہ تجربے نے بتایا ہے کہ

ایک مٹھی کم آٹے میں بھی ہمارے گھر والوں کا گزارہ ہو جاتا ہے۔

یہ کچھ تھا جو خلیفۃ المسلمین (یعنی نظامِ ربوبیت کے قیام کا ذمہ دار) بیت المال میں سے اپنا حق سمجھا کرتا تھا۔ اور اس کے باوجود جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا ہے تو بیٹے سے کہا کہ اب میں خدا کے سامنے جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں کہ میں نے بیت المال سے جس قدر لیا ہے اس کے مطابق بندگانِ خدا کی خدمت کر سکا ہوں یا نہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ یہ بوجھ اپنے سر پر نہ ہی لے کر جاؤں تو اچھا ہے۔ تم مکان کو بیچ دو اور جو کچھ میں نے بیت المال میں سے لیا ہے اُسے بیت المال میں داخل کر دو۔

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

حضرت عمرؓ کے زمانے میں یہ سلسلہ اور بھی وسیع ہو گیا تھا۔ سلطنت کا رقبہ بائیس لاکھ مربع میل تھا۔ ایک عراق کی مال گزاری گیارہ کروڑ درہم سالانہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی افرادِ مملکت کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔ اور اسی نسبت سے ربوبیت کی ذمہ داریاں بھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور بھی زیادہ محتاط ہو گئے تھے۔ ایک جوڑا، کپڑا سردی کے لئے۔ ایک جوڑا گرمی کے لئے اور مزدور کی اجرت کے مطابق روزینہ۔ ایک دن آپ گھر میں تھے۔ لوگ باہر انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد باہر آئے۔ لوگوں نے شکایت کی کہ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ فرمایا کہ اس کا ذمہ دار یہ کرتا ہے۔ اسے دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال رکھا تھا۔ یہ سوکھتا نہیں تھا اور دوسرا کرتہ تھا نہیں جو پہن کر باہر آجاتا۔

بیمار ہو گئے تو دوائی کے لئے شہد کی ضرورت پڑی۔ شہد بیت المال میں موجود تھا لیکن اُسے از خود کس طرح استعمال کر لیتے؟ مجلس مشاورت طلب کی۔ اور ان کی اجازت سے شہد لیا۔

ایک دن (غالباً) مصر کا گورنر آیا۔ دیکھا تو آپ جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ آپ گیہوں کی روٹی

کیوں نہیں کھاتے! فرمایا کہ کیا ہمارے ہاں اتنا گیہوں آجاتا ہے کہ ہر فرد مملکت کو گیہوں کی روٹی مل جائے۔ اس نے کہا کہ اتنا تو نہیں لیکن پھر بھی کافی گیہوں ہوتا ہے۔ آپ نے کہا کہ امیرالمومنین اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل جائے۔

ایک مرتبہ قحط پڑ گیا تو اردگرد کی ساری آبادی سمٹ کر مدینے میں جمع ہو گئی۔ اس کا علاج کیا سوچا گیا؟ حکم دیدیا کہ مدینہ میں کوئی فرد اپنے گھر میں کھانا نہیں کھائے گا نہ ہی کسی کے ہاں انفرادی طور پر کچھ پکے گا۔ جو کچھ کسی کے پاس ہے سب ایک جگہ جمع ہوگا اور سب کو ان پناہ گزینوں کے ساتھ مل کر ایک دسترخوان پر کھانا ہوگا۔ اس حکم کی تعمیل میں امیرالمومنین کا گھرانا پیش پیش تھا۔ مسلسل فاقوں سے اور موٹی جھوٹی روٹی کھانے سے آپ بیمار ہو گئے۔ گھی کی جگہ زیتون کے تیل کے استعمال سے چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقاء نے کئی مرتبہ کہا کہ آپ نسبتاً اچھی غذا کھائیے۔ ملت کو آپ کی صحت کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ یہ سنتے تو انہیں یہ کہکر خاموش کر دیتے کہ ع

خونِ شہ رنگیں تراز معمار نیست

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دن دیکھا کہ آپ کا پوتا خربوزہ کھا رہا ہے۔ اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ) کو بلایا اور کہا کہ مسلمانوں کے بچے روٹی کے ٹکڑے کو ترس رہے ہیں اور عمر کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟ اس کا کوئی جواب تمہارے پاس ہے؟ انہوں نے کہا کہ بچے کو صبح (عام بچوں کے ساتھ) جو کھجور کی گٹھلیاں ملی تھیں اس نے ان کے عوض ایک بدو لڑکے سے خربوزہ لے لیا تھا۔ یہ ہے حقیقت اس "میوہ خوری" کی، ورنہ عمر کے گھر والوں کو بھی وہی کچھ اور اتنا ہی کچھ مل رہا ہے جتنا قحط زدہ مسلمانوں کو ملتا ہے۔ یہ تھا احتیاط کا عالم اور اس کے باوجود احساسِ ذمہ داری کی یہ کیفیت کہ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت کے مطابق

> قحط کے زمانے میں حضرت عمر عشا کی نماز پڑھ کر اپنے مکان میں داخل ہوتے اور آخر شب تک برابر نماز پڑھتے۔ پھر نکلتے اور پہاڑی راستوں پر گھومتے (تا کہ تمام لوگوں کی خبر گیری کر سکیں)۔ ایک رات میں نے

انہیں یہ دعا کرتے سنا کہ اے اللہ امّت محمدیہ کی ہلاکت میرے ہاتھوں پر نہ کر۔

وہ لوگوں کے غم میں اس قدر نڈھال تھے کہ حضرت اسامہ بن زید کے بیان کے مطابق صحابہ کو یہ فکر لاحق ہو گئی تھی کہ اگر قحط رفع نہ ہوا تو عمرؓ مسلمانوں کی فکر میں مر جائیں گے۔

جیسا کہ تمہیں معلوم ہے سلیم! نظام ربوبیت میں تمام افراد مملکت کے رزق کی ذمہ داری نظام کے سر ہوتی ہے اس کے لئے انتظام یہ تھا کہ ہر شخص کا وظیفہ مقرر ہوتا تھا جو اس کی ضروریات کی کفالت کرتا تھا۔ بچوں کا وظیفہ اس وقت شروع ہوتا تھا جب وہ دودھ پینا چھوڑ دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا قاعدہ تھا کہ رات کے وقت، جب سارا عالم سوتا تھا، وہ چپکے ہی چپکے گشت لگاتے تاکہ افراد مملکت کے حالات معلوم کر سکیں۔ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ ایک خیمے سے بچّے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اس کی ماں اسے سلانے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ سوتا نہیں روئے جاتا ہے۔ جب بچّے کو روتے روتے کافی وقت ہو گیا تو حضرت عمرؓ نے آواز دیکر پوچھا کہ بچے کو کیا ہوا ہے، سوتا کیوں نہیں ہے؟ عورت کو یہ معلوم نہ تھا کہ پوچھنے والا کون ہے؟ وہ غصّے میں بھری بیٹھی تھی۔ جھنجلا کر ایسا کچھ بولی جیسے ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ "ہول ہے عمر کا سر"۔ آپ نے کہا کہ بچّے کے رونے میں عمر کہاں سے آ گیا؟ اس نے کہا کہ اس نے حکم دے رکھا ہے کہ بچّوں کا وظیفہ دودھ چھوڑنے پر شروع ہو گا۔ میں بچّے کا دودھ چھڑا رہی ہوں اور یہ بھوک سے روتا ہے اس لئے سوتا نہیں۔

صبح کی نماز میں، نمازیوں نے دیکھا کہ حضرت عمر رو رہے ہیں اور روتے روتے ان کی گھگھی بندھ گئی ہے۔ روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا اللہ! عمر کو معاف کر دینا۔ نہ معلوم اس کے اس غلط حکم نے کتنے بچّوں کو بھوک سے تڑپا تڑپا کر مار ڈالا ہے۔ اس کے بعد اعلان کر دیا کہ بچّوں کا وظیفہ یوم پیدائش سے شروع ہو جایا کرے۔

احتیاط کا یہ عالم تھا کہ قیصر کی بیوی نے عطر کی چند شیشیاں "شاہِ عرب" (حضرت عمرؓ) کی بیگم صاحبہ کو بطور تحفہ بھیجیں۔ آپ نے وہ شیشیاں بیوی سے لے لیں اور فرمایا کہ یہ بیت المال میں داخل ہوں گی۔ اس لئے

کہ قیصر کی بیوی نے یہ تحفہ تمہاری ذاتی حیثیت سے نہیں بھیجا بلکہ امیر المومنین کی بیوی کی حیثیت سے بھیجا ہے۔ اس لئے تمہارا ان پر کوئی حق نہیں۔

ایک مرتبہ بیت المال میں کچھ مشک آئی جسے تقسیم کرنا تھا۔ بیوی نے کہا کہ لائیے میں تول کر الگ الگ حصے کر دوں۔ فرمایا کہ ہاں: تم اسے تولوگی تو جو مشک ترازو کے پلڑے میں لگی رہ جائے گی اسے اپنے کپڑوں پہ ملوگی۔ میں اس "خیانت" کو گوارا نہیں کر سکتا۔

بیٹا، مصر سے واپس مدینہ آرہا تھا۔ گورنر مصر نے کچھ روپیہ دیا کہ اسے بیت المال میں جمع کرا دینا انہوں نے کہا کہ اگر میں اس روپے سے راستے میں کچھ سامان تجارت خرید لوں اور مدینہ پہنچ کر اصل روپیہ بیت المال میں داخل کر دوں اور منافع خود رکھ لوں، تو اس میں حرج تو نہیں۔ گورنر نے اس کی اجازت دیدی لیکن جب حضرت عمر کو معلوم ہوا تو آپ نے کہا کہ زر منافع بھی بیت المال میں داخل کرو۔ مجھے یقین ہے کہ گورنر نے تمہیں اس کی اجازت محض اس لئے دی تھی کہ تم عمر کے بیٹے ہو۔ وہ ہر ایک کو اس کی اجازت کبھی نہ دیتا۔ اس لئے جو رعایت تمہیں عمر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ملی ہے میں اسے جائز قرار نہیں دے سکتا۔ عمر کے بیٹے اور ایک عام مسلمان میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔

ایک مرتبہ آپ کا بیٹا اپنا اونٹ، مملکت کی چراگاہ میں چراتا رہا۔ جب وہ موٹا تازہ ہو گیا تو نفع سے بیچ لیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ تمام زر منافع بیت المال میں داخل کر دو۔ تم نے ملت کی چراگاہ میں اپنا اونٹ کس طرح چرا لیا؟ بعض رفقاء نے کہا کہ گھاس تو چراگاہ کی تھی لیکن اس نے اونٹ چرانے میں جو محنت کی ہے اس کی کچھ اجرت تو اسے ملنی چاہیئے۔ حضرت عمر اس پر بھی راضی نہ تھے لیکن مجلس مشاورت نے اسے اجرت دلا دی۔

بیت المال کا اونٹ گم ہو گیا تو صحابہ نے دیکھا کہ آپ پریشان ہیں اور اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ اطمینان سے بیٹھئے اُونٹ کی تلاش اور لوگ کر لیں گے۔ فرمایا کہ یہ تو

اونٹ ہے اگر بیت المال کے اونٹ کا ایک بال بھی میری غفلت سے ضائع ہو جائے تو اس کا بار براہِ راست میری گردن پر ہے۔ اس لئے گم گشتہ اونٹ کو مجھے خود ہی تلاش کرنا ہوگا۔ میں نے کیوں ایسا انتظام نہیں کیا کہ اونٹ گم نہ ہو۔ اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا چاہیئے

جب آپ خود اتنی احتیاط برتتے تھے تو ظاہر ہے کہ عمالِ حکومت کو کس قدر محتاط ہونا پڑتا ہوگا۔ آپ نے حکم دے رکھا تھا کہ صوبوں کے گورنر کبھی ترکی گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، کیوں کہ اس سے بوئے تمکنت آتی ہے باریک کپڑے نہ پہنیں چھنا ہوا آٹا نہ کھائیں۔ اور اپنے مکانوں پر حاجب و دربان مقرر نہ کریں کہ لوگوں کو براہِ راست ملنے میں دقت ہو۔ ایک گورنر (حضرت عیاض) کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں۔ انہیں مدینے میں واپس بلایا۔ ایک کمبل اوڑھنے کو دیا اور بکریاں دیدیں کہ انہیں چھ ماہ تک چراتے پھرو۔ اس سے راعی[1] (چرواہے) بننے کے آداب آجائیں گے۔

"رعایا" کے حقوق کا یہاں تک خیال رہتا تھا کہ ایک نو مسلم ٹیکس کا روپیہ بیت المال میں داخل کرنے کے لئے لایا آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے لئے حکومت نے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ میں ابھی ابھی مسلمان ہوا ہوں اس لئے ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی کہ میں حکومت سے کچھ لوں، آپ نے فرمایا، تو پھر حکومت کو بھی کچھ حق حاصل نہیں کہ تم سے کچھ لے۔ جب تک حکومت تمہارے لئے کچھ نہ کرے تم پر حکومت کا کچھ واجب نہیں آتا۔

غور کرو سلیم! کہ اس مختصر سے ٹکڑے میں کتنا عظیم الشان اصول پوشیدہ ہے۔

اور وہ واقعہ تو عام مشہور ہے کہ جب آپ شام کے سفر میں گئے ہیں تو سواری کا ایک ہی اونٹ تھا جس پر آپ اور آپ کا ملازم باری باری سوار ہوتے تھے۔ جب عیسائی حکومت کے نمائندے استقبال کے لئے آئے ہیں تو حالت یہ تھی کہ ملازم اونٹ پر سوار تھا اور آپ اس کی مہار تھامے آگے آگے ساربان کی حیثیت

---

[1] نبی اکرم کا ارشاد ہے کہ کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ تم میں سے ہر شخص راعی (چرواہا) ہے اور ہر ایک سے اس کے گلے (رعایا) کی بابت پوچھا جائے گا کہ اس کی نگہبانی کیسے کی تھی!

سے) چل رہے تھے۔

کیسا حسین ہوگا سلیم! وہ کارواں جس میں رفقائے سفر اس قسم کے ہوں! تمہیں معلوم ہے کہ حضرت عمر نے "نیک آدمی" کی پہچان کے جو تین معیار بتائے تھے اس میں ایک یہ بھی تھا کہ سے بہترین رفیق سفر ہونا چاہیئے۔ پورا واقعہ یوں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بیان کیا کہ فلاں شخص بڑا نیک ہے۔ آپ نے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہے! اس نے کہا کہ وہ بڑا پکا نمازی ہے۔ نہایت احتیاط سے روزے رکھتا ہے۔ آپ نے کہا کہ اس سے تمہیں یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ وہ بڑا نیک ہے! اس سے تو اتنا ہی معلوم ہوا کہ وہ بڑا نمازی ہے۔ بہت روزے رکھتا ہے۔ وہ شخص حیران تھا کہ اب کیا کہوں۔ آپنے کہا کہ

(i) کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟

(ii) کیا تم نے کبھی اس سے معاملہ کیا ہے؟

(iii) کیا اس کے ساتھ کبھی اکٹھے سفر کیا ہے؟

اس نے ہر سوال کے جواب میں سر ہلا دیا۔ تو آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ پھر تم نے کیسے کہہ دیا کہ وہ بڑا نیک ہے۔ جو بات کہو، سمجھ کر کہو۔ یہ کہو کہ وہ بڑا نمازی اور روزے دار ہے۔ یہ مت کہو کہ وہ بڑا نیک ہے۔

اسی شام کے سفر سے واپسی پر (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) وہ واقعہ پیش آیا تھا جس کی یاد سے ہمیشہ آپ کی آنکھوں میں آنسو آجایا کرتے تھے۔ ہوا یہ کہ کسی غیر معروف سے جنگل میں رات کے لئے رکے۔ حسب معمول ادھر ادھر گشت لگا رہے تھے تاکہ معلوم کر سکیں کہ وہاں کی حالت کیا ہے کہ ایک جھونپڑا دکھائی دی۔ جا کر دیکھا تو اس میں ایک بہت ضعیف بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ مائی! تمہارا کیا حال ہے؟ اُسے کیا معلوم تھا کہ پرسش احوال کون کر رہا ہے۔ کہا کہ حال کیا ہے؛ خلیفہ کی باتیں تو بڑی سننے میں آتی ہیں لیکن کیفیت یہ ہے کہ اُس نے آج تک پتہ ہی نہیں لیا کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔ آپ نے کہا کہ تم نے اپنی حالت کی اطلاع خلیفہ تک پہنچائی تھی: اُس نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے کہا کہ پھر خلیفہ کو کیسے معلوم ہو جاتا کہ تم تکلیف میں ہو۔

سنو سلیم! کہ اس کے جواب میں اُس بڑھیا نے کیا کہا۔ اُس نے کہا کہ اگر خلیفہ اتنا انتظام نہیں کر سکتا کہ اپنی مملکت کے افراد کے حالات سے باخبر رہ سکے تو اسے خلافت چھوڑ کر الگ ہو جانا چاہیئے۔ وہ اس کا اہل نہیں ہے حضرت عمرؓ خاموش واپس آگئے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس کے بعد ساری عمر یہ حالت رہی کہ اس واقعہ کو ہمیشہ باچشمِ نم یاد کیا اور یہ کہا کہ عمرؓ کو اس بڑھیا نے سمجھایا کہ خلافت اور بادشاہت میں فرق کیا ہے؟

یہی تھیں خلافت کی وہ ذمہ داریاں جن کے احساس سے کیفیت یہ تھی کہ جب آپ کے آخری وقت یہ تجویز پیش کی گئی کہ آپ کے بعد آپ کے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کو خلیفہ منتخب کر لیا جائے تو آپ نے کہا کہ عمرؓ نے جو ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں، اگر خطاب کا گھرانہ الٰہی کی بازپرس سے سرخرو ہو جائے تو کیا کم ہے جو اس خاندان کے ایک اور فرد کو بھی اس بوجھ کے لئے چن لیا جائے۔

یہ تھے سلیم! دستِ پروردگانِ ذاتِ رسالتمآبؐ جن کی تعلیم و تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ وہ قرآنی نظام کے چلتے پھرتے نمونے بن گئے تھے۔ لیکن اس قسم کی تعلیم و تربیت ہو ہی اس نظام میں سکتی تھی، جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا دست نگر نہ ہو۔ جس میں انسانی حریت کو وہ اذنِ بال کشائی عطا ہو کہ خدا کی عائد کردہ قیود کے علاوہ اور کوئی چیز اس کی راہ میں حائل رہو۔ یہی وہ احساس تھا جس کی بنا پر حضرت عمرؓ جب ایک مرتبہ وادیٔ ضجنان سے گزرے ہیں تو گھوڑے سے اتر کر ننگی زمین پر سجدہ ریز ہو گئے۔ رفقائے سفر حیران تھے کہ یہ کون سا مقامِ سجدہ تھا! آپ نے سجدہ سے اُٹھ کر فرمایا کہ یہ وہ میدان تھا جس میں عمر بچپن میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ سخت تھا اس لئے کام بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا۔ ایک وہ دن تھا اور ایک یہ دن ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں۔ اس احساس کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ میں بےساختہ بدرگاہِ رب العزت سجدہ ریز ہو گیا!

تم نے اس فقرہ کو سنا سلیم! کہ آج "عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں"۔ بس یہ ہے صحیح آزادی۔ یعنی انسان پر خدا کے قانون کے علاوہ اور کسی کا کوئی دباؤ نہ رہے۔ جب انسان کو یہی

آزادی نصیب ہو جائے تو اس کی تمام دبی ہوئی صلاحیتیں اس طرح اُبھرتی ہیں کہ وہ اقطار السمٰوٰت والارض (ارض و سما کے کناروں) سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔ یہ تھا نتیجہ اس نظام ربوبیت کا جسے قرآن نے پیش کیا اور جو نبی اکرمؐ کے ہاتھوں دنیا میں متشکل ہوا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں پروان چڑھا۔

اب تم پوچھو گے سلیم! کہ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کے بعد وہ کچھ ہوا جسے قرآن نے چند الفاظ میں (اور تمثیلی انداز میں) خود ہی بیان کر دیا ہے جب فرمایا کہ واتل علیہم نبأ الذی اٰتینٰہ اٰیٰتنا۔ انہیں اس شخص کی سرگذشت سناؤ جسے ہم نے اپنا ضابطۂ قوانین دیا (کہ اس کے مطابق نظام زندگی قائم کرے)۔ پھر اس نے کیا کیا؟ پہلے تو اس نظام کو قائم کیا اور اس کے بعد فانسلخ منہا۔ اسے الگ چھوڑ کر یوں نکل گیا جس طرح جانور کو ذبح کر کے اس کی کھال کھینچ لی جاتی ہے اور گوشت پر اس کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ وہ اس ضابطۂ خداوندی کو یوں چھوڑ کر الگ ہو گیا۔ فاتبعہ الشیطان: شیطان نے اس کا پیچھا کیا اور جا دبوچا۔ یہ تو نظامِ خداوندی کی محافظت تھی جس کی وجہ سے غیر خدائی قوتیں آگے نہیں بڑھتی تھیں۔ جونہی مسلمان نے اس نظام کو چھوڑا، مفاد پرستیوں کی قوتوں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔ (کیا کہہ گیا ہے اصغر مرحوم! کہ)

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اس کے بازو سمٹے اور صیاد نے آ دبوچا فکان من الغٰوین سو اس کے بعد یہ کہیں سے کہیں نکل گیا۔ ولو شئنا لرفعنٰہ بھا۔ اگر وہ ہمارے قانون مشیت سے ہم آہنگ رہتا تو اسے ہم آسمان کی بلندیوں تک لے جاتے ولٰکنہ اخلد الی الارض واتبع ھوٰہ۔ لیکن یہ کم بخت اس ضابطے کو چھوڑ کر اپنی انفرادی مفاد پرستیوں کے پیچھے ہو لیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آسمان کی بلندیوں کی طرف جانے کے بجائے زمین کی پستیوں کے ساتھ چپک کر رہ گیا فمثلہ کمثل الکلب پھر اس کی مثال کتے کی سی ہو گئی کہ اس کا پیٹ تو بھر جاتا ہے، نیت کبھی نہیں بھرتی ان تحمل علیہ یلھث اگر اسے کوئی دھتکار دے تو بھی زبان لٹکائے ہانپتا نظر آئے گا او تترکہ یلھث اور اگر نہ دھتکارے تو بھی اسکی

یہی حالت رہے گی ہر وقت کھانے کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھے گا اور منہ سے رال ٹپکے گی ذالک مثل القوم الذین کذبوا بآیتنا۔ بس یہی مثال سمجھو اس قوم کی جس نے ہمارے ضابطۂ قانون پر تجربہ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا اور اس طرح اپنے عمل سے یہ ظاہر کیا کہ گویا (معاذ اللہ) یہ ضابطہ ہی غلط ہے۔ فاقصص القصص لعلھم یتفکرون (۷/۱۷۶)، تم ان لوگوں کو، جو ابھی تک اس ضابطہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ سرگذشت سناؤ۔ شاید یہ کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا کرلیں کہ

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

میں نے سلیم! گذشتہ پندرہ برس میں یہی کوشش کی ہے کہ تمہیں اس شوریدہ بخت قوم کے اجڑے ہوئے کاشانوں کی درد بھری داستان سناتا رہوں تاکہ تم کبھی سوچو کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ جس دن تم نے سلیم اتنا سوچ لیا، ایک بہت بڑا مرحلہ طے ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ ہم پھر ویسے کس طرح بن سکتے ہیں۔ جس چیز نے ہمیں کبھی وہ کچھ بنایا تھا وہ چیز ہمارے پاس آج بھی موجود ہے۔ اس پر ایک دفعہ تجربہ ہو چکا ہے اس لئے اس کے متعلق یہ تذبذب پیدا نہیں ہو سکتا کہ پتہ نہیں پھر اس کے وہ نتائج برآمد ہوں یا نہ ہوں قرآن کے نظام نے جو نتائج ایک بار پیدا کئے تھے وہی نتائج ہر بار پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہ نظام کیا ہے؟ اس کی تفاصیل تمہیں "قرآنی نظام ربوبیت" میں ملیں گی جو عنقریب شائع ہو جائیگی۔ اس کا انتظار کرو۔

یہ خط تمہیں غالباً اس وقت ملے گا جب تم جہاز پر سوار ہو چکے ہو گے۔ اس کے بعد تمہیں اس وقت خط لکھونگا جب تم یورپ سے واپس آجاؤ گے لو۔ خدا حافظ۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد   ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

(مئی ۱۹۵۳ء)

ایک اور خط

سلیم کے نام خطوط تو آپ نے سب پڑھ لئے۔ اب یہ ایک خط ہماری طرف سے آپ کے نام ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اسے بھی غور سے پڑھیں گے۔

محترم پرویز صاحب جس قرآنی فکر کو پیش کر رہے ہیں، اس کا اندازہ آپ نے سلیم کے نام خطوط سے لگایا ہوگا۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ ہم سے متفق ہوں گے کہ یہ پہلا موقعہ ہے جس میں اسلام کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے یہ چیز ہم سب کے لئے باعث سعادت اور خوش بختی کا موجب ہے کہ ہمارے دور میں ایک ایسا مفکر پیدا ہوا ہے جس نے ان پردوں کو ایک ایک کر کے اٹھا دیا ہے جو صدیوں سے قرآن کے حسین چہرہ پر پڑے ہوئے تھے اور جن کے نیچے عروسِ حقیقت اس بُری طرح سے چھپا دی گئی تھی۔ پرویز صاحب نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس مقصد عظیم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ وہ قریب پچیس سال سے مسلسل اسی نہج پر سوچ رہے اور لکھ رہے ہیں۔ مشرق اور مغرب کے قدیم اور جدید علوم پر ان کی نگاہ ہے۔ اور زمانہ کی نبض پر انکی انگلیاں۔ وہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل کی دھڑکن سے اچھی طرح آگاہ ہیں کیونکہ وہ ان ہی کو اپنی فکر کا مخاطب اور قوم کے مستقبل کا ضامن سمجھتے ہیں وہ نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک کا غائر نگاہ سے مطالعہ کرتے ہیں اور انکی پریشانیٔ فکر و نظر کو بڑی ہمدردی سے دور کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کا ان کے گرد جمگھٹا رہتا ہے۔ اور جو خدا، رسول، مذہب کے نام پر تیوریاں چڑھائے ہوئے آتا ہے وہ قرآن کا شیدائی اور دین کا پاسبان بن کر واپس جاتا ہے۔

پرویز صاحب نے اس تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے قرآن کا انسائیکلوپیڈیا لکھنا شروع کیا۔ جس کا انداز یہ ہے کہ قرآن کی پوری کی پوری تعلیم مختلف عنوانات کے ماتحت مربوط مضامین کی شکل میں دیدی جاتی ہے جس سے اس موضوع کے

متعلق قرآن کا پورا تصور سامنے آجاتا ہے۔ اس انسائیکلو پیڈیا (**معارف القرآن**) کی چار ضخیم جلدیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے تین جلدیں اس وقت نایاب ہیں اور ان کے نئے ایڈیشن چھاپنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ چوتھی جلد **معراج انسانیت** دستیاب ہو سکتی ہے جو سیرت نبی اکرم صلعم پر اپنی قسم کی ایک ہی کتاب ہے۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے قریب ساڑھے آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور حسن معنوی کے علاوہ حسن صورت میں بھی اردو کی شاید ہی کوئی کتاب اس کا مقابلہ کر سکے۔ اس کی قیمت بیس ۲۰ روپے ہے۔

معارف القرآن کی اگلی جلد جسے محترم پرویز صاحب ترتیب دے چکے ہیں عجیب و غریب موضوع پر مشتمل ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق انسانی ذہن نے آج تک کیا سوچا اور وہ اس اڑھائی ہزار سال میں (یعنی یونان کے فلاسفرز سے لیکر اس وقت تک) کس مقام تک پہنچا ہے اور کہاں جاکر رک گیا ہے اور اس کے بعد اسے قرآن کونسی راہنمائی دیتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس انداز کی کتاب آج تک ہماری زبان میں شائع نہیں ہوئی۔

معارف القرآن کے علاوہ محترم پرویز صاحب نے چھوٹی چھوٹی کتابوں میں ہمارے دور کے اہم مسائل پر نہایت شگفتہ و شاداب انداز میں بحث کی ہے۔ ... میں سب سے اہم **اسباب زوال امت** اور **اسلامی نظام** ہیں۔ پہلی کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہم اس ذلت و پستی تک کیونکر پہنچے اور دوسری کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اب اس پستی سے نکلنے کی کیا صورت ہے۔ یہ کتابیں بھی بڑے دل کش انداز سے شائع کی گئی ہیں۔ اسباب زوال امت کی ضخامت ۵۰ ا صفحات ہے اور قیمت مجلد ڈیڑھ روپیہ ہے اور اسلامی نظام کی ضخامت ۱۰۰ ا صفحات ہے اور قیمت مجلد دو روپیہ ہے

لیکن ان سب سے اہم محترم پرویز صاحب کی وہ تصنیف ہے جسے انہوں نے **قرآنی نظام ربوبیت** کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ اس نظام کے کچھ خط و خال آپ سلیم کے نام خطوط میں دیکھ چکے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے نہایت شرح و بسط سے یہ بتایا ہے کہ اسلام سے مراد کیا ہے۔ یہ کیا پیغام لایا ہے۔ اس کی رو سے انسانی زندگی کا مقصود کیا ہے

وہ دنیا میں کس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس معاشرہ میں انسان کے ان معاشی مسائل کا حل کس طرح ہو جاتا ہے جس نے آج ساری دنیا کو جہنم زار بنا رکھا ہے؟ اس میں بتایا گیا ہے کہ نظام ربوبیت میں ذاتی ملکیت کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اور اس نظام میں اور کمیونزم میں کیا فرق ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے ارباب و فکر و نظر کے لئے ایک جہان نو کی تعمیر کا تصور پیش کر دے گی اور انسانیت کے سامنے زندگی کی نئی راہیں کھول دے گی،.... جن سے معاشرہ میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

محترم پرویز صاحب کا ارادہ ہے کہ اس کتاب کو اردو، اور انگریزی (اور غالباً عربی) زبان میں شائع کیا جائے۔ جب یہ سطور آپ کی نظر سے گزریں تو آپ ہم سے دریافت کر لیجئے کہ یہ کتاب چھپ چکی ہے یا نہیں۔

اس کے علاوہ محترم پرویز صاحب کے اُن بصیرت افروز مضامین کا مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے جس نے ہمارے نوجوانوں کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ فردوس گم گشتہ کے عنوان سے شائع ہوگا۔

لیکن جس عظیم الشان کام کو محترم پرویز صاحب نے اپنی باقی ماندہ زندگی کا مقصد قرار دے رکھا ہے اس کا ذکر ابھی تک نہیں آیا۔ وہ تمام حالات کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں (اور اُن کی یہ تحقیق بالکل صحیح ہے) کہ ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک ایسا تفہیمی ترجمہ شائع کیا جائے جو بغیر کسی خارجی مدد کے قرآن کو اردو زبان میں اسی طرح سمجھا دے جس طرح رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں قرآن کے مخاطبین نے اسے سمجھا تھا۔ اس کے لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے اور اس لُغت کی روشنی میں قرآن کا ترجمہ کیا جائے۔ یہ دونوں کام انہوں نے بیک وقت اپنے سامنے رکھ لئے ہیں اور اس منزل کا کافی حصہ وہ طے بھی کر چکے ہیں۔ یہ لغت اور ترجمہ جب شائع ہوں گے تو اُن سے صحیح قرآنی انقلاب پیدا ہو جائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ آپ ہماری اس آرزو میں ہم سے متفق ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ جناب پرویز کو۔ .. اتنی عمر اور ہمت عطا فرمائے کہ وہ ان تمام مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔

اگر آپ اکتا نہ گئے ہوں تو چند الفاظ اور بھی پڑھ لیجئے۔ ادارۂ طلوع اسلام اسی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے قائم ہے۔ اِس فکر کا نقیب مجلۂ طلوع اسلام ہے جو علامہ اقبال کی یاد میں اپریل سنہ ۱۹۳۸ء سے جاری ہے۔ یہ ماہوار مجلہ ہمیں قرآنی نظام ربوبیت کی تحریک کا پیغامبر ہے۔ اگر آپ نے اس رسالہ کو ابھی تک نہ دیکھا ہو تو اسے فوراً طلب کر لیجئے۔ ورنہ آپ ایک بڑی قیمتی چیز سے محروم رہ جائیں گے۔

ادارہ کی طرف سے اسی فکر سے متعلق متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور آیندہ بھی ہوتی رہیں گی مثلاً **قرآنی دستور پاکستان** جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی روشنی میں پاکستان کا دستور کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ (اس کی ضخامت ۲۴۸ صفحات ہے اور قیمت اڑھائی روپیہ ہے۔ ایک کتاب **قتل**، مرتد غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت کے تین اہم عنوانات کو لئے ہوئے ہے۔ اس کی ضخامت ۲۱۲ صفحات اور قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے ہے۔ اسی طرح ایک اور اہم کتاب زندگی سے متعلق مختلف مسائل اور ان کے قرآنی حل پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ہے **قرآن کی روشنی میں فیصلے** اس کی ضخامت ۴۰۰ صفحات ہے اور قیمت

خط لمبا ہو گیا اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ باقی امور کے لئے آپ ہم سے خود ہی دریافت کر لیجئے۔ اس ادارہ کو خود اپنا ہی ادارہ سمجھئے۔ کیونکہ یہ آپ ہی کے خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔

والسلام
ناظم ادارہ طلوع اسلام - کراچی

طلوع اسلام کا انقلاب آفرین لٹریچر

اسباب زوال امت (پرویز)

ہم اسقدر ذلیل کیوں ہیں؟ اس اہم سوال کا محققانہ جواب اور مفکرانہ علاج۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

اسلامی نظام (پرویز)

کیا ہے اور کسطرح قائم ہو سکتا ہے؟ اس پریشان کن سوال کا صاف اور سادہ جواب۔

قیمت دو روپے

قرانی دستور پاکستان

دستور پاکستان کے سلسلے میں ایک معیاری تنقید اور بلند پایہ پیشکش۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے

ملّا کا عجیب و غریب مذہب

قتل مرتد۔ غلام اور لونڈیاں۔ یتیم پوتے کی وراثت جیسے اہم مسائل پر ملا کا خود ساختہ مذہب کیا کہتا ہے؟

قیمت دو روپے آٹھ آنے

قرانی فیصلے

ہمارے بیشمار عقائد اور اعمال ایسے ہیں جنہیں ہم بالکل اسلامی کہتے ہیں لیکن وہ درحقیقت قرانی نہیں ہیں۔ ان عقائد و تصورات کے متعلق قران کیا کہتا ہے۔

قیمت چار روپے

جشن نامے

پاکستان کی چھ سالہ زندگی پر قرانی نقطۂ نگاہ سے بے لاگ تبصرہ۔ ہمدردانہ تشخیص اور مشفقانہ مشورے۔

قیمت دو روپے آٹھ آنے

ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی